URDU MEIN MUTASAWWIFANA SHAERI
(AHAM SHORA KE HAWALE SE)

THESIS

For

Ph.D (Urdu)

Submitted to the Central University of Hyderabad in Partial fulfillment of the Requirement for the Award of the Degree of DOCTOR OF PHILOSOPHY In URDU

Submitted By

Mohd Abdul Majeed

M.A , M.Phil

Reg. No. 10HUPH 03

Under the guidance of

DR. MOHD ANWERUDDIN

M.A , Ph.d

Rtd. Professor. Department of Urdu, School of Humanities , Central University of Hyderabad -HYDERABAD

Department of Urdu, School of Humanities

Central University of Hyderabad-HYDERABAD-500046

June-2016

اردو میں متصوفانہ شاعری

(اہم شعراء کے حوالے سے)

مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی (اردو)

مقالہ نگار

محمد عبدالمجید

ایم۔اے،ایم فل

نگران کار

پروفیسر محمد انورالدین

ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی

شعبۂ اُردو، اسکول آف ہیومینٹیز، سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد

جون 2016

Department of Urdu, School of Humanities

Central University of Hyderabad

HYDERABAD-500046

CERTIFICATE

This is to certify that the thesis entitled "**URDU MEIN MUTASAWWIFANA SHAERI: (AHAM SHORA KE HAWALE SE)** " is a bonafied record of independent research work done by **Mohd. Abdul Majeed** **bearing Reg. No. 10HUPH-03** under my guidance and submitted to the Central University, of Hyderabad for the award of the degree of Doctor of Philosophy in Urdu and that it has not previously formed the basis for the award of any other Degree/ Diploma/Associatship/Fellowship or other title.

PLACE: Hyderabad

DATE: 06/06/2016

Research Guide

(Prof.Mohd Anweruddin)

Head Dept. of Urdu

University of Hyderabad

Dean, School of Humanities

University of Hyderabad

Department of Urdu, School of Humanities
Central University of Hyderabad
HYDERABAD-500046

DECLARATION

I hereby declare that the thesis entitled "**URDU MEIN MUTASAWWIFANA SHAERI: (AHAM SHORA KE HAWALE SE) "** is the original work carried out by me under the guidance of **Dr. Mohd. Anweruddin** Rtd. Professor Dept. of Urdu Central University of Hyderabad –Hyderabad and submitted to Central University of Hyderabad. for the award of the Degree of Doctor of Philosophy in Urdu and that the thesis or part thereof has not been submitted previously else where for any other degree or Diploma to any other University or Institution.

PLACE : Hyderabad
DATE:06/06/2016

Research Scholar
(Mohd. Abdul Majeed)
Reg. No. **10HUPH-03**

فہرست

		ابتدائیہ	01-06
باب اول	:	تصوف کیا ہے ؟	07-31
باب دوم	:	اُردو شاعری میں تصوف کی روایت	32-84
باب سوم	:	دکنی کے اہم صوفی شعراء	85-151
باب چہارم	:	شمالی ہند کے اہم صوفی شعراء	152-283
باب پنجم	:	جنوبی ہند کے اہم صوفی شعراء	284-360
	:	اختتامیہ	361-363
	:	کتابیات	364-373

☆☆☆

ابتدائیہ

اردو شاعری میں صوفیانہ اور متصوفانہ خیالات و احساسات کی اپنی تاریخ ہے اگر چہ اردو شاعری میں صوفیانہ خیالات ،فارسی شاعری کی مرہون منت رہی ہیں تاہم اردو شاعری کا اپنا مزاج و منہج ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اردو شاعری میں ابتداء ہی سے صوفی اقدار نمایاں رہے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ مختلف ادوار میں صوفیہ کرام اور ان کی خانقاہوں نے عوام اور خواص کو صوفیانہ ذہن و فکر دینے کی کوشش کی۔ تصوف کی اہمیت اور افادیت کسی بھی زمانے کم میں نہیں ہوئی۔ عہدِ حاضر میں اس کی ضرورت کچھ زیادہ ہی محسوس کی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں مختلف بزرگوں کی اپنی تعلیمات اور رشد و ہدایت سے ہندوستان بھائی چارہ، اخوت اور یکجہتی کا مرکز بنا رہا۔ سرزمین ہند میں مختلف سلسلے کے بزرگوں نے صوفیانہ فکر و نظر کو اعتبار بخشا اور ہندوستان کے یہ علاقے صوفیزم کی روشنی سے منور ہو گئے۔

لہذا اس روشنی سے نہ صرف عوام بلکہ علمی طبقہ اور شعراء حضرات بھی متاثر رہے۔ حضرت امیر خسرو تا عصر حاضر بھی اردو شاعری میں تصوف کی جلوہ سامانی اور متصوفانہ خیالات کے عناصر بہر حال محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ فارسی غزل کا یہ مصرع ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است'' ضرب المثل بن گیا۔ اس میں کوئی دورائے نہیں برصغیر ہندو پاک میں سات سو برس سے

ہندوستان کی سماجی، اخلاقی اور مذہبی زندگی پر صوفیانہ افکار کے گہرے نقوش ملتے ہیں اور تصوف کے اثرات اردو شعر و ادب کے خمیر میں داخل ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر اعجاز حسین رقم طراز ہیں:

> ''اردو شاعری میں تصوف روز ازل سے دخیل ہے۔ قلی قطب شاہ سے لیکر دور جدید کے پہلے تک قریب قریب ہر شاعر کے یہاں یہ عنصر ملتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اکثر و بیشتر شعراء بالنفسہٖ صوفی ان معنوں میں تھے جس معنی میں خواجہ میر درد یا آسی غازی پوری مگر جس طرح رندی، لامذہبی، عاشقی وغیرہ سے فطری مناسبت نہ ہونے کے باوجود ان باتوں پر طبع آزمائی ہوئی ہے اس طرح تصوف پر بھی کچھ نہ کچھ کہا جاتا رہا۔ تصوف کی رنگینی و ہمہ گیری کو دیکھتے ہوئے قریباً ہر شاعر صوفیانہ عقائد کو اپنے کلام میں جگہ دیتا رہا۔''

اردو کی صوفیانہ شاعری کے آغاز کا سہرا حضرت امیر خسرو کے بعد بھی سرزمین دکن کے سر باندھا جاسکتا ہے۔ اس ابتدائی عہد میں حضرت بندہ نواز کو اولیت حاصل ہوجاتی ہے جنہوں نے دکن میں شعر و ادب کی داغ بیل ڈالی بلکہ صوفیانہ شاعری کی شمع بھی روشن کی ۔ دکنی دور کے دیگر شعراء میں، میراں جی شمش العشاق ،حضرت برہان الدین جانم ،حضرت امین الدین علی اعلیٰ، ، فیروز بیدری، اشرف بیابانی، ملاوجہی ،نصرتی ،ولی ،سراج اورنگ آبادی، قاضی محمود بحری، باقر آگاہ ویلوری ، شاہ کمال الدین وغیرہ نمایاں حیثیت کے حامل صوفی رہے ہیں۔ جنہوں نے دکنی زبان میں عرفانیات اور روحانیات کو نظماتے ہوئے قاری کو تعلیمات تصوف سے روشناس کیا۔

دکنی دور میں تصوف کے فروغ اور امکانات میں حضرت بندہ نواز اور ان کے سلسلہ کے اصحاب نے چشتیہ تعلیمات کے ذریعے دکن کے عوام و خواص کی تربیت فرمائی۔ اس کے بعد کے عہد میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا مختلف خانقاہوں سے وابستہ افراد میں سے شعراء نے بھی ان ہی تعلیمات کی روشنی میں اپنی شعری کائینات سجائے رکھی۔ ولی کے دور تک اردو شاعری تین سو سالوں کا فاصلہ طے کرچکی تھی چنانچہ اس عہد میں صوفیانہ کلام کے ذریعے کائنات کے ہر ذرہ کو ذات کا مظہر بتایا گیا اور عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ بھی قرار دیا گیا اور اس طرح ہر اس چیز سے محبت کرنے کا درس عام ہوا۔

شمالی ہند میں صوفیانہ شاعری کی ترقی و ترویج میں خواجہ میر درد کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جنہوں نے ایک صوفی اور صوفی شاعر کی حیثیت سے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ان کے دور کے دیگر شعراء میں میر، سوز، یقین اور سودا وغیرہ

نے بھی متصوفانہ خیالات کے ذریعے اپنا شعری اظہار کیا۔اس دور کے شاعروں نے بھی عشق کے مختلف تصورات اور دل کے مقام ومرتبہ کا اظہار کیا ہے۔بعد کے ادوار میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور ان ادوار میں مصحفی، انشاء، جرأت، ناسخ، آتش، غالب، ذوق، بہادر شاہ داغ، امیر وغیرہ نے بھی تصوف کے مختلف نظریات کے تحت اپنے شعری کہکشاں سجائی اور درس انسانی اور عظمت انسانی کو عیاں کیا۔بیسویں صدی میں بھی مختلف شاعروں نے ہندوستان بھر میں صوفیانہ اور متصوفانہ شاعری کو عام کیا۔چنانچہ ایک طرف شمال میں رضا بریلوی، حالی، اکبر، اقبال، فانی، حسرت، اصغر اور جگر وغیرہ نے صوفیانہ شاعری کے جلوے بکھیرے تو دوسری طرف جنوبی ہندوستان میں شاہ خاموش، مولانا انوار اللہ فاروقی، امجد حیدرآبادی، حسرت صدیقی، عطا کلیانوی، مغموم مدراسی، صفی اورنگ آبادی، توفیق حیدرآبادی، شائق حیدرآبادی، نامی کوہ سوار، مختار ہاشمی، مولوی اسماعیل شریف ازل، سیفی سجانی اور سرور مرزائی وغیرہ نے بھی عارفانہ اور متصوفانہ رنگ وآہنگ سے لبریز شاعری کی ہے۔راقم الحروف کو بھی ابتداء ہی سے تصوف سے دلچسپی رہی میرے دادا قاری شاہ محمد عبدالعزیز اور والد بزرگوار پروفیسر عبدالحمید اکبر بھی سلسلہ قادریہ میں بیعت وخلافت سے سرفراز رہے ہیں اور ابتداء ہی سے میری پرورش صوفیانہ ماحول میں ہوئی۔چنانچہ میں نے ایم۔اے کی تکمیل کے بعد اسی موضوع پر ریسرچ کرنے کے ارادہ کیا تو نہ صرف میرے والد بلکہ میرے ریسرچ رہنما پروفیسر انور الدین صاحب اور شعبۂ اردو کے ارباب حل وعقد نے میرے مزاج کے مطابق موضوع عطا کیا جس کے لئے راقم ان تمام شکرگزار ہے۔ان مذکورہ بالا حقائق کے پیش نظر میں نے اپنے تحقیقی مقالے کو درج ذیل ابواب میں تقسیم کیا ہے:

ابتدائیہ

باب اول	:	تصوف کیا ہے
باب دوم	:	اُردو شاعری میں تصوف کی روایت
باب تی سوم	:	دکنی کے اہم صوفی شعراء
باب چہارم	:	شمالی ہند کے اہم صوفی شعراء
باب پنجم	:	جنوبی ہند کے اہم صوفی شعراء
	:	اختتامیہ

کتابیات

باب اول: تصوف کیا ہے: اس باب کے تحت تصوف کا تعارف مختلف حوالوں کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔اس کے

علاوہ اس کے اہم اور افادی پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے مختصراً ارتقائی صورت حال بھی بیان کی گئی ہے۔

باب دوم: اُردو شاعری میں تصوف کی روایت: روایت ایک ورثہ ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے اُردو شاعری میں تصوف کی روایت سے قبل عربی اور فارسی روایت کا مختصراً جائزہ لیتے ہوئے اردو کی شعری روایت کو بیان کیا گیا ہے۔ اردو کی صوفیانہ روایت امیر خسروؒ سے ہوتی ہوئی بہمنی، عادل شاہی، قطب شاہی مغل شاہی اور آصف جاہی دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ صوفیانہ شاعری کی روایت کو مختلف ادوار کے حوالے سے تا حال تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب سوم: دکنی کے اہم صوفی شعراء: دکنی دور ایک اہم دور کہلاتا ہے جہاں شعری روایت سے استفادہ کرتے ہوئی اردو شعر و ادب کی تعمیر و تشکیل ہوئی۔ اردو میں صوفیانہ شاعری کے نمونے بہمنی دور سے ہی دستیاب ہونے لگتے ہیں۔ دکنی دور چار سو سالوں کو محیط ہے جس میں عہدِ بہمنی سے لے کر عہد سلطان ٹیپو تک بے شمار شعراء نے معاشرہ کی تعلیم و تربیت کے لیے صوفیانہ اور حکیمانہ فکر و نظر کو اجاگر کیا ہے۔ اس باب میں ان ادوار کا مختصراً جائزہ لیتے ہوئے چند منتخب دکنی شعراء (حضرت بندہ نواز، فیروز بیدری، میراں جی، برہان الدین جانم، امین الدین علی اعلی، ولی، سراج، بحری اور رداو داورنگ آبادی اور شاہ کمال) کی صوفیانہ شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب چہارم: شمالی ہند کے اہم صوفی شعراء: مابعد ولیؔ صوفیانہ شاعری کے جلوے شمالی ہند میں بھی محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ شمالی ہند میں حاتم آبرو وغیرہ کے دور سے صوفیانہ شاعری جدید دور میں جگر مرادآبادی تک پہنچتی ہے۔ ان تین صدیوں میں بے شمار صوفی اور متصوف شاعر گزرے ہیں جنہوں نے صوفیانہ تصورات کی تبلیغ و اشاعت میں اہم رول ادا کیا ہے۔ چنانچہ اس باب میں درد، میر، غالب، اقبال، رضا بریلوی، اصغر، جگر، حسرت وغیرہ کی صوفیانہ شاعری کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

باب: پنجم: جنوبی ہند کے اہم صوفی شعراء: جنوبی ہند میں دکنی دور کے بعد بھی شاعری کا کارواں آگے بڑھتا رہا۔ جنوب میں صوفیانہ شاعری اردو شعر و ادب کا حصہ رہی۔ چنانچہ آصفیہ حکومت میں کئی شعراء شمالی ہند سے اس جانب آئے اور اردو شعر و ادب کے قافلے کو آگے بڑھایا۔ جنوبی ہند کی شاعری میں مختلف صوفیانہ تصورات ملتے ہیں۔ جنوبی ہند میں بھی کئی شعراء ملتے ہیں اور ان تمام کا احاطہ کرنا ممکن نہیں چنانچہ اس علاقے کے چند صوفی شعراء مثلاً انور حیدرآبادی، شائق حیدرآبادی، توفیق حیدرآبادی امجد حیدرآباد، مغموم مدراسی، صفی اورنگ آبادی،، عطا کلیانوی مختار ہاشمی اور سرور مرزائی وغیرہ کی عارفانہ اور متصوفانہ شاعری کا تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔

اختتامیہ: کے تحت تمام ابواب کا حاصلِ مطالعہ پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

کتابیات: اس مقالے کی تیاری میں جن کتابوں، رسائل و جرائد اور دیگر تحریروں سے استفادہ کیا گیا ہے، حروفِ تہجی کے لحاظ سے ان کی فہرست ترتیب دی گئی ہے۔

راقم الحروف یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے حرف آخر نہیں ہے۔ اس پر نہ صرف حذف و اضافہ کیا جا سکتا ہے بلکہ مختلف انداز سے تنقید کی گنجائش اپنی جگہ برقرار ہے۔ راقم نے جو کچھ بھی قلم بند کیا ہے وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی اور حضورِ اکرم ﷺ کا صدقہ ہی ہے کہ یہ مقالہ تکمیل کے مرحلے تک پہنچ سکا ہے۔ احقر بارگاہِ الٰہی میں سجدۂ شکر ادا کرتا ہے۔

اُستادِ محترم پروفیسر محمد انورالدین، سابق صدر شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد کے لئے میرے پاس شکریے کے الفاظ نہیں ہیں۔ میں ان کی مشفقانہ سرپرستی، رہنمائی اور تعاون کے لیے اللہ تبارک تعالیٰ سے دعائے خیر کرتے ہوئے ہدیہ تشکر پیش کرتا ہوں۔ شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد کے اساتذہ کرام پروفیسر مظفر شہ میری (صدر شعبۂ اردو)، پروفیسر بیگ احساس (سابق صدر شعبۂ اردو)، پروفیسر حبیب نثار، پروفیسر رضوانہ معین اور دیگر اساتذہ کرام کا بھی سپاس گزار ہوں۔ اس کے علاوہ شعبۂ کے ریسرچ اسکالرس اور غیر تدریسی عملے کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں

ڈاکٹر منظور احمد دکنی (شعبۂ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی)، ڈاکٹر افضل الدین جنیدی (خلف اکبر، خانوادۂ جنیدیہ ،گلبرگہ)، مولانا فصیح الدین نظامی (حیدرآباد) وغیرہ کا بھی شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنھوں نے مواد کی فراہمی اور تدوین کے دوران تعاون کیا۔ ان تمام کتب خانوں کے ارباب مجاز کا ممنون ہوں جن سے میں نے استفادہ کیا ہے۔ میں سپاس گزار ہوں دوست، احباب، رشتے داروں، اور ان لوگوں کا جنھوں نے کسی نہ کسی طرح میرا تعاون کیا۔ آخر میں، میں اپنے والد گرامی پروفیسر عبدالحمید اکبر کے علاوہ والدہ، اہلیہ، بھائی، بہنوں اور دیگر عزیز و اقارب کا بھی شکریہ ادا کرنا اپنا فرض عین سمجھتا ہوں۔ جنھوں نے اس کام کی تکمیل میں میری مدد فرمائی۔

بتاریخ: 6/مئی، 2016

محمد عبدالمجید

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد

باب اول

تصوف کیا ہے؟

حضرت آدم اور ماں حوا علیہا السلام کو اللہ تعالیٰ نے ممنوع دانۂ گندم نوش فرمانے کے سبب جنت سے اس کائنات میں بھیجا تو خالق حقیقی سے اپنی غلطی کی معافی اور حق کی تلاش میں روئے زمین پر برسہا برس سرگرداں رہے۔ یہی حق وصداقت کی تلاش پوری بنی آدم کا مقدر بنی۔ چنانچہ مابعد آدم علیہ السلام انسان مختلف طریقوں سے حق کا متلاشی رہا۔ یہی تلاشِ حق کی جستجو و آرزو مختلف عہد میں مختلف مراحل ومنزال طے کرتے ہوئے انسانی ذہن وقلوب کی بے قراری و اضطراری کیفیات کو سکوں و راحت کا ساماں پہنچاتی رہی۔ چنانچہ اسی عمل کو مابعد زمانہ ''تصوف'' کے نام سے جانا گیا۔تصوف کے چند عناصر تمام مذاہب عالم میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں مگر اس کے مزاج ومنہج میں زماں ومکاں کے اعتبار سے فرق و امتیازات پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے راستے مختلف ہو سکتے ہیں مگر ہر ملک کے صوفی مشرب انسان کے یہاں کچھ اقدار ایسے ملتے ہیں جو صوفی اقدار معاشرہ میں مشترکہ دیکھے جا سکتے ہیں اور صوفیہ کسی نہ کسی طرح تصوف کے حامی نظر آتے ہیں۔ اس پورے منظر نامے کو محمود ذکی نے سید اسد علی کی تصنیف ''ہندی ادب کے بھکتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات'' کے حوالے سے پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ....ہر عہد میں انسان نت نئے طریقوں سے حق کی تلاش میں
> منہمک رہا ہے۔یہی تلاش حق کی سرگزشت عہد بہ عہد مختلف مراحل سے گزرتی

رہی اور اسی کے ذریعے انسان کے دل کی بے قراری کو قرار اور دکھی آتماؤں کو سکوں کی راہیں ملتی رہی ہیں۔ اس عمل کو مابعد زمانہ تصوف کے کے نام سے بھی جانا گیا ہے۔سید اسد علی نے اپنی کتاب ''ہندی ادب کے بھکتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات'' میں لکھا ہے کہ ''تمام مذاہب عالم میں تصوف کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا نام زمان و مکان کے فرق کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔مغرب ہو یا مشرق ایسا ہر جگہ نظر آتا ہے۔اس کے راستے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن بنیادی عقائد ہر ملک کے صوفیہ میں ایک جیسے ہیں۔۔۔آغاز آفرینش سے اب تک کی اگر مشرق سے مغرب کی عظیم شخصیتوں کی فہرست پر غور کیا جائے تو ان میں ایسے قابلِ لحاظ افراد ملیں گے جو کسی نہ کسی شکل میں تصوف کے قائل تھے۔''(1)

اس اقتباس سے یہ بات مترشح ہو رہی ہے کہ تصوف کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوتی ہے اور یہ سلسلہ مختلف انبیاء سے ہوتا ہوا نبی آخر الزماں ﷺ تک پہنچا۔تصوف کی ابتداء ابتدائے آفرینش سے ہی رہی ہے۔اس سے قبل کہ تصوف سے متعلق کچھ عرض کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں قرآن و سنت، صوفیہ و اولیا اور کتب تصوف کے حوالے سے ان حقائق کے پس منظر میں تصوف کا مطالعہ یقیناً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

تصوف کے لیے قرآن و حدیث کے لحاظ سے تزکیہ نفس اور احسان کی اصطلاح مروج ہیں۔قرآن کریم میں سورہ کہف میں تصوف کو ''علمِ لدنی'' کہا گیا ہے۔''وَعَلَّمۡنٰهُ مِنۡ لَّدُنَّا عِلۡمًا ۝ یعنی اور اسے ہم نے علم لدنی عطا فرمایا۔اس علم کی تفسیر فرماتے ہوئے حضرت اسماعیل حقی لکھتے ہیں:

''یہ وہ علم ہے جو اس بندے کو نصیب ہوتا ہے جو اپنے تمام اعضاء کو مخلوق کے تعلقات سے فارغ کر دے اپنے جمیع ارادات اور حرکات و سکنات کو فنا کر دے اور اپنے آپ کو ہر تمنا اور آرزو سے فارغ کر کے بارگاہِ حق کے سپرد کر دے۔''(2)

نبی آخر زماں ﷺ ان الفاظ میں ''احسان'' کی تعریف فرمائی ہے:

''ان تعبد اللہ کا نک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک''۔ترجمہ: تم اللہ کی عبادت (اس حضورِ قلب سے) کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اگر ایسا نہیں تو (یقین رکھو) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔(3)

حدیث پاک سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ آپ ﷺ نے عبادت کے تصور کو دو حصوں میں منقسم فرمایا ہے۔ ایک کا تعلق مشاہدہ سے ہے جبکہ دوسرا مراقبہ کی غمازی کرتا ہے اور ان دونوں کیفیات کے رموز تصوف میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

تصوف نہ صرف روحانی و باطنی کیفیات کا نام ہے بلکہ علمی و ادبی، فکری و عملی اور تہذیبی و معاشرتی وغیرہ جہات میں خلوص و حسن کا نام بھی ہے۔ائمہ مجتہدین نے اپنے تمام معاملات کی بنیاد کو کتاب اللہ اور قول نبی ﷺ کو ٹھہرایا ہے۔لہذا امام تصوف وطریقت، حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ پیران پیر غوثِ آعظم دستگیرؒ نے لفظ تصوف کے حقائق و معارف کو کچھ اس طرح بیان فرمایا ہے۔:

> ''تصوف کے معنی ہیں تہذیب ،اخلاق،تزکیۂ نفس اور ماسوی اللہ کی طرف التفات ترک کرتے ہوئے مولا کریم کی بارگاہ کا قرب و وصول حاصل کرنا''
>
> (4)

غوثِ اعظم امام الاولیاء نے بہ اعتبار حروف تہجی تصوف کی تعریف و توصیف بھی بیان فرمائی ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ،لفظ (ت) سے مراد ''توبہ''،لفظ (ص) سے مقصود''صفائی''،لفظ (و) بمعنی''ولایت ''اور لفظ (ف) سے ''فنافی اللہ'' مراد لئے ہیں۔ان تشریحات کی روشنی میں صاحبِ کائیناتِ تصوف لکھتے ہیں:

> ''بہ اعتبار حروف تہجی لفظ تصوف میں مستعمل شدہ حروف کے تحت حضور سیدنا غوث اعظم نے جو کچھ بیان فرمایا وہ ''کوزہ میں سمندر'' اتارنے کے مصداق ہے۔شریعت،طریقت،معرفت،حقیقت یہ چار مشہور طریق اور محفوظ راستے اپنے تمام آداب و شرائط کے ساتھ انہی چار حرفوں میں پوشیدہ ہیں جن کے مجموعے کا نام ''تصوف'' ہے۔(5)

فیروز اللغات میں تصوف سے مراد ''دل سے خواہشوں کو دور کر کے خدا کی طرف دھیان لگانا'' لئے گئے ہیں یہ تزکیہ نفس کا طریقہ بھی کہلاتا ہے اور اسے معرفت کا علم بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔اور تصوف وہ علم ہے جس سے ''باطن کا تزکیہ کیا جاتا ہے۔تصوف کی مزید توضیح و تشریح کے سلسلہ میں کچھ بزرگان دین کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جن کے مطالعہ سے

تصوف کی ایک واضح تصویر ابھر کر آتی ہے:

سرخیلِ اولیاء حضرت جنید بغدادی کہتے ہیں:

''تصوف سر (روحانی راز) کو خدا تک پہنچانا ہے اور یہ مقام حق کے ساتھ قیام کی روحانی قوت کی خاطر اسباب سے فنائے نفس کے سوا حاصل نہیں ہوتا۔''(6)

حضرت رویمؒ کا فرمان ہے کہ:

''تصوف نفس کو اللہ کے ساتھ چھوڑ دینا کہ وہ (اللہ تعالیٰ) جیسا چاہے کرے۔'' (7)

حضرت داتا گنج بخش بھی فرماتے ہیں:

''صفا ولایت کی منزل ہے اور اس کی نشانیاں ہیں اور تصوف صفا کی ایسی حکایت وتعبیر ہے جس میں شکویٰ وشکایت نہ ہو۔''(8)

امام شعرانی کا کہنا ہے کہ:

''تصوف تو صرف احکام شریعت پر کسی بندۂ خدا کے عمل کا اصل ہے۔ جب کے اس کا عمل کوتاہیوں اور نفسانی خواہشات سے پاک ہو۔''(9)

حضرت بایزید بسطامیؒ رقم طراز ہیں:

''راحتوں کو چھوڑ کر مشقتیں برداشت کرنے کا نام تصوف ہے۔''(10)

حضرت معروف کرخیؒ کہتے ہیں:

''تصوف نام ہے حقائق کے حصول اور خلائق کے مال ومتاع سے ناامیدی کا (مال و متاع سے کچھ امید نہ رکھنا) اور جو شخص صاحب فقر نہیں، صاحب تصوف نہیں ہے۔''(11)

شیخ ابو محمد جریری تصوف کی تعریف بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''تصوف کی تعریف اعلیٰ اخلاق (اخلاق حمیدہ) کا حصول اور ادنیٰ اخلاق

(اخلاقِ رزیلہ) کا رد ہے۔"(12)

امام ابو حامد غزالیؒ کا بھی خیال ہے کہ:

دل کو اللہ تعالیٰ کے لئے خالی کرنا اور اللہ کے سوا ہر چیز کو حقیر سمجھنا۔"(13)

تصوف سے متعلق صوفیہ کرام کے خیالات کے جائزے سے اس امر کی تشریح ہوتی ہے کہ تصوف دراصل حال و کیفیت کا نام ہے جو تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب، تجلیہ روح اور معرفت ربانی کا ذریعہ ہے۔ اب ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی ہے کہ تابعین کے عہد سے ہی تصوف کی اصطلاح مروج رہی ہے۔ اور مختلف ادوار میں تصوف کا عمل ارتقاء پذیر رہا۔ صالح معاشرہ کی تشکیل و تعمیر میں ان صوفی حضرات کی جو تعلیمات، ملفوظات، ارشادات اور فرمودات کے جامع مجموعوں کو بھی تصوف کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ تصوف سے متعلق پروفیسر عبدالمجید صدیقی مالیگاؤں نے کتاب "مرام الخواص" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

تصوف کی کچھ باتیں خاص ہیں مثلاً (۱) توحیدِ خالص کا حاصل کرنا۔ (۲) ایثار، (۳) ایثار کو قربان کرنا (۴) حسنِ معاشرت (۵) سماع یعنی اس سے اللہ کی محبت کو ترقی دینا اور اس (محبت) کی روح کو حاصل کرنا (۶) فنائے اختیارِ ذاتی (۷) وجد کا جلد طاری ہونا (۸) دل کی باتوں پر مطلع ہونا (۹) زیادہ تر خاموش رہنا (۱۰) اپنے عمل پر نظر نہ کرنا (کہ مغرور نا ہوجائے) (۱۱) اپنی کمائی کو ذخیرہ بنا کر رکھنے کو حرام سمجھنا۔(14)

تصوف کو اسلام کی روح کہا گیا ہے اور اس کا تعلق علمِ الٰہی قرار دیا گیا ہے۔ علم تصوف دراصل علم اللہ ہے دیگر علوم و فنون کو علم الانسان کہا جا سکتا ہے۔ صوفیہ کرام اس سلسلہ میں کہتے ہیں کہ تصوف کا علم بندے کے قلب پر منکشف ہوتا ہے جب کہ بندہ ظاہر و باطن کی خوبیوں سے مالا مال ہوتا ہے اور اللہ تبارک تعالیٰ کی رضا اور کلام اللہ اور اقوال رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کا عملی نمونہ پیش کرتا ہے تو ایسے صفات کے حامل بندے کو صوفی، ولی وغیرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جن کا ہر فعل و عمل اللہ کی رضا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کی آئینہ داری کرتا ہے۔ بقول محمد عیسیٰ رضوی قادری:

"تصوف کا ضابطہ اور قانون دیرینہ ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں اس پر پیغمبر اور صدیقوں کا عمل رہا ہے۔ تصوف دین و ایمان کی جان ہے۔ اہلِ طریقت

کے یہاں تصوف کی تین قسمیں ہیں

ا۔ صوفی ۲۔ متصوف ۳۔ اور مشتبہ

صوفی وہ ہے جو اپنی ہستی فنا کرچکا اور اللہ کے ساتھ باقی ہے، خواہشات نفسانی کے قبضے سے باہر اور حقائق موجودات کا ماہر ہے۔

متصوف کی یہ شان ہے کہ ریاضت و مجاہدہ میں اس لئے سرگرم رہتا ہے کہ صوفیوں کے مراتب حاصل کرسکے اور قدم بقدم ان کی راہ چل کر اپنے معاملات ان کے ساتھ درست کرنا چاہتا ہے۔

اور مشتبہ کی یہ حالت ہے کہ اس میں صورۃ صوفیوں کے تو اکثر عادات ہوں مگر معناً نہیں، روزہ، نماز، درود و وظائف، ذکر و اشغال یا کوئی عمل وہ اس غرض سے نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ سے ملے بلکہ ان تمام آرائشوں کا مقصد جاہ طلبی اور حظوظ نفسانی ہے۔'' (15)

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری اور تقویٰ و پرہیز گاری سے بندہ جب متصف ہوجاتا ہے تو وہ بندہ اللہ کا قرب حاصل کرتا ہے اور خدا تعالی اس کے قلب و ذہن پر حقائق کے انکشافات اور کائینات کے سربستہ راز کے خزائن نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ بندہ جو بھی کہنا چاہتا ہے گو یا وہ اللہ کی بات اس سے صدور ہونے لگتی ہے، اور وہ عارفِ اور کامل کہلایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں، شیخ ابوسعید الخزاز فرماتے ہیں:

''عارفین کے پاس ایسے خزانے موجود ہیں جن میں انہوں نے علوم وفنون عجیبہ وغریبہ کو محفوظ کررکھا ہے، ان خزانوں کا اظہار وہ ابدیت کی زبان سے کرتے ہیں''۔ (16)

کیف و سرور کی نغمگی بنی آدم کی سرشت میں خالقِ حقیقی نے داخل کررکھی ہے۔ وہی قولِ الست کی پرآفرین صوتِ سرمدی سے وجد میں گم روح کو اپنے اندر سمایا ہوا ہے۔ اُس میں اپنے مالکِ حقیقی کے لئے اُسی کی عطا کردہ اُنس و محبت سے آگے عشق و جنوں کی کیفیت بھی طاری ہوتی ہے۔ ان کیفیات میں محو انسان پر مجازی دنیا کے مخفی اسرار و رموز آشکار ہوجاتے ہیں جو دراصل حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان ہی حقیقی جذب و کیف کے علم کو تصوف کہتے ہیں۔ علم تصوف کا حامل و عامل صوفی کہلاتا

ہے۔صوفی کا جذبۂ عشق اکتسابی نہیں بلکہ عطائی ہوتا ہے۔صوفی کی ذات وصفات میں صوفیانہ ذوق وعمل کی کارفرمائی پوشیدہ ہوتی ہے۔تصوف جس کو ادبِ اخلاق سے بھی موسوم کیا گیا ہے جو نظامِ باطنی کا ایک مستحکم آرگن بھی ہے۔بقول حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی:

> ''مشائخ وصوفیہ محض اللہ کیلئے علم حاصل کرتے ہیں اور اپنی پرہیزگاری اور تقویٰ کی بناء پر جو کچھ علم انہوں نے حاصل کیا ہے اس پر عمل بھی کرتے ہیں پس اللہ تعالیٰ نے ان کو اس عمل میں خیر کی بدولت باطنی علوم کے ان عجائب دقیق نکات واشارات سے مطلع کرتا ہے جن سے وہ آگاہ نہ تھے، ان دقیق نکات واشارات کی بدولت وہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے غرائب علوم اور عجیب و غریب رازوں کو اخذ کر لیتے ہیں''۔(17)

تصوف کی حقیقت اور ماہیت کے ضمن میں مختلف امہات الکتب میں بزرگوں کے ارشادات اور اقوال ملتے ہیں جن کے مطالعہ سے تصوف کی حقیقت پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی ہے۔صاحب عوارف المعارف نے لکھا ہے کہ مختلف بزرگوں نے تصوف کے ضمن میں جو تعارفی جملے لکھے ہیں ان میں کوئی بھی تعریف جامعیت نہیں رکھتی بلکہ ان بزرگان دین وملت نے اپنے اپنے ذوق اور مذاق علم کے لحاظ سے تصوف پر روشنی ڈالی ہے ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ ابتدائی دور میں ان بزرگان دین نے زہد،فقر اور تصوف کو غلط ملط کر دیا ہے چونکہ یہ تینوں مختلف حیثیات کے حامل اصلاحات ہیں۔تصوف اصل میں زہد وفقر اور دیگر اوصاف حمیدہ کا نام ہے۔اس سلسلہ میں صاحب عوارف المعارف کے حوالے سے امام احمد رضا اور معارف تصوف کے مقدمہ میں محمد عیسیٰ رضوی قادری لکھتے ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ تصوف کی ابتداء میں صرف زہد کا نام تھا، زہد جس قدر بڑھتا گیا روحانی اوصاف یعنی صبر وشکر، توکل ورضا، انس ومحبت وغیرہ خود بخود پیدا ہوتے گئے۔عبادات میں توجہ الی اللہ کا زور بڑھتا گیا تو مجاہدہ اور مجاہدہ سے کشف و الہام اور بعض قسم کے خرق عادات کا ظہور ہوا، غرض رفتہ رفتہ تصوف بہت سی چیزوں کا مجموعہ بن گیا۔لیکن یہ امر صاف طور سے طے ہوا کہ ان میں سے تصوف کا اصلی حصہ کس قدر ہے۔اسی بنا پر متقدمین سے ہر

شخص نے تصوف کی نئی تعریف بیان کی یعنی مجموعہ میں سے صرف ایک حصہ کو لیا۔ حجتہ الاسلام امام غزالی سے پہلے تصوف میں سب سے زیادہ جامع اور علمی پیرائے میں جو کتاب لکھی گئی تھی وہ امام ابولقاسم قشیری کا رسالہ تھا تاہم اس رسالہ میں صرف ورع، تقوی، صبر وشکر وغیرہ کے عنوان قائم کئے گئے ہیں اور ہر ایک عنوان کے نیچے قرآن مجید کی آیتیں اور بزرگوں کی حکایتیں لکھ دی گئی ہیں کسی چیز کی حد اور حقیقت نہیں بیان کی ہیں، مکاشفات اور روحانی ادراکات کا تو سرے سے ذکر ہی نہیں۔ امام غزالی پہلے شخص ہیں جنہوں نے علمی طور پر اس فن کو مدون ومرتب کیا۔'' (18)

تصوف کی تاریخ کا مطالعہ ہمیں اس بات کی نشاندہی کرواتا ہے کہ یہ علم، باطن کی کیفیت وحال کا نام ہے۔ تصوف کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا ضابطہ اور قانون ابتدائے آفرینش سے ہے۔ یہ علم اول البشر حضرت آدم علیہ السلام سے ہوتا ہوا افضل البشر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچا۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس پاکیزہ علم کو اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تک پہنچایا اور اس طرح اس علم کی رسائی، تابعین، تبع تابعین، اولیاء، اصفیاء اور صالحین تک ہوتی رہی۔ چنانچہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہوئے حضرت شرف الدین یحیٰ منیریؒ اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ:

''اس عالم میں پہلے صوفی حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ ان کو حق تعالیٰ نے خاک سے پیدا کیا۔ پھر اجتباء اور اصطفاء کے مقام پر پہنچایا۔ خلافت عطا فرمائی۔ پھر صوفی بنایا.......... اور تصوف کی دولت ایک نبی سے دوسرے نبی کو یکے بعد دیگر منتقل ہوتی رہی صوفیوں کا یہ معمول ہے کہ کسی خاص جگہ پر بیٹھ کر آپس میں مل جل کر راز ونیاز کی باتیں کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ صوفی صافی اول حضرتِ آدم علیہ السلام کی اس خلوت دَرْ انجمن کے لئے خانہ کعبہ کی بنیاد پڑی۔ یعنی دنیا میں پہلی خانقاہ کعبہ مکرم ہے .... پھر جب دور مبارک حضرت سیدنا محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا آ پہنچا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس طرح کعبہ کا قصد کیا۔ علاوہ اس کے خود مسجد نبوی میں ایک گوشہ

معین کر دیا۔ اصحاب میں وہ گروہ جو سالکانِ راہِ طریقت بعنوانِ خاص (اصحابِ صفّہ) تھے۔ اُن سے وہیں راز کی باتیں ہوا کرتی تھیں ان میں بعض پیر تھے۔ بعض جوان جیسے ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت سلمانؓ، حضرت معاذؓ و بلال و ابوذ وعمار رضی اللہ تعالیٰ عنہم ان حضرات کو خاص خاص اوقات میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وہاں بٹھائے ....اس جماعت صوفیہ کے لوگ قریب قریب ستر اشخاص تھے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ بھی معمول تھا کہ جب کسی صحابی کی عزت وتکریم فرماتے تو ان کو ردائے مبارک یا اپنا پیراہن شریف عنایت فرماتے تو صحابہ میں وہ شخص صوفی سمجھا جاتا تھا۔ اب تم جان سکتے ہو کہ تصوف اور طریقت کی اول اول ابتداء، حضرت آدم علیہ والسلام سے ہوئی اور اس کا تتمہ رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ (19)

مذکورہ اقتباس کے مطالعہ سے اس امر کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ تصوف اور صوفی کے نقطہء آغاز کو حضرت آدم اور خانہ کعبہ کو اولین خانقاہ قرار دیا گیا ہے۔ تصوف کا سلسلہ کس طرح نبی کریم ﷺ کے بعد ارتقائی مدارج طے کیا ہے ان تمام نقوش کی جلوہ نمائی ہوجاتی ہے۔ لیکن ان تمام مقامات پر لفظ صوفی کا ذکر بطورِ کیفیت ہوا ہے نہ کہ اصل، کیونکہ اوائل دور میں یہ لفظ چند خاص مواقع پر استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ صوفی کی وجہ تسمیہ میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لفظ صوف (پشیمنی لباس) سے بھی مشتق ہے۔

لسانیات کے علماء کا خیال ہے کہ تصوف کا لفظ ''صوف'' سے اخذ کیا گیا ہے جس کے معنیٰ 'اونی لباس' لیے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس لباس کے بارے میں عام خیال یہ بھی ہے کہ یہ دبیز اور ہلکا ضرور ہوتا ہے مگر خوبصورت نہیں لہذا کسی بھی دور میں اس لباس کو قبولیت حاصل نہیں رہی۔ تاہم راویان بیان کرتے ہیں کہ انبیا اور رسل علیہم السلاۃ والسلام نے اس لباس کو استعمال کیا ہے۔ بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ امام الانبیاء ﷺ نے اس لباس کو زیب تن فرمایا تھا۔ ایسی روائتیں ملتی ہیں کہ اصحابِ صفہ اور بدری صحابہ نے بھی اس لباس کو زیب تن فرمایا ہے، چنانچہ اس لباس کے پہننے والوں کو بعد از اں صوفی کے لقب سے بھی جانا پہچانا گیا۔

اگر چہ سرورِ کونین ﷺ سے متعلق بھی بعض کتب تصوف میں یہ لکھا گیا ہے کہ آپ ﷺ بھی لباس صوف پہنا کرتے تھے۔ تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عہد رسالت مآب ﷺ اور عہد صحابہ کرام کے دور تک بھی تصوف اور صوفی کی اصطلاحیں رائج نہیں تھیں۔ چونکہ روئے زمین پر انبیاء علیھم السلام کے بعد ''صحابیؓ'' کے لقب سے بڑا کوئی لقب نہیں تھا۔ چونکہ حضور اکرم ﷺ کی صحبت بابرکات کی وجہ سے مختلف امورِ باطنی جیسے تطہیر، تزکیہ، تصفیہ اور تجلیہ کا ظہور ہوجاتا تھا اور سرکارِ دو جہاں ﷺ کو حالت ایمان میں جو کوئی دیکھ لیتا اس کو باطنی مدارج حاصل جاہوتے اور وہ صحابی جیسے جلیل القدر لقب سے سرفراز ہوجاتا۔ مگر مابعد زمانہ رسالت ﷺ، مردان خدا کو باطنی مدارج، جہد مسلسل اور مشاہدات و مجاہدات کے بعد حاصل ہوتے۔ رحمت للعالمین ﷺ کی صحبت فیض کے سلسلہ میں مولانا صدرالدین فرماتے ہیں:

> ''صوفی کا اصطلاحی لقب جب کبھی وضع ہوا ہو مگر طریق حقیقت کی ابتداء قرونِ اول ہی سے ثابت ہے چنانچہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ایک نظارۂ جمال سے صحابہ کرام کو وہ کشف و انشراح حاصل ہوتا تھا جو بعد کے مشائخ کو مدتوں کی ریاضتوں میں بھی نصیب نہیں ہوتا اس واسطے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اصحابی کالنجوم فبایھم اقتدیتم اھتدیتم (میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں تم جس کی بھی پیروی کرو ہدایت پاؤ گے) اس سے ثابت ہے کہ ذاتِ رسالت پناہ کی ضیاء پاشی ہی نے صحابہ کرام پر رموزِ حقیقت کا انکشاف فرمادیا تھا۔''(20)

ولی کامل حضرت ابونصر سراج نے صحابہ رضوان اللہ تعالی کے مقام و مرتبہ کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ:

> ''رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحبت پاک سے مشرف ہونے کی اپنی حرمت اور خصوصیت ہے اور جن نفوس قدسیہ کو یہ سعادت حاصل رہی انہیں '' صحابیؓ'' کے نام سے ہٹ کر کسی اور نام سے موسوم کرنا تو کسی طرح بھی مناسب نہیں کہ صحابہ، زاہدوں، عابدوں اللہ پر توکل کرنے والوں، فقراء، مجاہدۂ نفس کرنے والوں اور صابروں کے امام تھے۔ اور انہوں نے جو مقام بلند (مقامِ صحابیت) حاصل کیا وہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

کی صحبت ہی کا اثر تھا۔'' (21)

مذکور ہے کہ لفظ 'صوفی' حضور مکرم ﷺ کے حینِ حیات میں مستعمل نہیں رہا۔ چنانچہ حضرتِ حسن بصری جنہوں نے پہلی مرتبہ اپنی تحریر میں لفظ صوفی کو استعمال کیا ہے۔ جن کا شمار تابعین میں ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں:

''میں نے طوافِ کعبہ کے دوران ایک صوفی دیکھا اور کچھ دینا چاہا مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ میرے پاس چار درہم موجود ہیں جو میرے لئے کافی ہیں۔'' (22)

مذکورہ اقتباس اس بات کی آئینہ داری کر رہا ہے کہ حضرت حسن بصریؒ کے زمانے میں لفظ صوفی رواج پا چکا تھا اور عوامی طبقہ اس اصطلاح سے آشنا ہو چکا تھا۔ لہذا خیال اغلب ہے کہ اسی دور سے تصوف کے مختلف اصطلاحات مروج ہوگئیں۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اشتقاق صوفی و تصوف کے سلسلہ میں مختلف کتب تصوف سے اخذ و استفادہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

1۔ صفا (بمعنی پاکیزگی و صفائی)

2۔ اہل صُفّہ (رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانے میں کچھ بزرگ صحابہ تھے جو ہر وقت عبادت، ریاضت میں رہتے اُنہیں اہل صُفّہ کہا جاتا ہے جو صُفہ یعنی چبوترے پر بیٹھتے)

3۔ صَف (وہ لوگ جو ہمیشہ صف اول میں نماز ادا کرنے کی کوشش کرتے)

4۔ صوفہ (ایک قدیم قبیلہ کا نام)

5۔ صفوت القضا (گدی پر جو بال ہوتے ہیں اُن کو کہتے ہیں)

6۔ صوفیا (یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں حکمتِ الٰہی)

7۔ صوفانہ (ایک قسم کا پودا ہوتا ہے)

8۔ صُوف (پشمینی یا اون کا لباس)

(23)

قرآنِ حکیم والفرقان المجید میں صوفیۂ کرام کو اُن کے احوال کے مطابق مخاطب کیا گیا ہے۔ کتاب اللُّمع میں صوفیہ کے

چند اسماء قرآن شریف کے حوالے سے کچھ اس طرح اخذ کئے گئے ہیں:

''الصادقین (سچے) القانتین (ادب والے فرماں بردار) الخاشعین (عاجزی کرنے والے) الاولیاء (اللہ کے ولی یا دوست) وغیرہ وغیرہ'' (24)

حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی صوفیہ کرام کے حلیہ اور مقام و مرتبہ کا ذکر یوں فرمایا ہے:

''میری امت میں کئی ایسے بکھرے غبار آلود بالوں والے اشخاص موجود ہیں۔ کہ اگر وہ کسی معاملہ میں اللہ پر قسم کھا جائیں تو وہ ان کو ان کی قسم میں سچا فرمادے۔'' (25)

احادیث مبارکہ میں صوفیہ کرام کے احوال و آثار کا ذکر کثرت سے ملتا ہے جن سے صوفیانہ احوال کے حامل صحابہ کی موجودگی سے اس امر کی نشاندہی ہوجاتی ہے اس کے علاوہ حضور معظم ﷺ نے امت میں موجود صوفیاء کاملین کے احوال کا ذکر بھی فرمایا ہے۔صوفیہ کرام کے مقام و مرتبہ کو اکابرین تصوف نے بھی اپنے اپنے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے متعارف کروایا ہے۔اس ضمن میں ان اکابرین کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں تاکہ صوفی اور تصوف کی مکمل تصویر سامنے آسکے:

حضرت ذوالنون مصری فرماتے ہیں:

''جسے طلب تھکا نہ سکے اور سلب بے قرار نہ کرے وہ صوفی ہے۔اور صوفیہ ان لوگوں کا طائف ہے جنہوں نے ہر شے پر اللہ ہی کو غالب جانا، یہی وجہ ہے اللہ نے انہیں ہر چیز پر غلبہ عطا کیا۔'' (26)

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا:

''صوفی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے لحظہ بہ لحظہ ترقی و صعود کی جانب رواں ہیں محبت کی آگ ان کے دل میں شعلہ زن ہے اس پر بھی ان کی تشنگی کا یہ عالم ہے کہ ھل من مّزید (ہے کوئی جو اور زیادہ کرے) کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔'' (27)

حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ نے یوں فرمایا:

''صوفی وہ ہے جس کے دل میں اتنی صفائی ہو کہ اس کے صفائے قلب کے سامنے کوئی چیز پوشیدہ نہ رہے۔''(28)

حضرت شبلیؒ نے صوفیہ کے مقام کو یوں بیان فرمایا:

''صوفی مخلوق سے کٹ کر حق تعالیٰ کے ساتھ متصل ہو گیا ہے۔ نیز فرمایا صوفیہ حق تعالیٰ کی گود میں بچوں کی طرح ہیں (کیونکہ حق تعالیٰ اُن کی تربیت کرتا ہے)۔''(29)

حضرت ابوالقاسم قشیری فرماتے ہیں:

''صوفی وہ ہے جو ان احوال کی وجہ سے جو حق تعالیٰ کی طرف سے اس پر ظاہر ہوں، اپنی ذات سے مستغنی اور بے خبر ہوتا ہے۔ نیز فرمایا ''صوفی اللہ کی تدبیر و تصرف کے سامنے مقہور ہوتا ہے اور عبودیت کے تصرفات کی وجہ سے مستور ہوتا ہے۔''(30)

غرض ان تمام بیانات کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ تصوف اور صوفی کا رشتہ لازم و ملزوم ہے۔ صوفی وہ ہوتا ہے جو قرآن و سنت کی روشنی میں صراط مستقیم کی راہ اپنے فکر و عمل سے دیتا ہے۔ ان کے یہاں بلا تخصیص رنگ و نسل، قوم و مذہب اور ملک و وطن تمام انسان یکساں ہوتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہوتے ہیں جن کی سرشت میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم افضلیت لئے ہوئے ہوتا ہے اور یہی دراصل تصوف کی معراج بھی ہے۔

کوفہ اور بصرہ تصوف کے اولین مراکز رہے ہیں، جہاں سے صوفیانہ تحریک آگے بڑھنے کا راستہ ملا۔ چنانچہ اس عہد کے تصوف میں احساس گناہ اور خوف و خشیت الٰہی جیسے صفات ملتے ہیں۔ صوفیہ کے اس اولین طبقہ کا زمانہ 661ء سے 880ء کو محیط ہے۔ صوفیہ کرام کے پہلے دور کے نمائندہ صوفیہ اور انکے صفات سے متعلق افضل الدین جنیدی نے اپنے تحقیقی مقالے ''اردو شاعری میں تصوف (ولی سے اقبال تک) میں لکھتے ہیں:

''اس دور کے صوفیہ کرام میں حضرت اویس قرنیؒ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت مالک بن دینارؒ، حضرت واسعؒ، حضرت حبیب عجمیؒ، حضرت فضیل بن عیاضؒ، حضرت ابراہیم بن ادھمؒ وغیرہ شامل ہیں۔ جن کی تعلیمات میں

صفائے قلب، نیکی، فقر و قناعت، استغناء توکل، ایثار، ریاضت، ذکر و فکر، اتباع سنت اور استغفار پر زور دیا گیا۔ چونکہ ان تمام تعلیمات کے پس پردہ ''خشیتِ الٰہی'' کا غلبہ تھا تو اس بنا پر اس دور کے صوفیہ کی زندگی میں توبہ و استغفار کا پہلو نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ یہ دور تبع تابعین کا دور کہلاتا ہے اسلامی تصوف کو اس عہد میں بڑا فروغ ملا۔ اس دور کو تصوفِ اسلام کا عہد زرین کہا جاتا ہے۔''(31)

تصوف وصوفیہ کرام کا دوسرا طبقہ اس وقت معرض وجود میں آیا جب یونانی فلسفہ اور علوم کی وجہ سے مسلمانوں میں بگاڑ پیدا ہو رہے تھے۔ معاشرے میں ''عقلیت'' پرستی کا رجحان زور پکڑ رہا تھا اور مسلمانوں کے عقائد متزلزل ہو رہے تھے ایسے میں امتِ محمد یہ تذبذب سے دوچار تھی۔ آیاتِ قرآنی کی یونانی فلسفہ کے اعتبار سے تاویلات کی گئیں۔ سلاطین عباسیہ میں ''عقلیت پرستی'' کے رجحان کو بڑا فروغ ملا۔ علامہ اقبال نے اپنی تصنیف ''فلسفہ عجم'' میں اس دور کا منظر نامہ کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

''دور عباسیہ کے ابتدائی زمانہ میں عقلیت کے میلان کے اثر سے مذہبی جوش بتدریج ٹھنڈا ہونے لگا، اور دولت کی روز افزوں فراوانی سے اخلاقی احساس دبتا گیا، اور اسلام کے اعلیٰ طبقوں میں مذہبی زندگی سے بے اعتنائی برتی جانے لگی''(32)

تحقیقی مقالہ ''اردو شاعری میں تصوف کی روایت (ولی سے اقبال تک)'' میں افضل الدین جنیدی نے ڈاکٹر خلیق انجم کے توسط سے رقم طراز ہیں کہ

''اس ''عقلیت'' کے دور میں تصوف کا نیا رنگ نظر آیا اور اس دور کے مشہور صوفیہ حضرت بایزید بسطامیؒ، حضرت ذُوالنونِ مصریؒ، حضرت جنید بغدادیؒ وغیرہ نے عقلیت کے خلاف ''عشق'' پر زور دیا۔ اور ان بزرگوں نے اپنی تمام زندگی میں عشقِ الٰہی کی ایسی ضوفشانیاں کیں کہ ''عشق'' کے آگے عقلیت کا سیلاب تھم کر رہ گیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں: ''چنانچہ ان بزرگوں

(اس دور کے بزرگوں) نے عشق سے عقلیت کا مقابلہ کیا اور بتایا کہ عشق ہی سے منزل مقصود کا پتہ چل سکتا ہے۔''(33)

تصوف کا تیسرا دور نویں اور دسویں صدی عیسوی کو کہا جاتا ہے۔ اس عہد میں اسلامی فتوحات کا دائرہ کار میں وسعت پیدا ہوئی دنیا کے غالب حصہ پر مسلمانوں کا تسلط قائم ہوا۔ جب قوم وملت کے سامنے مسائل جدیدہ آنے لگے جن کے متعلق راست طور پر قرآن وحدیث میں کوئی واضح حکم نہیں تھا۔ چنانچہ فقہ کی تدوین شروع ہوئی اور قرآن وحدیث کے تناظر میں مسائل پر اکابرین نے غور وفکر کے بعد نئے اصول وضوابط بنائے۔ بالخصوص ائمہ مجتہدین حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی مذاہب حق وجود میں آئے۔ افضل الدین جنیدی اپنے تحقیقی مقالے میں کہتے ہیں:

'' امام ابوحنیفہؒ (699ء تا 766ء)، امام شافعیؒ (767 تا 820ء) امام مالک (715ء تا 795ء) امام احمد بن جنبلؒ (780 تا 855ء) کی نسبت سے بنیاد ڈالی گئی۔ لیکن ان بزرگوں کے وصال کو سو سال بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ ایک زبردست گمراہی اس زمانے میں پیدا ہوئی کہ فقہی مسائل میں حیلہ بازی کا دووازہ کھول دیا گیا۔ ان حیلہ بازیوں کی وجہ سے تصوف کی اساس تزکیۂ نفس اور اصلاح باطن کو بھلا دیا گیا تھا۔ اس دور میں صوفیہ کے اُس طبقے کا ظہور ہوا جس میں مذہب کی حقیقی روح کو بیدار کیا گیا اور اصلاحِ باطن اور تہذیب اخلاق کی طرف توجہ دلائی گئی۔ اس طبقہ کے مشہور صوفیہ کرام میں شیخ ابوسعید ابن العربی، شیخ ابومحمد الخلدیؒ، شیخ ابونصر سراجؒ، شیخ ابوطالب مکیؒ، شیخ ابوبکر اور ابوعبدالرحمن سلمیؒ قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے تصوف کے اخلاقی پہلو کو زبان اور قلم سے پیش کیا اور حیلہ بازیوں کے خلاف صحیح مذہبی روح کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔''(34)

تصوف کی صحیح تشریحات وتوضیحات اور مطالعہ کے سلسلہ میں ہزاروں کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں کچھ ایسی کتابیں بھی ملتی ہیں جو تصوف اور صوفیہ کے بارے منفی رائے کی حامل نظر آتی ہیں کہ تصوف کا تعلق اسلام سے ہرگز نہیں۔ ایک اور بات، ہمارا تحقیقی معیار بھی اس قدر پست ہوگیا ہے کہ تحقیق میں دہرانے کے عمل سے گزر رہا ہے ایسے میں حق کی تلاش و

جستجو نہ صرف تحقیق کی بنیاد ہے بلکہ تصوف کی بھی اساس ہے۔ ایسے میں من گھڑت تاویلات کے ذریعہ تصوف اور صوفیہ کو نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ اس میں کم علمی اور تحقیق سے دوری بڑی وجہ بنتی جارہی ہے۔ سید خورشید احمد گیلانی نے بڑی اہم بات کی ہے کہ:

''تصوف اور ارباب تصوف کے بارے میں پیدا شدہ غلطیوں کے اسباب میں ایک اہم سبب مطالعہ کرنے والوں کی سہل نگاری کو قرار دیا جائے تو بیجا نہیں ہوگا۔ غیروں نے جان بوجھ کر اپنے مطلب کے لیے وہ تحریریں اخذ کرلیں جو ان کے لیے مفید تصوف کے خلاف بطور ہتھیار استعمال ہوسکتی تھیں۔ اگر یہ انداز تحقیق کے معیار پر پورا اترتا ہے تو اسے اپنا کر کسی بھی کتاب کے بارے میں غلط رائے قائم کی جاسکتی اور غلط تاثر دیا جاسکتا ہے اور اس سے الہامی کتابیں بھی شائد محفوظ رہ سکیں۔ جیسا کہ ستیارتھ پرکاش میں قرآن مجید پر تبصرہ کیا گیا ہے۔''(35)

ہمارے مولفین و مصنفین نے تصوف کی اساس سے درگزر کرتے ہوئے زیادہ زور کشف و کرامات اور غیر مستند کتابوں کے حوالوں سے ملفوظات و ارشادات نقل کرتے رہے ہیں اور عہد جدید میں مادہ پرستی کا گراف اپنی معراج پر پہنچ چکا ہے۔ عوام و خواص کا ہر طبقہ اس سے متاثر نظر آرہا ہے ایسے میں عصری خانقاہیں عملی تصوف کے بجائے نظریاتی متصوف کے قائل نظر آرہے ہیں۔ ان خانقاہوں میں بھی سیاست زوروں پر ہے اور وہ اپنی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے میں اپنی توانائیاں صرف کررہے ہیں۔ جب تصوف اور صوفیانہ اقدار پر تنقیدیں ہوتی ہیں تو ایسے میں یہ لوگ لاجواب ہوجاتے ہیں یا مصلحت کوشی کا شکار۔ اس ضمن میں گیلانی صاحب کہتے ہیں:

یہاں ضمنی طور پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ تصوف کے بارے میں غلط فہمیوں کی پیداوار میں ان کتابوں کا بھی خاصہ دخل عمل ہے جو عملی کے بجائے نظری تصوف کا رجحان لیے ہوئے ہیں اور اسی مکتبِ فکر کی ترجمان ہیں جنہوں نے تصوف کا رجحان لیے ہوئے ہیں اور اسی مکتب فکر کی ترجمان ہیں جنہوں نے تصوف کی عملی تحریک اور روحانی انقلاب کے بجائے فلسفہ و منطق کی طرح ذہنی تعیش کا رنگ دے دیا ہے اور تصوف جو اپنی تعلیمات و افکار

کے لحاظ سے کھرا، سادہ، پر مغز، سہل اور قرآن وسنت کا خلاصہ تھا، اس میں فلسفیانہ ادق اصطلاحات، منطق کے پیچیدہ گنجلک قواعد اور علم کلام کی موشگافیاں اور نکتہ آرائیاں شامل کر دی گئیں جس سے تصوف عمل کے میدان سے نکل کر قیل وقال کے حلقے میں داخل ہو گیا ہے۔''(36)

تصوف اور صوفیانہ افکار ونظریات کی افہام وتفہیم اور حقیقی تصوف کو سمجھنے کے لئے تصوف کی بنیادی کتب کا مطالعہ دور جدید میں نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔علم تصوف پر تا حال ہزاروں کتابیں اور لاکھوں مضامین سپرد قلم ہو چکے ہیں مگر آج تک بھی تصوف کے متعلق غلط تاویلات اور من گھڑت باتیں پیش کی جاتی ہیں۔مگر ان منفی قیاسات اور تعریفات کے باوجود یہ بات بھی مسلمہ حیثیت رکھتی ہے کہ ہر دور میں جہاں ایک طرف اس کے مخالفین،تصوف کی مخالفت میں اپنی توانائیاں صرف کرتے رہے ہیں تو وہیں دوسری طرف موئیدین نے بھی اس کی اصل کو اسلامی تناظر میں پیش کرتے ہوئے دلائل و براہین کے ذریعے ان منکرینِ تصوف کا تشفی بخش جواب دیتے آرہے ہیں۔مگر ایک بات طے شدہ ہے کہ تصوف کے عناصر ہر دور اور ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں۔اور تصوف پر لاکھ اعتراضات سہی مگر موجودہ دور کی منفی فکر کو مثبت رخ صرف اور صرف تصوف کی ان کتابوں سے حاصل ہو سکتا ہے جنہیں امہاتِ کتب یا تصوف کی اساسی کتابوں کا درجہ حاصل ہے۔ان تصنیفات و تالیفات کے مطالعہ سے تصوف سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔اس ضمن میں سید خورشید احمد گیلانی رقم طراز ہیں:

''اب ہم ان امہات کتب کی تفصیل پیش کرتے ہیں جنہیں پڑھ کر انسان صحیح فیصلے پر بآسانی پہنچ سکتا ہے اگر خدا توفیق دے اور محنت و دیانت کی عادت ہو تو یہ کتابیں پڑھئے اور پھر جو بھی رائے قائم کیجئے اس میں وزن ہوگا،لیکن یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کتابوں میں سوائے قرآن وسنت کی تعلیمات کے کچھ نہ ملے گا،جن کتابوں کو پڑھنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے یہ تصوف پر قدیم اور مستند کتابیں سمجھی جاتی ہیں اور ارباب تصوف کے ہاں ان کا چلن عام اور ان کی حیثیت ایک دستور العمل کی سی ہے۔۔۔۔نیز ان کے اکثر مصنفین وہ مشہور ومعروف بزرگ ہیں جن سے عوام وخواص سب بخوبی واقف ہیں اور ان کی عقیدت کا دم بھرتے ہیں یہ کتابیں محض اخلاق و

روحانیت کی علمبردار نہیں بلکہ علم کا بھی شاہکار ہیں اور صوفیاء کرام کی علمی استعداد اور فکری صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔''(37)

ذیل میں تصوف کی اساسی کتب کی فہرست کتاب روح تصوف کے حوالے سے پیش کی جاتی ہیں:

	کتاب	مصنف	سنہ وفات
1۔	کتاب الرعایہ	شیخ حارث المحاسبی	243ھ
2۔	کتاب الصدق	شیخ ابوسعید خراز	286ھ
3۔	کتاب اللمع	شیخ ابونصر سراج	378ھ
4۔	قوت القلوب	شیخ ابوطالب مکی	386ھ
5۔	التعرف المذہب اہل التصوف	شیخ ابوبکر بن ابواسحاق کلاباری	412ھ
6۔	رسالہ قشیریہ	شیخ ابوالقاسم القشیری	465ھ
7۔	کشف المحجوب	شیخ سید علی الہجویری	472ھ
8۔	صدمیدان	شیخ عبداللہ انصاری الہروی	481ھ
9۔	احیاء العلوم	امام محمد غزالی	505ھ
10۔	کیمیائے سعادت	//	//
11۔	منہاج العابدین	//	//
12۔	فتوح الغیب	شیخ عبدالقادر جیلانی	562ھ
13۔	آداب المریدین	شیخ ضیاء الدین سہروردی	593ھ
14۔	عوارف المعارف	شیخ شہاب الدین سہروردی	632ھ

مذکورہ بالا فہرست اس بات کی شاہد ہے کہ صوفی معاشرہ میں ان کتابوں کی اہمیت وافادیت مسلم ہے اور ان کتابوں کو تصوف کی اساسی کتب کا درجہ حاصل ہے۔ان کتب کے مطالعہ کے بعد بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوسکتا ہے اور تصوف کے مخالفین کی زبانوں پر تالے بھی پڑھ سکتے ہیں۔بہر کیف صوفیانہ عناصر سے لبریز یہ کتابیں حقیقی تصوف کو روشناس کروانے میں معاون ومددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔

چھٹی صدی ہجری تک تصوف اپنے آب وتاب کے ساتھ انسانی قلوب میں جگہ کر چکا تھا اور اب وہ ایک تحریک کی شکل میں ترقی کے منازل طے کرر ہا تھا اور باضابطہ ایک علم کی حیثیت حاصل کر چکا تھا لہٰذا کئی ایک اصطلاحات بھی اس علم سے منسلک ہورہے تھے۔''کتاب الرعایہ '' کے تعلق سے یہ کہا جاتا ہے کہ تصوف پر یہ قدیم ترین تحریر ہے اور ہر دور کے صوفیہ کرام نے اس کتاب کے حوالوں سے اپنی تحریروں کی شان میں اضافہ کیا ہے۔اس کتاب کی اہمیت نہ صرف صوفیہ کے یہاں ہے بلکہ مورخین نے بھی اس سے فیض یاب ہوئے ہیں۔اسی عہد کی ایک اور کتاب ''کتاب الصدق'' کی بھی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اس کتاب کو شیخ فریدالدین عطار نے ''لسان الصدق'' قرار دیا ہے، کتاب کا اسلوب سوال جواب لیے ہوئے ہے اور صوفیہ نے اس کے اسلوب کی سادگی کا ذکر کیا ہے۔چوتھی صدی میں تصوف پر دو کتابوں کی مقبولیت رہی جن میں ''کتاب اللمع'' اور قوت القلوب اہم ترین سمجھے جاتے ہیں اور یہ دو تالیفات تصوف کی حقیقی روح کی افہام وتفہیم میں مدد دیتی ہیں۔پانچویں صدی ہجری میں ''رسالہ قشیریہ''، کشف المحجوب'' اور ''صدِ میدان'' اپنی آب وتاب کے ساتھ جلوہ گری دکھاتے ہیں۔''رسالۂ قشیریہ'' میں مختلف اصطلاحات کا تذکرہ ملتا ہے اس کتاب کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ تصوف مخالف ابنِ تیمیہ نے اس کی تعریف وتوصیف بیان کی ہے۔کشف المحجوب تصوف پر فارسی زبان میں لکھی جانے والی اولین کتاب ہے ۔جس میں قرآن وسنت سے تصوف کی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔

چھٹی صدی ہجری میں تصوف کو اعتبار حاصل ہوا اور روحانی سلسلوں کی ابتداء ہوئی اور تصوف کو ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل رہی جس کا سہرا حضرت غوث اعظم ،حضرت امام غزالی، شیخ شہاب الدین سہروردی اور محی الدین ابن العربی جیسی علم وعظمت والی شخصیتوں کے سر جاتا ہے۔

غوث اعظم کی شخصیت اور ان کے روحانی وعلمی کارناموں کی وجہ سے اس عہد کے بے شمار فتنوں کا سدِ باب ہوا۔آپ نے بے شمار کتابیں لکھی جن میں ''فتوح الغیب جیسی جامع کتاب کو ایک خاص مقام حاصل ہے، امام غزالیؒ نے تصوف وروحانی نظام کی حمایت کی خاطر بہت سی کتابیں لکھی جن میں ''احیاء العلوم الدین'' ''کیمیائے سعادت'' اور ''مکاشفۃ القلوب'' قابل ذکر ہیں۔یہ کتابیں بھی علم تصوف کی افہام وتفہیم میں بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔اس دور میں شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی تصنیف ''عوارف المعارف'' اور محی الدین ابن العربی کی ''فتوحاتِ مکیہ'' بھی تصوف کے معرکتہ الآرا تصانیف میں شمار ہوتی ہیں۔ڈاکٹر انور سدید ان دو تصانیف کے متعلق ڈاکٹر غلام مصطفی خاں کا قول نقل کرتے ہیں:

''اسلامی تحریک کے آخری دور میں تصوف کے دو نظریوں کو بہت اہمیت حاصل

ہوئی۔ اولاً یہ کہ حقیقت مُطلقاً نور ہے اور مادہ لانور ہے۔ ثانیاً یہ کہ حقیقت مطلقہ محض خیال ہے اور یہ کائنات کے ہر ذرے میں ظاہر ہے۔ اول الذکر نظریئے کی تبلیغ شیخ شہاب الدین سہروردی نے کی اور انسانی روح کو نور کے مقام اعلیٰ تک پہنچنے کی ترغیب دی۔ موخر الذکر نظریے کو ابن العربی نے فروغ دیا اور جذبے اور خدا کی تفریق ختم کردی۔ ابن العربی کی کتاب ''فتوحاتِ مکیہ'' تصوف کی اہم ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے اور ان کی عطایہ ہے کہ انہوں نے وحدت الوجود کے مسئلے کو ذہنی اور استدلی جامہ پہنا کر فلسفہ بنا دیا۔''(38)

تصوف کی ان تمام تصانیف کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ تصوف اسلام میں کوئی نئی چیز نہیں بلکہ اسلامی افکار و نظریات کا نام تصوف ہے۔ علم تصوف کو سمجھنے اور سمجھانے میں یہ کتابیں بنیادی ماخذ کا کام کرتی ہیں بلکہ موجودہ دور میں پائی جانے والی بہت سی الجھنوں کا مداوا بھی کرتی ہیں۔ کتاب روحِ تصوف کے پیش لفظ میں ان تمام غلط فہمیوں پر چوٹ کرتے ہوئے سید محمد فاروق القادری کہتے ہیں:

''جس طرح ہم نے شروع میں عرض کیا ہے کوئی تحریک کتنی اچھی کیوں نہ ہو یہ تمام و کمال وقت کا ساتھ نہیں دے سکتی، بلاشبہ یہی حال تصوف کا بھی ہوا، شریعت و طریقت کی تفریق دنیا سے فرار اور گریز اور مجاز پرستی کے ذریعے کئی خرافات اس میں گھس آئے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود مسلمانوں میں سے بعض حضرات نے انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ تصوف کو اسلام کے خلاف ایک سازش کا عنوان دے دیا۔ بعض دوسروں نے تقسیم شروع کر دی کہ تصوف کی اتنی قسمیں ہیں، ایک یہ ہے، ایک یہ ہے اور ایک یہ۔ یہ اس طرح ہے جیسے کوئی شخص بد عمل مسلمانوں کو دیکھ کر یا مسلمانوں کی تیسرے درجہ کی ثقہ کتابیں پڑھ کر اسلام کی تقسیم شروع کر دے۔ اگر یہ تقسیم درست مان لی جائے تو پھر یہ صرف تصوف ہی تک کیوں محدود ہے۔ دور ملوکیت میں مدون ہونے والے بعض فقہی فتاویٰ اور یونانی علوم کی مدافعت میں

مرتب شدہ کلام کیوں اس کی ذیل میں نہیں آتے۔سیدھی بات ہے کہ تصوف اسلامی میں جہاں جہاں خرافات گھس آئی ہیں انہیں کسی بھی صورت میں تصوف کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ایسی باتوں کا تصوف سے کوئی واستہ ہی نہیں۔خود اکابر صوفیہ نے اپنے اپنے دور میں ان برائیوں کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کی ہے۔آخری دور میں حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہم اللہ کی مساعی اسی نوعیت کی ہیں۔''(39)

عصر حاضر میں انسان نت نئے مسائل سے نبرد آزما ہے۔مادہ پرستی عروج پر ہے۔دنیا جن مسائل سے دوچار ہے ان میں معاشی و اقتصادی مسائل بڑی اہمیت اختیار کرتے جارہے ہیں۔امیر امیر ہوتا جارہا ہے اور غریب ،غربت اور مفلسی کے دلدل میں دھنستا جارہا ہے۔ایسے میں بے چینی اور قلبی و ذہنی اطمینان کہاں کسی کو نصیب ہوتا ہے۔قلبی سکوں و راحت کی خاطر انسان ایسے ایسے سہارے تلاش کررہا ہے جس کے نتائج منفی رخ اختیار کررہے ہیں، چنانچہ ایسے ماحول میں صوفیہ کی تعلیمات کو نہ صرف عام کیا جائے بلکہ ان پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب وتشویق دی جانی چاہئے۔یہ اس وقت ممکن ہے جب ہم حقیقی خانقاہوں کی نہ صرف بازیافت کریں بلکہ ان تمام صوفیانہ مآخذ و مصادر کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتے ہوئے دنیا کے غارت ہوتے ہوئے سکون و امن کو دوبارہ لوٹا سکتے ہیں جس کے لئے تصوف سے بڑی کوئی پناہ گاہ نظر نہیں آتی۔سید محمد فاروق نے لکھا ہے کہ صوفیہ کے کارناموں اور تصوف کو سمجھنے کے لیے تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی کتاب ''تاریخ تصوف'' سے کچھ نتائج اخذ کئے ہیں جن کے مطالعہ سے تصوف اور صوفیہ کی مثبت تصویر سامنے آتی ہے۔اخذ شدہ نتائج کو من وعن پیش کیا جاتا ہے تاکہ تصوف کی ایک واضح شکل سامنے آسکے:

- ☆ اسلام کی جو پاکیزہ تعلیمات کتابوں میں درج ہیں اور مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں صوفیہ نے اپنی خانقاہوں میں ان پر عمل کر کے دنیا کو دکھادیا۔
- ☆ صوفیہ نے ہر زمانے میں اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کو زندہ رکھا۔
- ☆ صوفیہ سے بڑھ کر تبلیغ اور تعمیر سیرت کا فریضہ کسی جماعت نے انجام نہیں دیا۔
- ☆ صوفیہ نے بادشاہوں کے سامنے علی الاعلان کلمۂ حق کہا۔
- ☆ جب مسلمانوں میں عقلیت کا مذاق پیدا ہونے لگا اور انہوں نے قرآن کو اپنی عقل کے تابع بنانا شروع کیا تو

صوفیہ نے محبتِ الٰہی کا درس دے کر عقلیت کے مضر نتائج کا ازالہ کیا۔

☆ جب فقہہ نے دین کے ظواہر پر زور دیا تو صوفیہ نے باطنی اصلاح اور قلبی طہارت کا درس دے کر قوم کو اعتدال کی راہ دکھلائی۔

☆ صوفیہ نے ہر دور میں غیر اسلامی عقائد شرک اور بدعت کی تردید کی۔

☆ سرمایہ داری کے مقابلہ میں انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت واضح کی۔

☆ بادشاہوں کو دین داری کی تلقین کی۔

☆ جب معتزلہ، فقہا اور متکلمین منطقی بحثوں میں الجھے ہوئے تھے اور امت کو فرقوں میں منقسم کر رہے تھے اس وقت صوفیہ نے مسلمانوں کو توحید اور یک نگاہی کا درس دیا۔

☆ جب فقہا مسلمانوں کو آپس میں لڑا رہے تھے اس نازک دور میں صوفیہ نے ان کو محبت اور ہمدردی کا پیغام دیا۔

☆ فقہا اور متکلمین نے (فتویٰ دے کر) مسلمانوں کو کافر بنا دیا مگر صوفیہ نے ان کو محبت اور ہمدردی کا درس دیا۔

☆ فقہا، متکلمین اور معتزلہ نے مختلف مذہبی گروہ بنا کر مسلمانوں کے شیرازہ ملی کو منتشر کر دیا مگر صوفیہ نے سب مسلمانوں کو کو جام وحدت پلایا۔

☆ علماء اور فقہاء بادشاہوں کا قرب حاصل کرتے رہے مگر صوفیہ دربارِ شاہی سے الگ تھلگ رہ کر ملوکیت کے مفاسد بیان کئے۔

☆ جب علماء بادشاہوں کو خوش کرنے کے لیے تاویلات میں مشغول تھے اس وقت صوفیہ بادشاہوں کو خوفِ خدا کا درس دیتے رہے۔

☆ معتزلہ، متکلمین اور حکماء نے اپنا وقت ذات وصفات کی بحثوں میں ضائع کیا، صوفیہ نے کہا کہ خدا کے بارے میں بحث فضول ہے۔ خدا منطق کے ذریعے نہیں مل سکتا۔ آئینہ قلب کو صاف کرو تا کہ اس کا دیدار ہو سکے۔

☆ علماء نے دینی کتابیں لکھیں صوفیہ نے وہ آدمی تیار کئے جنھوں نے ان کتابوں کے احکام پر عمل کر کے انقلاب برپا کر دیا۔

☆ علماء (متکلمین، معتزلہ حکماء) نے صرف دماغ کی آبیاری کی صوفیہ نے دماغ کے ساتھ ساتھ دل کی تربیت اور اصلاح کا فریضہ انجام دیا۔

☆ علماء نے دلائل سے اسلام کی حقانیت کو واضح کیا اور صوفیہ نے مشاہدۂ باطنی کے ذریعے سے اسلام کی صداقت واضح کیا صوفیہ نے مشاہدۂ باطنی کے ذریعے سے اسلام کی صداقت واضح کی۔

حوالہ جات:

1 مضمون تصوف کی افادیت، محمود زکی مطبوعہ ماہنامہ راشٹریا سہارا اکتوبر 1993، ص36

2 تفسیر روح البیان/جلد نمبر۔8، حضرت علامہ شیخ اسماعیل حقیؒ، ص 429

3 بخاری شریف/جلد اول/کتاب الایمان، ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ، ص 117

4 فتوح الغیب (اُردو)، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، ص 739

5 کائنات تصوف، محمد اشتیاق عالم ضیا شہبازی، ص160

6 سیرت جنید، علامہ فضل احمد عارف، ص265

7 رسالہ قشیریہ، ابوالقاسم عبدالکریم ہوازن قشیری، ص535

8 کشف المحجوب، حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ، ص69

9 برکات روحانی۔طبقاتِ امام شعرانیؒ، حضرت عبدالوہاب الشعرانیؒ، ص54

10 تذکرۃ الاولیاء، حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ، ص110

11 عوارف المعارف، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، ص194

12 ایضاً ایضاً، ص196

13 اسلامی تصوف، امام ابوحامد غزالیؒ، ص216

14 تصوف اور صوفی اقدار کی آبیاری میں حضرت سید احمد کبیر رفاعی کا کردار، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، صوفی، ص14

15 امام احمد رضا اور معارف تصوف، جمع وترتیب: محمد عیسیٰ رضوی، ص33

16 عوارف المعارف، شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ، ص 693

17 ایضاً ایضاً، ص 692

18 امام احمد رضا اور معارف تصوف، جمع از: محمد عیسٰی رضوی، ص38

19 مکتوباتِ صدی، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ، ص172

20 خزینۃ التصوف، مولانا صدرالدین، ص4

21 کتاب اللمع، حضرت ابونصر سراج، ص53

22 عوارف المعارف، حضرت شیخ شہاالدین سہروردی، ص204

23 کائناتِ تصوف، محمد اشتیاق عالم ضیا شہبازی، ص154

24 کتاب اللمع، حضرت ابونصر سراج، ص44

25 سنن ترمذی کنا المنافت، امام ترمذیؒ، ص65

26 کتاب اللمع، شیخ ابونصر سراج، ص57

27 عوارف المعارف، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، ص206

28 بزمِ صوفیہ، سید صباح الدین عبدالرحمن، ص183

29 رسالہ قشیریہ، ابوالقاسم عبدالکریم ہوازن قشیری، ص537

30 ایضاً ایضاً، ص539

31 تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی بعنوان ''اردو شاعری پر تصوف کے اثرات (ولی سے اقبال تک)، مقالہ نگار: افضل الدین جنیدی، ص10

32 فلسفۂ عجم، علامہ اقبال، ص95

33 تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی بعنوان ''اردو شاعری پر تصوف کے اثرات (ولی سے اقبال تک)، مقالہ نگار: افضل الدین جنیدی، ص10.11

34 ایضاً، ایضاً، ص11

35 روحِ تصوف، سید خورشید احمد گیلانی، ص71

36 ایضاً، ایضاً، ص74-73

37 ایضاً، ایضاً، ص77-76

38 اُردو ادب کی تحریکیں) ابتداء تا 1975ء)، ڈاکٹر انور سدید، ص67

39 روحِ تصوف، سید خورشید احمد گیلانی، ص9- 10

☆☆☆

باب دوم

اردو شاعری میں تصوف کی روایت

فارسی شاعری کی روایت سے قبل عربی زبان اور اس کی شاعری کا پسِ منظر بھی فارسی کی روایت کی افہام وتفہیم میں معاونت کرتا ہے۔عہدرسالت سے قبل یعنی دورِ جاہلیت میں عربی شاعری کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔مگر یہ شاعری قصیدہ گوئی تک محدود رہی اس میں زبان کی ندرت اور اپنے قبیلوں کی بہادری کے قصوں کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں ایسے اشعار بھی آجاتے تھے جس میں اخلاقی پہلو بھی نمایاں ہوتے تھے۔اس بابت ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی لکھتے ہیں:

''عام جاہلی شعراء کے کلام میں اس زمانے کے اعتبار سے اعلیٰ اخلاقی تعلیمات،شریف اور پاکیزہ معانی اور بلند پایہ اغراض ومقاصد ملتے ہیں ان کے یہاں انعام واکرام کی لالچ سے کسی امیر یا بڑے آدمی کی مدح یا کسی قبیلہ کی خواہ مخواہ اور بلا سبب ہجو نہیں ملتی۔مگر کچھ شعراء ایسے گزرے ہیں جنہوں نے شعر کو مال ودولت اور انعام واکرام حاصل کرنے کا ذریعہ بنا رکھا

تھا۔‘‘(1)

عہد رسالت میں شعراء نے حضور مکرم ﷺ کی صحبت فیض حاصل کر کے اپنی شاعری کے محور و مرکز کو عشق حقیقی کی طرف مرکوز کیا دراصل یہی عشق رسول ﷺ آگے چل کر تصوف و عرفان کا محور بنا۔ اس عہد کے ضمن میں مولانا یسین اختر مصباحی فرماتے ہیں:

’’جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا (مبعوث فرمایا) اس کے بعد صحابہ کرام آپ کی مدح و توصیف میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں مقابلہ کرنے لگے اور آپ کی توصیف و تعریف کو لذت روح اور توشہ ایمان بنالیا اور جن لوگوں نے ان میں فروغ حاصل کیا وہ آپ کے تین صحابی ہیں کعب بن مالک، عبداللہ بن رواحہ اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہم اجمعین۔ یہ لوگ برابر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کرتے رہے اور آپ کی تعریف میں رطب اللسان رہے آپ سے اور آپ کے دین (اسلام) کی مدافعت کرتے رہے اور زندگی بھر کفار و مشرکین کی ہجو اور مذمت کرتے رہے یہی تینوں حضرات نعت گو شعراء کے ہراول ہیں۔‘‘(2)

عربی شاعری میں نعتیہ شاعری کے حوالے سے تصوف کی بنیاد رکھی گئی یہ اور بات ہے کہ اس دور میں تصوف کی اصطلاح رائج نہیں ہوئی تھی لہذا صوفیانہ افکار حضرت محمد ﷺ کی تعریف و توصیف اور آپ ﷺ کی عظمت و رفعت میں پنہاں رہے۔ جس کو نمایاں کرنے کے لیے اس عہد کے شعراء نے شعری فکر و فن کے جلوے بکھیرے۔ اس طرح صحابہء کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو نبی کریم ﷺ کی صحبت بافیض کی وجہ سے تفقہ فی الدین حاصل ہو چکا تھا چنانچہ انہوں نے اللہ تبارک تعالیٰ کے اس حکم کے بعد وہ صحابی رسول ﷺ جن کو شعر گوئی سے نسبت تھی انہوں نے عقیدتوں اور محبتوں کے گل رسالت مآب ﷺ کے دربارِ گوہر بار میں پیش کیا۔ اس تعلق سے حضرت شیخ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

’’حضور اکرم ﷺ کے شعراء کرام میں سے جو حضرات کافروں کے شر کو اسلام اور مسلمانوں سے دفع کرتے اور باز رکھتے اور رسول ﷺ کی مدح کرتے اور کافروں کی ہجو اور مذمت کرتے تھے تھے وہ تین اشخاص شمار کئے

گئے ہیں حضرت حسان بن ثابت، کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم ''روضتہ الاحباب میں منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے خدام شعراء مردوں میں ایک سو ساٹھ اور عورتوں میں بارہ تھیں۔'''(3)

اس اقتباس سے یہ بات مترشح ہوجاتی ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کی شان میں نعتیہ قصائد لکھے جس میں صوفیانہ عناصر کی نشاندہی بہ آسانی کی جاسکتی ہیں۔اس عہد میں حقیقی جذباتی وابستگی کا قبلہ حضور ﷺ کی ذات بابرکت تھی اور اس کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ دل کی بات زبان پر آئے اور یہ بات نغمہ بن کر صحرائے عرب میں گونج اٹھی اس طرح صحابہ کرام نے عشق حقیقی کی شمع کو روشن کرتے ہوئے مستقبل قریب میں صوفیانہ شاعری کی راہیں آسان کردیں۔اس طرح عربی شاعری کی یہ روایت مختلف واسطوں اور صوفیہ کی وجہ سے بیرون عرب پہنچ کر صوفیانہ شاعری کو سرسبز وشاداب کیا۔عربی کی نعتیہ شاعری کے سلسلہ میں مولانا عبدالقدوس کہتے ہیں:

''عہد صحابہ میں اور اس کے بعد دین اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ عربی زبان بھی پھیلتی چلی گئی، یہاں تک کہ اندلس سے ملتان تک پھیل گئی اور پچی سے سرالیون تک جا پہنچی۔عربی میں شعر کہنے والے ہر جگہ پیدا ہوئے اور ہر جگہ نعتیہ قصائد بھی لکھے گئے۔عہد تابعین اور زمانہ مابعد میں تو عربی زبان میں اتنے نعتیہ اشعار کہے گئے کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔اس وقت سے اب تک ہر ملک کے مسلمان شعراء اپنی اپنی زبانوں میں بھی نعتیہ قصائد لکھے۔عربی بولنے والے ممالک ہی نہیں بلکہ ان ممالک میں جہاں عربی نہیں بولی جاتی وہاں بھی عربی میں نعتیہ اشعار کہے جاتے ہیں۔کابل، لاہور، دہلی، سکھر، لکھنو، عظیم آباد میں علماء نے عربی میں نعتیہ قصائد لکھے ہیں۔حضرت رسول اکرم ﷺ کا ذکر اور ان کی رفعت شان بیان کرنا شاعری کی معراج ہے اور خود شاعر کے لیے بھی سعادت کا وسیلہ۔''(4)

عربی شاعری میں صوفیانہ عناصر عرب وعجم میں یکساں دیکھے جاسکتے ہیں۔اس ضمن میں حضرت

امام زین العابدین، حضرت امام اعظم ابوحنیفہ، علامہ شرف الدین بوصیری، حضرت ابن جابر اندلسی، شیخ عبدالرحیم البرعی، ابن نباتہ مصری، شہاب الدین محمود الحلبی، شیخ جمال الدین صرصری، عبدالرحمن بن خلدون، شیخ عبدالغنی نابلسی، حضرت بندہ نواز، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، غلام آزاد بلگرامی، علامہ فضلِ حق، شاہ برکت اللہ مارہروی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی وغیرہم نے عربی شاعری کے ذریعہ عشق حقیقی پر مبنی شاعری کرتے ہوئے صوفی اساس شاعری کی بنا ڈالی اور عربی شاعری کے ذریعہ ان صوفیہ کرام نے فن شاعری کو جامع اوصاف ومحامد اور تصوف وعرفان کا گنجینہ بنا دیا۔

عرب کے علاوہ ایران و ہندوستان میں عربی ، فارسی اور اردو صوفیانہ شاعری کی سعادت ان حضرات کو ہی حاصل رہی جن کی رسائی صوفیہ کی محفلوں تک تھی اور وہ خود بھی صاحب قلب ونظر تھے ان محفلوں نے ان کے قلوب کو مصفیٰ ومجلیٰ بنایا۔ صفائی قلب نعتیہ شاعری کا جوہر ہے اور اسی جوہر کو صوفیانہ عناصر سے بھی شعراء نے لبریز کیا ہے۔ اس لیے براعظم ایشاء میں صوفیہ کے مختلف سلاسل اور ان کی خانقاہوں نے نہ صرف نثری تصانیف کے ذریعے بلکہ مختلف اصناف سخن کے ذرائع سے عشقیہ اور صوفیانہ شاعری کو فروغ دیا۔ عشق حقیقی سے متعلق عبدالستار ہمدانی لکھتے ہیں:

> ''عشق حقیقی مستحسن ہے بلکہ روحِ ایماں کی حیات ہے۔ عشق حقیقی کا اطلاق اللہ تبارک وتعالی کے ساتھ اس کے محبوب اعظم ﷺ کے ساتھ یا دینِ اسلام اور اسلامی شخصیتوں کے ساتھ ''الحبُ اللہ'' کے جذبہ صادق کے تحت کئے جانے والے عشق پر ہوتا ہے۔''(5)

عربی زبان کی روایت جب دیگر ملکوں اور زبانوں میں اشاعت وفروغ پائی تو دنیا کی مختلف زبانوں میں صوفیانہ شاعری کے نمونے دستیاب ہونے لگے۔ اس طرح عجمی زبانوں میں بھی عشق حقیقی سے لبریز شاعری کی گئی۔ فارسی نے عربی رسم الخط کو اختیار کرتے ہوئے فارسی میں ہر طرح کی شاعری کو روا رکھا۔ جن میں عشق حقیقی اور مجازی دونوں طرح کے مضامیں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ فارسی میں مختلف اصناف میں صوفیانہ رنگ کی شاعری کی گئی۔ لہذا فارسی نعتیہ شاعری میں بھی اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں جن میں مدحت رسول ﷺ کو پیش نظر رکھا گیا ہے پھر مناقب اور قصائد کا سلسلہ چل پڑا اس طرح مختلف اصناف شعر میں صوفیانہ شاعری کے عناصر کی جلوہ گری ہوئی ہے۔ چنانچہ فارسی زبان میں مختلف تذکرہ نویسوں نے ابوسیعد ابی خیر کو صوفیانہ شاعری کے سلسلہ میں اولیت دیتے آرہے ہیں۔ جن کا تعلق حضرت جنید بغدادی کے سلسلہ سے ہے۔ چنانچہ اس کے بعد فردوسی، سید حسن غزنوی، حکیم سنائی، خاقانی، نظام گنجوی، شیخ فرید الدین عطار، فخر الدین گرگانی، انوری، مولانا

رومی، ، شیخ سعدی، شمس الدین شیرازی، جامی، ، قدسی، امیر خسرو، ، عرفی، بیدل، مرزا غالب، امام احمد رضا اور علامہ اقبال وغیرہ کو صوفیانہ شاعری میں کمال حاصل رہا ہے۔ فارسی زبان و ادب کی روایت ہندوستان میں دس صدیوں کو محیط رہی ہے۔ بقول ڈاکٹر شرف النساء انصاری:

> ''اوراقِ تاریخ اس امر کے شاہد ہیں کہ فارسی زبان ہندوستان کی سرزمین پر تقریباً ہزار سال تک زبان رسمی کی حیثیت سے اپنا سکہ جمائے ہوئے رہی۔ ادبیاتِ فارسی کا دامن شعر و نثر، تاریخ و تصوف، فلسفہ و طب، ہیئت و نجوم کے گران بہا جواہر ریزوں سے اس قدر مملو ہے کہ اس کی ارزش و اہمیت کا انکار کسی صاحب نظر ناقد و محقق کے لیے ناممکن ہی نہیں دشوار بھی ہے اساتذہ سخن کے دواوین و نثری شاہکار اس بات کے گواہ ہیں وہیں تواریخ عہد شاہان مغلیہ ہند و سلاطین دکن اپنے بے بہا خزائن سے اس زبان کی عظمت کا اعتراف کرر ہے ہیں اور ان ادوار کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ادبی کارناموں کے امین بھی ہیں۔''(6)

ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کا ارتقاء میں ہندوستان کے فارسی شاعروں کے ساتھ ساتھ ایرانی شاعروں کا بھی اہم رول رہا ہے جنہیں ہند کے شاعروں نے اپنا رول ماڈل بنایا اور ان کی اتباع میں شعر و ادب کا چراغ روش کیا۔ آگے چل کر ہندوستانی زبانوں نے اس شعری روایت کو آگے بڑھایا۔

اردو شاعری کی روایت میں، فارسی شاعری کا گرانقدر حصہ رہا ہے۔ خواہ وہ نثر ہو کہ نظم، بیشتر کلاسیکی اصناف سخن اس بات کے گواہ ہیں کہ اس کا مبدا عربی و فارسی ہے۔ یہ اضاف سخن، اوزان و بحور وغیرہ، میں ہندوستانی مزاج و ماحول کے مطابقت پیدا کرنے کی خاطر تبدیلیاں لائیں گئی ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر نثار احمد فاروقی اپنے ایک مضمون ''اردو کی شعری روایت اور کلام غالب کے امتیازی پہلو'' میں فرماتے ہیں:

> ''اب یہ دیکھنا ہے کہ اردو شاعری کی روایت کس طرح بنی ہے۔ اردو ادب میں خواہ وہ نظم ہو یا نثر، جتنی اصناف ہیں ان کے نام ہی بتا رہے ہیں کہ ان کی اصل عربی وہ فارسی ہے۔ لفظ ادب ہی کو دیکھئے پھر نظم، نثر، غزل، قصیدہ،

مثنوی، مخمس، مسدس، رباعی، قطعہ، مرثیہ، ہجر، مدح، اسطرح اوزان وبحور ،ردیف وقافیہ، معنی وبیان سلاست، فصاحت، بلاغت، غرض یہ ساری اصطلاحیں عربی کی ہیں مگر فارسی کے علاقوں سے گزر کر آتی ہیں۔ اور ہندوستانی مزاج کے مطابق ان میں ترمیم کرلی گئی ہے''۔(7)

بحور واوزان، اصناف کے ساتھ ساتھ موضوعاتی سطح پر بھی اردو کے شعراء فارسی شاعری کی روایت سے مستفید نظر آتے ہیں۔تصوف اورشاعری بھی ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کا درجہ رکھتے ہیں۔شاعری میں ابتداء ہی سے تصوف کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔اردوشاعری میں تصوف کی جلوہ نمائی فارسی سے خوشہ چینی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے لہٰذا تمام اصناف سخن کے ساتھ ساتھ شعری فکروفن میں بھی فارسی شاعری کا تتبع کرنا اردوشاعری کا شیوہ رہا ہے۔اس لیے علمائے ادب کا کہنا ہے کہ شعروادب میں روایت کی بڑی اہمیت ہے اگر آفاقی اقدار کا حامل ادب تخلیق ہونا ہوتو اس کی روایت بھی مضبوط ومربوط ہونا ایک لازمی امر ہے چنانچہ بشیر بدر نے جدید شعری روایت کے سلسلہ میں جو بات کہی ہے وہ اردو کے شعری سرمایہ کواس کی روایت پر بھی منطبق کیا جاسکتا ہے۔وہ کہتے ہیں:

''روایت سے واقفیت کے بغیر نہ روایت کی توسیع کی جاسکتی ہے اور نہ اس سے انحراف جدید اظہار میں بھی روایت کا بہت بڑا حصہ ہے کوئی لفظ استعارہ پرانے الفاظ کو اپنے طور پر برتنے کا رویہ احساس کا نیاپن اسے روایت کی تجدید کے حدود سے آگے بڑھا دیتا ہے، جدید غزل کے اکثر شعراء کے یہاں روایت سے استفادہ کا رویہ ملتا ہے کسی کے یہاں کسی وقت یہ تقلید ہوکر رہ جاتا ہے، اور کس کے یہاں کس وقت اس کی اپنی آواز کونکھارنے اور اسے مہذب کرنے کا وسیلہ بن جاتا ہے'' (8)

ذیل میں چند فارسی شعراء کا مختصراً جائزہ لیا جارہا ہے اوران کی شاعری میں صوفیانہ عناصر کی نشاندہی کی جارہی ہے تاکہ اردو کی شعری روایت کو سمجھنے میں آسانی ہوسکے۔

ابوسعید بن ابی الخیر علیہ الرحمہ (967-1049ء):

ابوسعید ابی الخیر ایک صوفی منش شاعر رہے ہیں جنہیں تذکرہ نویسوں اور ناقدین نے پہلا صوفیانہ شان رکھنے والا شاعر

کہا ہے۔ ان کو وحدت الوجود مکتبِ فکر رکھنے والا اولین صوفی شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ وہ جنید بغدادیؒ کے سلسلہ کے ایک درویش 'صوفی ابوالفضل بن حسنؒ سے بیعت حاصل کئے تھے۔ اور کئی سال تک ریاضت و مجاہدہ کیا پھر اپنے پیر کے حکم سے نیشاپور کے ایک صوفی عبدالرحمن سلمیؒ سے خرقہ حاصل کیا۔ نیاز فتح پوری نے اپنے ایک مضمون میں ابوسعید کے حالات ذکر کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''ابوسعید جماعت صوفیہ میں بڑا اہم درجہ رکھتے ہیں۔ وہ بایزید بسطامیؒ کی طرح وحدت الوجود کے بڑے زبردست مبلغ تھے۔ ان کو صوفیانہ شاعری کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ یہ صرف رباعیات کہتے تھے۔ اور سب سے پہلے انہوں نے ہی صوفیانہ رنگ رباعیوں میں پیدا کیا۔''(9)

شیخ ابوسعید نے عشق حقیقی کے غلبہ کے تحت ''وحدت الوجود'' ، ہمہ اوست، عشق و حسن وغیرہ جیسے تصوف کے موضوعات کو رباعیات کے ذریعے پیش کیا۔ ان کی روایت کو آگے بڑھانے میں سنائی، عطا اور رومی وغیرہ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ابوسعید کی رباعیات کا زیادہ تر حصہ صوفیانہ مسائل کی نمائیندگی پر مشتمل ہے:

بحر ہست　وجود جاوداں　موجِ زناں
زاں بحر ندیدہ غیر موج اہل جہاں
از باطن بحر موج بیں گشتہ عیاں
بر ظاہر بحر و بحر در موج زناں

....

اے ذات تو در صفات اعیاں طاری
اوصاف تو در صفات شاں متواری
وصف تو چو ذات مطلق است امانیست
در ضمن مظاہر از تقید عاری

....

راہ تو بہر قدم کہ پونید خوش است

وصل تو بہر سبب کہ جو نید خوش است
روئے تو بہر دیدہ کہ بینید نکو است
نامِ تو بہر زبان کہ گونید خوش است

مذکورہ بالا رباعیات جو ابوسعید کے میلان تصوف کی نشاندہی کرتے ہیں۔۔ابوسعید ابوالخیر کے ہم عصر شاعروں میں نظام ملک طوسی، ناصر خسرو، امام غزالی، عمر خیام وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں جنہوں نے اپنی صوفیانہ شاعری کے ذریعے بعد کے شعراء کو متاثر کیا۔

عبداللہ انصاری

ابوسعید ابوالخیر کے ہمعصروں میں خواجہ عبداللہ انصاری کا شمار ہوتا ہے جن کا وطن 'ہروی' ہے۔ ابوالحسن خرقانی سے عقیدت رکھتے تھے۔آپ کو بھی ابوالخیر کی طرح صنف رباعی میں اعتبار ملا۔اور رباعیات میں تصوف کے کئی رموز بیان کئے ہیں:

در راہ خدا دہ کعبہ آمد حاصل
یک کعبۂ صورنسبت یک کعبۂ دل
تا بتوانی زیارت دلہا کن
کافزوں زہزار کعبہ آمد یک دل

آپ کی تصانیف میں 'ذم الکلام' اور ''منازل السائرین'' عربی میں اور ''نادالعارفین'' اور ''کتاب اسرار'' فارسی میں شامل ہیں۔ چنانچہ مصنف ادبیات ایران لکھتے ہیں:

''شیخ نہایت جاذب، رواں، صوفیانہ اور عاشقانہ رباعیاں بھی کہی ہیں۔ اس طرح شیخ اولین اور قدیم ترین خاص کر عرفانی اور صوفیانہ رباعی گو شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔'' (10)

عمر خیام (متوفی: 1124ء)

فارسی رباعی گوئی میں عمر خیام جیسی شہرت کسی اور فارسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ مشرق کے علاوہ مغرب میں ان کو متعارف کروانے میں فٹز جیرالڈ کا اہم رول رہا۔ نیشاپور سے تعلق رکھنے والے خیام فلسفہ، منطق، فنِ ادب اور مذہبیات میں کمال

رکھتے تھے۔مگران کی شہرت ایک رباعی گو کی حیثیت سے رہی۔ان کے رباعیات میں مختلف النوع مضامین ملتے ہیں جن میں معرفت وعرفان کی باتیں بھی ان کی رباعیوں کا حصہ ہیں:

من بندۂ عاصیم رضائے تو کجا است
تاریک ولم نورِ صفائے تو کجا است
مارا تو بہشت اگر بہ طاقت بخشی
آں بیع بود لطف و عطائے تو کجا است

....

من بے مئے ناب زیستن نتوانم
بے جام کشیدہ بارِ تن نتوانم
من بندۂ آن و مم کہ ساقی گوید
یک جام و گر بگیر ومن نہ توانم

....

در دہر بر آنکہ نیم نانے دارد
وز بہر نشست آستانے دارد
نے خادم کس بود نہ مخدوم کسے
گو شاد نرمی کہ خوش جہانے دارد

....

اسرا ازل را نہ تو دانی و نہ من
این حرف معمہ نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پس پردہ گفتوئے من و تو
چون پردہ برافند نہ تو مانی و نہ من

....

در من که ز چه روئی گشته ساجد ما
بت گفت به بت پرست کاے عابد ما
بر ما جمال خود تجلی کرده است
آنکس زتست ناظر و شاہد ما

عمر خیام نے رباعیوں میں مختلف مضامین باندھے ہیں اور جن میں صوفیانہ مضامین کی بھی نشاندہی بہ آسانی کی جاسکتی ہے۔اس سلسلہ میں ڈاکٹر زیب حیدر لکھتی ہیں:

''خیام نے مسئلہ وحدت الوجود کی ایک نئی ہی تعبیر کی ہے۔کبھی کہتے ہیں تمام عالم ایک شخص ہے۔خدا اس کی روح ہے فرشتے اس کی حسین ہیں اور باقی کائنات اس کے اعضاء۔کبھی خدا کو جہاں کی جان اور کبھی خود کو جہاں کی جان کہتے ہیں۔کبھی کہتے ہیں میں اور تو پرکار کا نمونہ ہیں۔ہمارے سر علیحدہ ہیں لیکن جسم ایک دائرہ کی طرح ہم ایک نکتہ پر رواں ہیں۔آخر کار ہم پھر مل جائیں گے۔کبھی کہتے ہیں خدائے حاضر و ناظر کا میں ہی مظہر ہوں اس لیے تیرا مسجود ہوں۔''(11)

فارسی شعر و ادب میں عمر خیام اپنی رباعی کی وجہ سے زندۂ جاوید ہیں۔

حکیم سنائی (متوفی **1150**ء):

صوفیانہ اقدار کے حامل فارسی شاعروں میں حکیم سنائی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ان کے کلیات میں صوفیانہ اشعار جا بجا نظر آتے ہیں۔حکیم سنائی نے مثنوی اور قصائد لکھے ہیں جن میں صوفی افکار کی گونج سنائی دیتی ہے۔

من از آتش عشق ہم نرم گردم!
اگر چه ز پولاد سخت اسب لادم!
منم بنده عشق نازنده باشم
اگر چه ز ما در من آزاد زادم

....

طلب　　اے　　عاشقان　　خوش　　رفتار

طرب　　اے　　نیکوان　　شیریں　　کار

حکیم سنائی صوفیانہ شاعری کو ایک نئے طرز شعری سے روشناس کروایا ہے اور ان کی شاعری حقائق و معارف کا ایک دفتر نظر آتی ہے۔ ناقدین کا بھی خیال ہے کہ انہوں نے اخلاقی شاعری کے لئے بھی راہیں متعین کی ہے۔ مختلف ادوار کے سلف و صالحین اور مصنفین نے آپ کے عشقیہ کلام کو اپنی تحریروں اور تقریروں میں استعمال کرتے رہے ہیں۔ صاحب کائنات تصوف محمد اشتیاق عالم لکھتے ہیں:

> ''صوفی شعراء میں آپ کی بلند پائیگی اور عظمت مسلم ہے۔ علمائے تصوف اپنی تصانیف میں آپ کے اشعار کثرت کے ساتھ بطور دلیل پیش کرتے رہے۔ ان کی مثنوی ''حدیقۃ'' اور ''سیر العباد'' مشہور زمانہ ہوئیں اس کے علاوہ ان کی چھ مثنویاں اور ہیں۔ حدیقہ میں تصوف کے مشہور مقامات و مصطلحات کو مستقل عنوان بنایا ہے اور ان حقائق پر گفتگو کی ہے۔''(12)

اس دور میں ہر سخنور نے اپنی شعری کمالات کا سکہ بٹھایا ہے اور علم و حکمت، تصوف و عرفان وغیرہ سے اپنے ایوان سخن کو سجایا اور سنوارا ہے۔ اس دور میں انوری (متوفی 1186)، خاقانی (متوفی 1185)، نظام گنجوی (متوفی 1203)، ظہیر فاریابی (متوفی 1206) وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں جنہوں نے صوفیانہ شاعری کی روایت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس کاروان کو آگے بھی بڑھایا۔

شیخ عطار (متوفی **1230**):

صوفی شاعروں میں عطار صاحب بلند مقام کے حامل کہلائے جاتے ہیں۔ حضرت عطار نے عمرِ عزیز کا غالب حصہ تصنیف و تالیف، عرفان و سلوک میں گزارا۔ لہٰذا شیخ فرید الدین عطار صوفی شعراء کے لیے امام و پیشوا تسلیم کئے جاتے ہیں۔ عرفانی کلام ملاحظہ فرمائیں:

عزم　　خرابات　　بی　　فناتتواں　　کرد

دست　　بیک　　دردبی　　صفا　　نتواں　　کرد

....

چوں　نہ　وجود　است　نہ　عدم　بخرابات
اجرم　ایس　یک　ازآن　جد　انتواں　کرد

....

گم　شدن　وبی　خود　یست　راہ　خرابات
تو　شہ　ایں　راہ　جز فنا　نتواں　کرد

☆

پر　شد　از　دوست　ہر　دو　کون　و　لیک
سوئے　او　زہرہ　اشارت　نیست

ان کے صوفیانہ اشعار اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ وہ ایک کامل صوفی تھے اور ان کا مذہب و مسلک عشق حقیقی تھا۔ فارسی کے مابعد شعراء نے ان کا گہرا اثر قبول کیا۔ چنانچہ ان کے صوفیانہ شاعری سے متعلق شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''ان کا فلسفہ یہ ہے کہ تمام اشیاء میں وہی جاری وساری ہے اور اسی نے ہر چیز میں حسن پیدا کر دیا ہے (گویا ساری رنگا رنگی اور دھوم دھام 'ہمہ اوست' کی ہے)۔''(13)

مولانا جلال الدین رومی (متوفی 1272ء)

جلال الدین رومی فارسی مثنوی کے سب سے زیادہ معروف مثنوی نگار رہے ہیں جن کی مثنوی کا شہرہ ہر زمانے میں رہا ہے۔ رومی کی صوفیانہ تربیت میں شمس تبریز کی صحبت کا بڑا فیض کرم رہا ہے۔ خود لکھتے ہیں:

مولوی　ہرگز نہ　شد　مولائے　روم
تا　غلامِ　شمس　تبریزی　نہ　شُد

مولانا روم سے فارسی اور اُردو شعراء نے بھی اثرات قبول کئے بالخصوص علامہ اقبال تو مولانا روم کو اپنا مرشد معنوی تصور کرتے تھے۔ مولانا کی مثنوی تصوف وعرفان اور علم وحکمت کے حکایات سے پُر ہے شعر ملاحظہ ہوں:

بشنو از　نے　چو　حکایت　می　کند

وزجدائی ها شکایت می کند

....

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق

تا نما یم شرح دردواشتیاق

مثنوی میں حکایات وقصص کے طرز میں صوفیانہ افکار اور زندگی کے مسائل تمثیلی انداز میں نمایاں ہو گئے ہیں۔ان کی قوت تخیل عمدہ ہے اور صوفیانہ مسائل کے لیے مثنوی میں عام حکایات کو موضوع کیا گیا ہے۔ان کی مثنوی ہمہ گیر وصف کی حامل ہے جس میں فکر و فلسفہ، علم و ہنر، دیگر موضوعات بھی عمدگی سے بیان ہوئے ہیں۔مثنوی کے علاوہ آپ کی غزلیں عشقیہ واردات اور جوش وجنون کی کارفرمائی نظر آتی ہے:

عشق شد مہمان ہر دل سوختہ

جان و دل زر بہر او قربان کنم

....

قراری ندارد دل و جان ما

کناری ندارد بیابان ما

....

یک لحظ زکوئی دوست دوری

در مذہب عاشقاں حرام است

مولانا روم کی غزلیں ہوں کہ مثنوی ان کے یہاں عشقیہ کیفیات اور دلی جذبات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔اس ضمن میں عظیم الحق جنیدی لکھتے ہیں:

> ''مثنوی ہر تنقید سے بالاتر ایک صحیفہ آگہی ہے جو حق شناسی کے لیے شمع ہدایت کا کام کرتی ہے۔آپ کی غزلیات کا مجموعہ حضرت شمس تبریز کے نام سے شائع شدہ ہے۔یہاں بھی وہ وارفتگی عشق اور جوش موجود ہے جو اہل دل کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔''(14)

سعدی شیرازی (متوفی 1291ء)

سعدی شیرازی کی جوشہرت ومقبولت رہی ہے شاید بہت کم قلم کاروں کوایسی کمال بلندی حاصل ہوتی ہے۔فارسی نظم و نثر کوکمال بزرگی اور فصاحت کے کامل درجۂ پر پہنچانے میں سعدی علیہ رحمہ نے اہم رول ادا کیا ہے۔آپ کی مقبولیت نہ صرف ایران تک محدود رہی بلکہ جہاں جہاں فارسی زبان کا چلن رہاان علاقوں میں ان کی شہرت کومعراج حاصل رہی۔ایک زمانے تک ہندوستان میں گلستان وبوستان ہر گھر میں پڑھی اور پڑھائی جاتی تھی اورلوگ ان کے طرز ادا کے دیوانے تھے۔ان کے کلام میں علم، اخلاق، فلسفہ اورتصوف وعرفان کے نقش ہائے رنگ رنگ ملتے ہیں۔صوفیانہ اشعار ملاحظہ ہوں:

رہِ عقل جز پیچ بر پیچ نیست
بر عارفان جز خدا ہیچ نیست

....

تواں گفتن ایں با حقائق شناس
ولی خواہ خودہ گیر مذاہل قیاس

سعدی بلند پایہ نثار اور شاعر تھے فارسی شعر وادب میں ان کا کوئی ہمسر دکھائی نہیں دیتا وہ ایک معلم اخلاق،صوفی منش، پاک باطن وظاہر، عالم باعمل، مصلح قوم تھے۔شاعری کی حیثیت سے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور غزل میں ان کی مقبولیت مسلم تسلیم کی جاتی ہے۔غزل کوصوفیانہ رنگ دینے میں اور اخلاق، علم وحکمت، پندونصائح سے متصف کیا اور عشق حقیقی کے جذبات فارسی شاعری میں داخل کرنے میں اہم رول ادا کیا۔چنانچہ پروفیسر صداقت حیات بوستانِ سعدی کے مقدمہ میں یوں رقم طراز ہیں:

''سعدی کی اخلاقیات میں فلسفہ بھی ہے اور نکتہ سنجی بھی، کام و دہن کی لذتیں بھی اور لطفِ سخن کی حلاوتیں بھی ہیں، حکیمانہ نکتہ آفرین کلام الٰہی کی تفسیری لذتیں، عشق محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مدحتی لذتیں سعدی ان سب کے رسیا تھے۔نکتہ طرازی اور زبان کے چٹخارے سے بیان آفرینی میں ایسا روحانی سرور پیدا کرتے ہیں کہ قاری پر وجد طاری ہوجاتا ہے۔''(15)

سعدی شیرازی کی کتابوں میں گلستاں وبوستاں کے علاوہ ان کے چار دیوان شائع ہو چکے ہیں۔سعدی کی اکثر غزلوں

میں تغزل کی چاشنی ملتی ہے جس کی بدولت ان غزلیات کو اکثر صوفیہ کی محفلوں اور سماع میں پڑھی جاتی تھیں۔ سعدی کی غزل میں عشقیہ واردات کے سلسلہ میں ڈاکٹر زیب حیدر نے لکھا ہے کہ

> ''شیخ کی غزل کو جبلی عشق و محبت نے جو اس کی بات بات سے ٹپکتی ہے اور بھی زیادہ چمکا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حسن و عشق وصل و جدائی، یاس و امید، صبر و مجبوری، وعدہ و انتظار اور دیگر لوازمات عشق کی جو کیفیتیں بیان کرتا ہے ان میں بالکل تصنع نہیں پایا جاتا اور یہ ایسی باتیں ہیں جو اس عالم میں ہر شخص پر گزرتی ہیں۔ اسی لیے عشاق کے دل پر اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔''(16)

ان کی شاعری کی خوبی یہی ہے کہ عشق حقیقی کو مجاز کے پردے میں بیان کرتے ہیں۔ اور غزل کی کلاسیکی لفظیات جیسے رند، زلف، رخسار، صبر و رضا لفظیات کو صوفیانہ مفاہیم دینا سعدی کا طرۂ امتیاز نظر آتا ہے۔ اس تناظر میں چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:

ای صبح نسیم گر باز اتفاقی افتدت
آفریں گوئی برآں حضرت کہ مارا بار نیست

....

گر ولم در عشق تو دیوانہ شد عیبش مکن
بدر بی نقصان وزربی عیب و گل بی خار نیست

....

اے کہ گفتی ہیچ مشکل جز فراق یار نیست
گر امید و وصل باشدہم چنیں دشوار نیست

صوفیانہ نظریات و افکار مختلف ادوار میں شاعری کا لازم حصہ رہے ہیں۔ دورِ تیموریہ میں جن اکابر صوفی شعراء کا تذکرہ ملتا ہے ان میں ابن یمین (متوفی 1368)، خواجہ کرمانی (متوفی 1352)، عبید زاکانی (متوفی 1371)، سلمان ساوَجی (متوفی 1376) اور حافظ شیرازی (متوفی 1389) قابل ذکر ہیں۔

حافظ شیرازی (متوفی **1389**):

اس دور میں حافظ شیرازی کو بہت زیادہ شہرت نصیب ہوئی اور بہمنی سلاطین نے بھی اس کی شہرت سے متاثر ہو کر انہیں دکن آنے کی دعوت دی۔ بہر حال حافظ نے صوفیانہ شاعری کی جلوہ سامانی کی ہے۔ان کی عظمت و شہرت کے سلسلہ میں صاحب مآثر عجم رقم طراز ہیں:

> ''حافظ کو ان کی زندگی میں ہی عالمگیر شہرت حاصل ہو گئی تھی۔صرف شاہان مظفریہ ہی ان کی دلداری نہ کرتے تھے بلکہ ایران سے باہر کے سلاطین سلطان احمد شاہ بغداد، سلطان محمود شاہ بہمن دکن، سلطان غیاث الدین (بنگلہ) نے بھی بارہا ان کو بلایا اور دربار میں رکھنے کی خواہش ظاہر کی۔''(17)

حافظ کی غزلیں ایک خاص طرز کی نمائندگی کرتی ہیں۔ان کا کلام حسن بیان، لطافت ادا، اور شائستگی کے باعث قاری کے دل پر اثر آفرینی پیدا کرتے ہیں۔ان کا کلام فنی تقاضوں کے ساتھ ساتھ موضوعاتی سطح پر بھی متصوفانہ عناصر کی آئینہ داری کا حامل نظر آتا ہے:

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقی نامہ ایست معرفت کردگار

....

اعتماد نیست بر دور جہاں
بلکہ بر گردوں گردان نیست ہم

....

پروانہ و شمع و بلبل ھمہ جمع اند
اے دوست بیا رحم بہ تنہائی ماکن

ملا نورالدین جامی (متوفی **1492**ء):

خراسان کے رہنے والے جامی نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے کسی مستشرق نے لکھا ہے کہ ان کی لیاقت کا کوئی دوسرا فارس میں پیدا نہیں ہوا۔اس لیے کہ ان کی ذات میں شاعری، علم و فضل اور تصوف بیک وقت جمع تھے:

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کین دولت از گفتار خیزد

....

طرفِ باغ و لب جو لبِ جام است اینجا
ساقیا خیز کہ پرہیز حرام است اینجا

....

خوباں ہزار و از ہمہ مقصود من یکے است
صد پارہ گر کنند بہ تیغم سخن یکے است

....

فارسی میں صوفی شعراء اور ان کے کارنامے اس بات کے شاہد ہیں کہ صوفیانہ اقدار کی ترویج و اشاعت میں ان شاعروں کی حیثیت مسلم ہے صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی ان کا کلام قاری کے قلوب کو روشن ومنور کرتا ہے۔ فارسی کے یہ چند گوہر آبدار ہیں جن کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے ویسے تو ہر دور میں ہزاروں شعراء نے صوفیانہ عناصر کے ذریعے اپنی شعری کائنات بنائی ہے۔ ان ادوار میں مختلف شعراء کا رخ روشن تصوف وعرفان کی جانب تھا۔ ان کا کلام اور نغمات نے عقل و دل کی فضاؤں کو پوری طرح مسخر کرلیا۔ ایسے بلند پایہ شعراء میں ابوالخیر، عطار، مولانا روم، شیخ سعدی، حافظ شیرازی، جامی وغیرہ شامل ہیں جن کی شہرت دنیا کے بیشتر ممالک تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی ان کی شخصیت اور کلام کی عظمت و رفعت قائم رہی اور یہاں کے شاعروں نے ان کی اتباع میں شہرت دوام پائی۔

ہندوستان میں تصوف وسلوک کی ابتداء چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کی دین ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ فریدالدین گنج شکر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نصیرالدین چراغ دہلوی، حضرت بندہ نواز ؒ بلند پرواز وغیرہ نے ہندوستان میں تصوف کے پودے کو پروان چڑھایا۔ ہند کے اولین صوفی شعراء میں حضرت امیر خسروؒ کا نام نامی لیا جاتا ہے۔ جنہوں نے فارسی اور اردو زبانوں میں صوفیانہ افکار کی تبلیغ وتلقین کی۔ امیر خسروؒ حضرت نظام الدین اولیا کے خاص خلیفہ تھے جن صحبت نے ان سے اس طرح کے اشعار کہلوائے جن میں عشق حقیقی کی جلوہ نمائی ہوتی تھی۔ خسرو نظام الدین اولیاء کے ساتھ ساتھ اس عہد کے دیگر بزرگوں سے فیض عشق حاصل کیا۔ جس کا ذکر کرتے ہوئے وزیر آغا لکھتے ہیں:

''خسرو کے زمانے میں صوفیانہ تصورات تیزی سے پھیلنے لگے تھے............

اس کے علاوہ مسلمان صوفیہ کے افکار بھی ہندوستانی معاشرے پر گہرے اثرات مرتسم کرنے لگے تھے۔خسرو کے زمانے میں ایک طرف سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء زندہ تھے اور دوسری طرف یہ زمانہ بوعلی شاہ قلندر نیز خواجہ بہاالدین ذکریا کے بیٹے خواجہ صدرالدین کا بھی تھا اور خسرو کو ان سب صوفیہ سے کسبِ فیض کے مواقع بار بار ملتے رہے۔''(18)

ہندوستان میں فارسی شاعری کو پروان چڑھانے میں امیر خسرو (متوفی 1325)، امیر حسن دہلوی فیضی(متوفی 1559)،عرفی(متوفی 1591ء)،ابوالفضل(متوفی 1602)،نظیری(متوفی 1662)،ظہوری(متوفی)،قدسی،عالی(متوفی1709)،،بیدل(متوفی 1721)،غالب(متوفی1869ء)،امام احمد رضا(متوفی 1921)،اوراقبال(متوفی1938ء)وغیرہ نے اہم رول ادا کیا ہے۔ان شاعروں کے یہاں صوفیانہ افکار و اقدار سے پُرکلام ملتا ہے جن کی پذیرائی اہل ایران بھی کرتے ہیں۔ہندوستان میں فارسی شاعری کا آخری شاعر علامہ اقبال ہیں جن کی شہرت عالمگیر حیثیت کی حامل ہے۔

فارسی شاعری کی روایت جب ہندوستان پہنچی تو یہاں کے شاعروں نے فارسی کے ساتھ ساتھ یہاں کی مقامی زبانوں میں بھی طبع آزمائی کی جس کے بارے میں مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ اردو زبان کے ابتدائی نمونے آٹھویں صدی تا گیارہویں صدی کے درمیان اردو کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں۔حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر(متوفی 1272ء)،شیخ حمیدالدین ناگوری(متوفی 1274ء)،،شیخ شرف الدین بوعلی قلندر(متوفی1323ء)،امیر خسرو(متوفی 1325ء)،شیخ برہان الدین غریب(متوفی 1337ء)،شیخ سراج الدین عثمان(متوفی 1356ء)،اورشیخ شرف الدین یحیی منیری(متوفی 1370ء)،شیخ عبدالقدوس گنگوہی(متوفی 1538)وغیرہ بزرگوں کے تعلق کوئی بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی مگر مولوی عبدالحق نے ان کے کلام کے نمونے دئے ہیں جن کے مطالعہ سے صوفیانہ عناصر کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔اس سلسلہ میں چند اشعار''اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیہ کرام کا کام'' سے نقل کئے جاتے ہیں:

تن دھونے سے دل جو ہوتا پوک
پیش رو اصفیا کے ہوتے غوک

ریش سلبت سے گر بڑے ہوتے
بو کڑواں سے نہ کوئی بڑے ہوتے
عشق کا رموز نیارا ہے
جز مدد پیر کے نہ چارا ہے

(خواجہ فرید گنج شکر)۔(19)

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کو بھور کدھی نہ ہوئے

(شیخ بوعلی قلندر)۔(20)

کالا ہنسا نہ ملا بسے سمندر تیر
پنکھ پسارے یکہ ہرے نرمل کرے سریر

(شرف الدین یحییٰ منیر)۔(21)

جدھر دیکھوں ہے سکھی دیکھوں ہور نکوئے
دیکھا بوجھ بچاریں سبھی آپیں سوئے
صدق رہبر صبر توشہ دشت منزل دل رفیق
ست نگری دھرم راجا جوگ مارگ

(شیخ عبدالقدوس گنگوہی9(22)

اس دور میں امیر خسرو پہلے ایسے شاعر ہیں جن کلام اُردو الفاظ سے متصف ہے۔ وہ صوفیانہ شان وشوکت کے بزرگ تھے۔ جن کا عرفانی کلام صوفیانہ افکار وخیالات اورصوفیانہ زندگی کی تفہیم کا بہترین ذریعہ کہلاتا ہے۔ قاضی عبدالرحمن ہاشمی نے کسی بزرگ کا قول درج کرتے ہیں لکھتے ہیں:

''امیر خسرو تمام فضل وکمال، فصاحتِ فن و بلاغت کے ساتھ ساتھ ایک مستقیم الحال صوفی بھی تھے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ صوم وصلوٰۃ اور قرآن خوانی میں گذرا، شیخ نظام الدین اولیاء کے خاص مریدوں میں تھے۔ میں نے اتنا

عقیدت مند مرید کوئی اور نہیں دیکھا صاحب سماع اور صاحب حال و وجد

تھے۔''(23)

چنانچہ حضرت امیر خسرو لکھتے ہیں:

گوری سوے سیج پہ اور مکھ پہ ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانج بھئی چوندیس

....

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف وروز وصلت چوعمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

(24)

شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شیخ سراج الدین عثمان وغیرہ صوفیہء کرام کے کلام کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا نہیں جاسکتا کہ یہ انہیں کا کلام ہے۔مگر ان بزرگوں نے دین متین کی تبلیغ کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کردی تھی۔مغلیہ عہد میں بھی کئی صوفی شعراء کے تذکرے کئے جاتے ہیں جنہوں نے فارسی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبان میں اپنی یادگاریں چھوڑیں ہیں۔سیر العارفین اور مثنوی مہر و ماہ کے مصنف شیخ جمالی ہیں جن کے بارے محققین کا خیال ہے کہ موصوف نے اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔اس ضمن میں دکن کی محققہ پروفیسر سیدہ جعفر کا خیال ہے کہ:

''مولانا جمالی نے فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی شعر گوئی کی ہے۔ان کی زبان فارسی امیز ہے لیکن اُردو زبان کے نقوش صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔شعر ملاحظہ ہو۔

خوار م شدم زار شدم لُٹ گیا
در رہِ عشق تو کمر ٹٹّا ہے

(25)

ہندوستان میں مابعد امیر خسرو ہندوستان کے شاعروں نے، دکنی گجری، ہندی، پنجابی اور برج وغیرہ میں صوفیانہ

خیالات کا اظہار کیا ہے۔جس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''اُردو شاعری کی پہلی روایت خالص ہندوی اصناف و اوزان پر قائم ہوتی ہے۔اور ہندو تصوف کے اسی رنگ کو قبول کرتی ہے۔جو سارے برعظیم میں ناتھ پنتھیوں، بھگتی کال اور نرگن وار کی شکل میں رائج ہے۔خواجہ مسعود سعد سلمان، امیر خسرو، بابا فرید، بوعلی قلندر پانی پاتی، شرف الدین یحییٰ منیری، کبیر، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شاہ باجن، قاضی محمود دریائی، علی جیو گا دھنی، گرو نانک، میرانجی شمس العشاق، برہان الدین جانم وغیرہ شمال سے لے کر جنوب تک مشرق سے مغرب تک اس روایت کے پیرو ہیں۔(26)

شیخ بہاء الدین باجن (متوفی 1506ء) کا برہان پور کے صوفیہ میں شمار ہوتا ہے۔باجن نے صوفیانہ اقوال کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔پروفیسر اے ایم شعلہ لکھتے ہیں:

''خزانۂ رحمت میں باجن اور ان کے خاندان کے متعلق معلومات ملتی ہیں۔ اس میں جا بجا تصوف کے نکات نظم کئے گئے ہیں۔جو مثنوی اور دوہوں کی شکل میں ہیں۔''(27)

نمونۂ کلام:

یوں باجن باجے رے اسرار من چھا جے
سنڈل من میں دھمکے
رباب رنگ میں جھمکے
صوفی ان پر ٹھمکے
یوں باجن باجے
(28)

گجری زبان کے صوفی شعراء جن کو اہل گجرات نے ان کے کلام کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنایا تھا۔جن میں شیخ وجیہ الدین احمد (متوفی 1585ء)، قاضی محمود دریائی (متوفی 920ھ)، خوب محمد چشتی (متوفی 1614ء) وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے

جنہوں نے اپنی ابتدائی دور میں اردو شاعری کو تصوف کے رنگ میں رنگنے کی بھرپور کوشش کی ہیں۔

محمود دریائی گجرات کے صوفی باصفہ ہیں جن کا فیض آج بھی جاری ہے۔ قاضی صاحب گجرات کے صوفی کے علاوہ شاعر بھی تھے ان کے شعری پیکر سے عشق حقیقی کے جلوے نمایاں ہوئے ہیں:

چاؤں چلندھا پیر میں پایا
اُن محمود کو میت ملایا
محمود کیری بنتی صاحب اتنی مانیں
نبی محمد کی دوستی راکھیں مکھ کا پائیں

۔(29)

شیخ خوب محمد چشتی گجرات کے اناہلِ عرفان اور صاحب سخن میں شمار کئے جاتے ہیں سے ہیں جن کا نام آج بھی عزت واحترام سے لیا جاتا ہے۔ آپ کی اُردو مثنوی ''خوب ترنگ'' مشہور تصنیف ہے۔ جس میں تصوف واخلاق کے نکات بیان کئے گئے ہیں۔ مولوی عبدالحق خوب ترنگ کے سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:

''ان کی سب سے مشہور اور مقبول کتاب ''خوب ترنگ'' ہے جس کا سنہ تصنیف انھوں نے خود اسی تصنیف میں بتادیا ہے ''چودہ گھاٹ اوس برس ہزار'' یعنے نو سو چھیاسی ۹۸۶ ہجری۔ خوب ترنگ خالص تصوف کی کتاب ہے۔۔'' (30)

شعر ملاحظہ فرمائیں:

کہے وجود صفت توں جب
گھر کی شان سوبوجھے تب
حق کی ذات کہے کیوں تب
عدم وجود نھووے کب

(31)

خوب محمد چشتی کے علاوہ، شاہ علی محمد جیوگام دھنی،، شیخ محمد مخدوم، شیخ محمد شیخ فاضل گجراتی، شاہ گلشن، شاہ علی رضا گجراتی

اور قاضی نظام الدین وغیرہ ایسے شعراء ہیں جن کا شمار صوفیانہ شاعر کی حیثیت سے کیا جاتا ہے اور ان کا کلام رنگِ تصوف و عرفان سے معمور ہے۔

مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ دہلی سے صوفیہ کرام جس علاقے میں پہنچے وہ مقامی زبان میں علم وعرفان، رشدوہدایت کے جلوے بکھیرے اور شعری زبان میں بھی صوفیانہ شاعری کے نمونے چھوڑے۔جب دہلی کی زبان گجرات پہنچی تو ''گجری'' کہلائی اور دکن میں دکنی کے نام سے موسوم ہوئی۔صوفیانہ شاعری کی روایت گجرات کے ساتھ ساتھ دکن پہنچی تو گویا ایک دبستان دکنی کا وجود عمل میں آیا۔غرض دکنی شعراء نے بھی طریق تصوف کو اپنایا اور دکن میں رنگِ تصوف وعرفان سے اپنے کلام کو زینت بخشی۔اُردو چونکہ دکنی ہی کی ارتقائی صورت ہے اردو کی نشوونما میں دکنی زبان وادب کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔سلیمان اطہر جاوید رقم طراز ہیں:

''اُردو شاعری کی شروعات ہی دکن میں نہیں ہوئیں بلکہ اُردو شاعری کو عروج ،اقبال اور اعتبار بھی دکن میں ملا یہ زمانہ یوں اہمیت رکھتا ہے کہ اہل اللہ اور صوفیہ کرام نے اپنے عقائد کی تبلیغ واشاعت کے لئے فارسی کے بجائے دکنی کو وسیلہ اظہار بنایا۔''(32)

دکنی زبان وادب کی ترقی کے سلسلے میں بہمنی، عادل شاہی، قطب شاہی اور آصف جاہی ادوار اہم مانے جاتے ہیں۔ان ادوار میں دکنی زبان وادب اپنے عروج وارتقاء کے ساتھ ساتھ زوال پذیر ہوکر اردو زبان بن گئی اور دکنی میں میں شعری مثالیں خال خال ملنی لگیں۔بہر حال صوفیانہ افکار اور روایت کو آگے بڑھانے میں دکنی کی شاعری نے بھی اہم حصہ ادا کیا ہے۔

بہمنی سلطنت نے گلبرگہ اور بیدر میں 1347ء تا 1429ء، اور 1429ء تا 1525ء، حکومت کی۔اس عہد کے اہم شعراء میں بندہ نوازؒ، اکبر حسینی، صدرالدین، نظامی بیدری، ملا داؤدی، مشتاق، لطفی، محمود، فیروز اور اشرف اور میرانجی شمس العشاق وغیرہ اہمیت کے حامل رہے ہیں جنہوں نے دکنی کے ابتدائی دور میں مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہوئے عشق حقیقی اور تصوف کو رواج دیا۔بہمنی دور میں بیشتر شعراء صوفیانہ مشرب کے حامل نظر آتے ہیں:

میں عاشق اس پیو کا جنے مجھے جیو دیا ہے
او پیو میرے جیو کا سرقالیا ہے

....

اور معشوق بے مثال ہے نور نبی پایا
نور نبی رسول کا اومیرے جیو میں بھایا
آپ کو ں اپنے دیکھنے کسی آرسی لایا

....

کھڑے کھڑے پیو جیو میں آپیں آپ دکھاوے
اسی میٹھی معشوق کوں کوئی کیوں دیکھے پاوے
جنھ دیکے آرسی کوں اسے اور نہ بہاوے

(بندہ نواز)۔ (33)۔

بے پیر جھاڑ بوئے دارو جولیا رہا تو
ہر گزنہ کھائے اس کوں کرکھائے تو دو اور
بے پیر کے جو ہیں گے دارد جو کھاپیا کر
بے شک جیا تو جانواس کو ہوا دو کافر

(سید اکبر حسینی)(34)

بول تو گنج خفی کا حال
وحدت کی اب سن یو خیال
وحدت کو تو یوکر جان
جان پیکا آیا گیان

(صدرالدین)۔(35)

شریعت کن بوجھے پورا طریقت کچ کرے
حقیقت وہ نیچا دیکھے معرفت سوں تھرے
سوتی سو کرے کرے سو دیکھے دیکھے تو کچ بھوک
ست کر کاکر یا ہوئے پورا نہیں تو دونا روک

(میراں جی شمس العشاق)۔(36)

بہمنی دور میں فیروز شاہ بہمنی، عبداللہ حسینی، شیخ آذری، نظامی بیدری، مشتاق، لطفی وغیرہ شعراء اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ اس دور میں شعروادب تحریری شکل میں آچکے تھے۔ زیادتر تصوف کا رواج عام تھا نظم کے علاوہ نثری رسائل میں صوفیانہ مسائل قلم بند ہورہے تھے۔ اس دور میں اصناف کا تنوع بھی ملتا ہے۔ مثنوی، غزل، رباعی، قصیدہ وغیرہ میں بھی شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ بہرحال دکن کا یہ پہلا دور دکنی شعروادب میں تصوف کی روایت کو ارتقائی مراحل تک پہنچانے میں اہم رول ادا کیا۔ اس ضمن میں بندہ نواز اور ان کے اصحاب وخانوادہ کے بزرگوں نے دکنی نظم ونثر کے ذریعے سے چشتیہ سلسلہ کو دکن کے گوشے گوشے میں پہنچایا۔

دورِ عادل شاہی میں کئی ایک ممتاز اور سربرآوردہ صوفی شعراء جیسے برہان الدین جانم، امین الدین اعلی، شہباز حسینی قادری بیجاپوری، محمد داول، سید میراں میاں ہاشمی، شیخ محمود الحق خوش دہاں، اشرف بیابانی، عبدل، مقیمی، عاجز، ملک خوشنود، حسن شوقی، نصرتی، نیز خواجہ محمد دیدار فانی، مرزا محمد مقیم، علی عادل شاہ ثانی وغیرہ جنہوں نے اپنی منظوم تصانیف میں تصوف کی روایت کو آگے بڑھایا ہے:

کوئی کہیں سب عشق تمام
عشق کے آنکھیں کیا ہے فہام
عشق لیا ہے سب پھر باس
عشق تھے سگلا بھوک بلاس
تجھ میں داخل اچھے یوں
وہ تجھ بن خارج دستا کیوں
نور کوں روح کر دیتا نانوں
روح ہوتن میں پکڑتا تھا نوں
تجھ میں رکھیا یوں مل جائے
جوں پانی میں پاؤ سمائے

(برہان الدین جانم)۔(37)

شہباز اچہ خد کھوئے کدھر دو جہاں دل دھوئے کر

دل جہاں اللہ ایک ہوئے کر، تب پایگا دیدار توں

(شہباز حسینی بیجاپوری)۔(38)

اللہ واحد سرجن ہار

سب جگ عالم جسنے بار

ظاہر باطن ایسا روپ

ذات منزہ سہج سروپ

داہم قایم آپس آپ

جو ناپنگڑے اور ماں باپ

(شیخ محمد داول)۔(39)

اللہ واحد مطلق داتا

قدم قیوم ایں سات صفاتا

جنے علیم قدیم بصیرا

کلیم سمیع مرید خبیرا

جنے علیم قدرت کے زورا

احمد میم میں نور ظہورا

علم سوں اس مانہ پچھا نیا

آپ عاشق وہ معشوق آپنا

(شیخ محمودالحق خوش)۔(40)

نفس کا دوڑنا ہی اس ٹھار

تو تو آہے نفس بچار

نفس کو لیا و تو دم کی جاگا

لا نبی ذکر نہیں تو جاوے بھاگا

(امین الدین علی اعلی)(41)

عادل شاہی دور میں چونکہ صوفیہ کرام بیجاپور کے چپہ چپہ پر حق گوئی اور علم وعرفان کو شمع روشن کئے ہوئے تھے۔لہذا اس دور کے شعراء، ادباء، علماء اور بادشاہ وعوام بھی ان کے حلقہ ارادت میں داخل تھے۔چنانچہ اس سلسلہ میں دکنی کی صوفیانہ شاعری پر سلیمان اطہر جاوید یوں گویا ہیں:

''عادل شاہی عہد میں اور کئی ممتاز اور سر برآوردہ شعراء گزرے ہیں۔اشرف بیابانی جن کی قابلِ ذکر تصنیف ''نوسر ہار'' ہے۔خود ابراہیم عادل شاہ (کتاب نورس)، عبدل (ابراہیم نامہ) مقیمی (چندر بدن و مہ یار) عاجز (لیلی مجنوں، یوسف زلیخا) ملک خوشنود (جنت سنگار) حسن شوقی (فتح نامہ نظام شاہ، میزبانی نامہ) نصرتی (گلشن عشق، علی نامہ) نیز خواجہ محمد دبدار فانی، مرزا محمد مقیم علی، علی عادل شاہ ثانی، وغیرہ۔شاعرانہ تصوف سے کام کس نے نہیں لیا۔ان شعراء کے ہاں بھی ایسے اشعار مل جاتے ہیں۔۔۔۔سچ پوچھئے تو ان شاعروں نے بس شاعرانہ تصوف سے کام لیا ہے۔عشق مجازی کی دنیا ہی ان کی دنیا رہی۔چنانچہ حسن وعشق کے موضوعات کی حامل ان کی مثنویاں اور غزلیں اپنی مثال آپ ہیں۔(42)

عادل شاہی سلطنت کے ساتھ ساتھ قطب شاہی سلطنت بھی قائم ہوئی۔اس سلطنت میں بھی صوفیہ کے معتقد تھے چنانچہ قلی قطب شاہ، ملا وجہی، عبداللہ قطب شاہ غواصی، میرانجی خدانما وغیرہ نے بھی صوفیانہ خیالات بھی اپنے شاعری کے ذریعے پیش کئے۔اس ضمن میں چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:

قطب دل کے صحیفے پر اول تر الکھیا صورت
کیا منج پر کرم آخر دیا سوں دو اول نقاش
جہاں تو واں ہوں میں پیارے منج کیا کام ہے کس سوں
نہ بت خانہ کا منج پروانہ مسجد کا خبر منج کوں

جنت کوں ہو ردوزخوں سو مسجد بت خانہ کیا
کسے نا جانوں میں معلوم نیں کوئی تج بغیر منجکوں
(قلی قطب شاہ)

نکل گنج مخفی سوں خلوت کے بھار
کیا جلوہ گر کثرتِ بے شمار
(وجہی)

ہر طاق یاں خوش طرح کا دستاد ریچار فرح کا
عاجز ہو اس کی شرح کا حیران سنسارا ہوا
نہ کچھ عشق کی مستی تھی منج یاد
سمایاں یونچ تھا یا خواب دیکھا
(عبداللہ قطب شاہ)

تو عارف ہے تو سرکش نفس کوں اپنے کنے میں لیا
کہ پھرنا نفس کے کئے میں خرابی کی نشانی ہے
ہمن عاشق دوانیاں کوں چھبیلے کسوتاں کیا کام
ہمن دبلے فقروں کوں دنیا ہو ردولتاں کیا کام
غواص تو حق باج کسے منگ نکو
گرہے توں موحد تو کسوں سنگ نکو
(غواصی)

سب نیست کرا پس کو نت ہست روہ توں میراں
آپ مست کرتوں پیو سوں نت ہست رہ توں میراں
ہے یوں بشارت انوار ہے عاشقوں کا گل بار
معشوق پنے پہ بلہار نت ہست رہ توں میراں

(میرانجی حسن خدانما)

قطب شاہی دور کے دیگر شاعروں میں حضرت یوسف راجو قتال، ابن نشاطی طبعی، فتاحی، سید بلاقی، عبداللطیف، معظم، قدرتی، غواصی، اولیاء، فائز اور ضعیفی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں جنہوں نے حسن وعشق کے عنوانات کے ساتھ ساتھ اپنے کلام کو صوفیانہ افکار ونظریات سے بھی مزین کیا ہے۔

شمالی ہند، بالخصوص دہلی شعروادب کا محوروِمرکز رہا ہے۔ دکنی حکومتوں کے خاتمہ کے بعد ولی کی دہلی آمد اور ان کے کلام کی شہرت نے یہاں کے شعراء کو اردو میں شعر کہنے کی تحریک دلوائی۔ اس سے قبل یہاں کے شاعروں نے فارسی میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے لیکن ولی کے تغزل اور شاعری کے مطالعہ سے احساس ہو چلا کہ عام بول چال میں بھی ایسے شعر کہے جاسکتے ہیں جس سے کیا عوام اور کیا خواص لطف اندوزی کا سامان حاصل ہوسکتا ہے۔ اس ابتدائی زمانے میں فائز دہلوی (متوفی 1714ء)، آبرو (متوفی 1733ء) مضمون (متوفی 1734ء)، انجام (عمدۃ الملک امیر خاں، متوفی 1746ء)، مضمون (شیخ شرف الدین، متوفی 1747ء)، ناجی (محمد شاکر متوفی 1747ء)، خان آرزو (سراج الدین علی خاں، متوفی 1756ء)، فغاں (اشرف علی خاں، متوفی 1772ء)، حاتم (ظہور الدین، متوفی 1782ء) اور مظہر (مرزا جان جاناں، متوفی 1780ء)، یک رنگ (غلام مصطفی خاں، متوفی) وغیرہ، نمائندہ شعراء رہے ہیں جنہوں دیار دہلی میں اردو شاعری کا چراغ جلایا آگے چل کر اس کی روشنی سے آنے والے زمانوں میں اردو شاعری کو فروغ واستحکام حاصل ہوا۔ اس دور میں ایہام گوئی اور رعایت لفظی کو غلبہ حاصل رہا۔ لیکن بہت جلد مرزا مظہر اور شاہ حاتم کی کدوکاوش سے ان شعری خرابیوں سے شعراء باہر نکل آئے اور سادگی اور سادہ بیانی کو اپنا شیوہ بنایا۔ ظاہر ہے وہ دور بھی صوفیانہ فکر سے متصف تھا اور اس عہد میں شاعروں کا رجحان تصوف کی طرف رہا ایسے شعراء جن کا مزاج تغزل کی طرف رہا انہوں نے بھی متصوفانہ رنگ کے حامل اشعار کہے ہیں۔ غرض اس عہد کے شعراء کے کلام میں رنگ تصوف کے عناصر بدرجہ اتم محسوس کئے جاسکتے ہیں بقول ڈاکٹر اعجاز حسین:

> ''۔۔۔اس کے علاوہ اس دور کے شاعروں کے یہاں تصوف کا رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے، اس لیے فطرتاً اس دور کے شعراء صوفی تھے۔ پورے ماحول اور عہد کی فضا پر میں تصوف چھایا ہوا تھا۔''(43)

چند شعر ملاحظہ ہوں:

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے

وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

(آبرو)

کل محیطِ عشق کے صدموں سے پائی تھی نجات
کشتیٔ دل بے طرح کچھ آج طوفانی ہوئی

(انجام)

کرے ہے دار بھی کامل کو سر تاج
ہوا منصور سے یہ نکتہ حل آج

(مضمون)

کھول کر بند قبا کو ملکِ دل غارت کیا
کیا حصار قلب دلبر نے کھلے بندوں لیا

(خان آرزو)

حسن اور عشق تیرے فیض قدم کے صدقے
دونوں آباد ہیں ہم گلشن وہم ویرانہ

(حاتم)

آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سے
مینا لگا ہے جب سے کہ مجھ بے نوا کے ہاتھ

(مظہر جانِ جاناں)

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے
دل سے صبر و قرار جاتا ہے

(یک رنگ)

اردو شاعری کا عہد زرین (عہد میر و مرزا) سے شروع ہوتا ہے۔اس عہد (دہلی) میں سودا (متوفی 1781ء)، درد (متوفی 1785ء)، قائم چاند پوری (متوفی 1794ء)، خواجہ میر اثر (متوفی 1794)، میر

سوز (متوفی 1798)، اور میر تقی میرؔ (متوفی 1810ء) وغیرہ نمایاں شعراء رہے ہیں جنہوں نے اردو شاعری کو عروج و اقبال عطا کیا۔ بالخصوص میر کارواں میر تقی میر نے غزل کو اعتبار کی منازل تک پہنچایا۔ اس لیے وہ پوری ۱۸ ویں صدی کا نمائندہ شاعر قرار پاتے ہیں۔ ان کی استاذی کو ہر عہد کے شاعروں نے تسلیم کیا ہے۔ طرز میر نہ صرف ان کے عہد میں معروف رہا بلکہ بعد کے ادوار میں بھی اس طرز کو اپنانے کی سعی کی جاتی رہی۔ میرؔ کے کلام کی سادگی و روانی اور بے ساختگی سے قطع نظر ان کا طرز اہم ہے جو اردو شاعری کی روایت کا اہم حصہ رہا ہے اور اس طرح میر کلاسکی شاعری کا نشانِ امتیاز ہے۔

عہد میرؔ میں اردو شاعری میں الم پسندی، الم ناکی اور دردانگیزی میں رجائی اور متصوفانہ خیالات بھی مترشح ہو رہے تھے جس کے نمائندہ میر، سودا اور درد تھے ان حضرات کے یہاں عشق مجازی، عشق حقیقی کا زینہ بنا ہوا تھا چونکہ اس عہد کے شعری رویوں میں داخلیت پسندی غالب تھی اور اس داخلی اظہار نے ان شعراء سے متصوفانہ کیفیت کا اظہار کروایا ہے۔ اس دور میں ان کے کلام کا بیشتر حصہ عشق کی کیف و مستی سے معمور رہا ہے اور انہوں نے اس تصور کو اپنی شعری حس کے ذریعہ اپنے تخیلات کا حصہ بنایا اور جذباتی سطح پر اس میں حزن و یاس اور رجائیت کو ملا کر ایک وحدت تاثر بنا دیا۔ اس دور سے مثلاً چند صوفیانہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہو تی محبت نہ ہو تا ظہور

....

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

....

جامہ مستی ، عشق اپنا مگر کم گہر تھا
دامن تر کا مرے دریا ہی کا سا پھیر تھا

(میر تقی میر)

عشق نے درد کا دیدہ دل وا کردیا
اب ان کی نظروں میں وہ ہی وہ ہے

....

نظر میرے دل کی پڑی درد کس پر
جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

....

یہ رنگِ شعلہ غم عشق ہم سے روشن ہے
کہ بیقراری کو ہم برقرار رکھتے ہیں

(خواجہ میر درد)

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا
کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا

....

عاشق فنا میں اپنی نابود جانتے ہیں
جی کا زیاں جو ہووے تو سود جانتے ہیں

....

عشق کی بھی منزلت کچھ کم خدائی سے نہیں
ایک سا احوال یاں بھی ہے گدا و شاہ کا

(سودا)

کوئی نہ جانتا تھا اُسے عاشقوں کے بیچ
یہ سوزؔ تیرے درد سے مشہور ہوا

....

جو مرادوں سے گزر جائے سولیوے نام عشق
ایسے دل پر منکشف ہوتا ہے ہاں اسرار شوق

(میر سوز)

عاشق کی زیست ، مثل سمندر، سوزِ عشق
قسمت کا جس کی ہو نا تھا ہوچکا

....

چاہئے ایسا کمال پیدا کریں عشق میں
جس میں ہو اے عندلیب روشن اب نام گل

(ایماں)

عہد میر کی مذکورہ بالا شعر عشق کے جذبات واحساسات کا اظہار کرتے نظر آرہے ہیں۔ان اشعار میں باطنی کیفیات کا فنکارانہ اظہار ہوا ہے۔اس دور کے بیشتر شعراء خالص صوفی نہیں تھے مگر ان کی فکر ونظر اور ماحول میں صوفیانہ رنگ وآہنگ کی فضا بہر حال موجود تھی چنانچہ عشق کی مختلف کیفیات کا اظہار ان کی شاعری کا حصہ بنا رہا۔ان شعراء نے تغزل کے ساتھ ساتھ تصوف کو بھی شامل کیا۔بالخصوص خواجہ میر درد اس پورے عہد کے صوفی شاعر تھے جن کا کلام صوفیانہ جذبات واحساسات کی بھر پور آئینہ داری کرتا ہے۔اس دور میں مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی گئی،لیکن شاعروں کا غالب رجحان غزل کی طرف مائل رہا۔ اس عہد میں جتنے بھی اصناف شعر برتے گئے ان میں تصوف کی چاشنی ضرور محسوس کی جاسکتی ہے۔اسی عہد میں نظیر اکبرآبادی (متوفی 1835ء) کو اہم نظم گو کی حیثیت حاصل رہی جنھوں نے غزلیں اور رباعیاں بھی کہی ہیں لیکن وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر کہلائے،ان کے کلام میں مقامی رنگ وبو کے ساتھ ساتھ متصوفانہ افکار ونظریات بھی محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ان کے کلام سے نظم اور رباعی کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے جن میں صوفیانہ رنگ نظر آتا ہے:

تنہا نہ اسے اپنے دل تنگ میں پہچان
ہر باغ میں، ہر دشت میں،ہر سنگ میں پہچان
بے رنگ میں،بارنگ میں،نیرنگ میں پہچان
نت روم میں اور ہند میں اور زنگ میں پہچان

(نظم)

اس شوخ کو ہم نے جس گھڑی جادیکھا
مکھڑے میں عجب حسن کا نقشہ دیکھا

اک آن دکھائی ہمیں ہنس کر ایسی

جس آن میں کیا کہیں کہ کیا دیکھا

(رباعی)

بعد کے عہد میں اکثر و بیشتر شاعروں نے غزل گوئی کی طرف مائل رہے لیکن ساتھ ساتھ مثنوی، مراثی، اور قصائد بھی کثیر تعداد میں لکھے۔ مگر ان تمام کا رجحان تغزل کے علاوہ تصوف کی طرف بھی مائل رہا۔ دہلی کئی مرتبہ اجڑی اور پھر اس دیار میں رونقیں لوٹ آئیں۔ عہد میر میں دہلی پر نادر شاہ کا حملہ اور اس کی بربادی کے قصے اکثر اس دور کے شعراء کے کلام میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ دلی کے لٹ جانے کے بعد لکھنؤ میں شعر و ادب کی محفلیں آراستہ ہوئیں اور یہاں کے پرسکون اور عیش پرور ماحول میں دہلی سے شعراء کی آمد شروع ہوئی۔ بقول نورالحسن نقوی

''اودھ میں اردو شاعری کا چرچا اسی وقت سے ہونے لگا تھا جب میر ضاحک ،سوز، سودا اور فغاں وغیرہ یہاں پہنچے لیکن دبستان اودھ کی داغ بیل آصف الدولہ کے زمانے میں پڑی۔ جب دہلی کا سکون درہم برہم ہوا تو وہاں کے اہلِ کمال مالا کے موتیوں کی طرح بکھر گئے۔ جسے جہاں قدرداں میسر آیا ادھر چل دیا۔ اس زمانے میں قدر دانی کا سب سے اہم مقام اور عافیت کا سب سے بڑا گہوارہ لکھنؤ تھا۔ یہاں لکھ لٹ نواب آصف الدولہ کی حکومت تھی۔ انہوں نے لکھنؤ میں شاندار عمارتیں تعمیر کیں، خوبصورت باغ لگائے اور اہلِ کمال کو انعام و اکرام سے نوازا لہذا جو بھی دہلی کی سکونت ترک کرنے کا اردہ کرتا اس کی نظر سب سے پہلے لکھنؤ کی طرف اٹھتی تھی۔'' (44)

اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید آگے لکھتے ہیں:

''غرض یہ کہ دیکھتے ہی دیکھتے لکھنؤ میں ایک شاندار محفلِ سخن آراستہ ہوگئی۔ یہاں کے پرسکون ماحول میں سب سے پہلی کوشش یہ کی گئی کہ ہر معاملے میں دہلی سے الگ اپنا راستہ نکالا جائے۔ ایک معاملے میں تو لکھنؤ واقعی دہلی کو پیچھے چھوڑ گیا جس کا اعتراف غالب نے بھی کیا۔ وہ ہے زبان کی

اصلاح اور لفظوں کے انتخاب کا سلیقہ۔اس کوشش میں بہت سے الفاظ و
محاورات ترک ہو گئے اور بہت سی نئی ترکیبیں وضع ہو گئیں۔''(45)

اودھ میں عیش وعشرت اور سرشاری کے ماحول میں تغزل اور مجازی عشق سے پر شاعری ہو رہی تھی۔مگر شعراء کے یہاں تصوف اور مذہبی رجحانات کے حامل اشعار بھی ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔لکھنو میں جرأت (یحییٰ مان قلندر بخش، متوفی 1809ء)، انشاء (انشاء اللہ خاں، متوفی 1817ء)، مصحفی (شیخ غلام ہمدانی، متوفی 1824ء)، ناسخ (شیخ امام بخش، متوفی 1838ء)، آتش (خواجہ حیدر علی، متوفی 1847ء)، وغیرہ نے غزل کو متغزل کر دیا اور دہلی کے متوازی ایک نیا اسلوب اختیار کرتے ہوئے دبستان لکھنو کی بنا ڈالی۔اس دور میں اصلاح زبان کی کوشش بھی ہوئی ناسخ نے زبان و بیان کو اہمیت دی اور اس کو سجانے سنوارنے میں لگے رہے۔ظاہر ہے شعراء کا رجحان ظاہر پرستی پر تھا مگر اس کے باوجود اس دور میں میں باطنی کیفیات سے معمور شاعری بھی ان کے یہاں ہوتی رہی یہ دہلی ہی کا اثر تھا کہ متصوفانہ شاعری ان کے کلام میں شامل رہی بالخصوص آتش اور مصحفی نے صوفیانہ افکار کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔

اس نور تجلی میں اس سو برق کے انداز
سو بار کرے جلوہ تو سو بار نہاں ہو

....

انگارے دہکے ہیں مرے سینے میں اب تک
کس روز بجھا شعلہ، ہوئی سرد کب آتش

(مصحفی)

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور ہی دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

(انشاء)

اک سجدہ نیاز میں ہے فرض عشق ادا
میں مقتدی ہوں اور میرا دل امام ہے

....

دل اپنا آئینے سے صاف عشق پاک رکھتا ہے
تماشا دیکھتا ہے حسن اس میں خود نمائی کا

....

فقیری جس نے کی گویا کہ اس نے بادشاہی کی
جسے ظل ہما کہتے ہیں درویشوں کا کمل ہے

(آتش)

انسان کو کو انسان سے کینہ نہیں اچھا
جس سینہ میں کینہ ہو وہ سینہ نہیں اچھا

....

حسن بھی کیا چیز ہے زاہد ذرا انصاف کر
اپنے بندوں کو خدا دیتا ہے لالچ حور کا

(ناسخ)

اودھ کے رنگین اور عیش پرستانہ ماحول میں شعراء نے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔اس دور میں مثنوی نگاری کو دکن کے بعد لکھنو میں اعتبار حاصل رہا۔جس میں میر حسن (متوفی 1786ء) اور دیا شنکر نسیم (متوفی 1843ء) کا کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ لکھنو صنف مرثیہ میں بڑا سرسبز رہا چنانچہ اس صنف کو انیس (میر ببر علی، متوفی 1874ء) اور دبیر (مرزا اسلامت علی، متوفی 1875ء) نے معراج کمال عطا کیا تھا۔میر حسن، نسیم، انیس، اور دبیر وغیرہ نے مثنوی اور مرثیہ کے ساتھ ساتھ غزل اور رباعی گوئی میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور صوفیانہ اور عرفانی ماحول سے متاثر ہوکر اپنی شاعری میں متصوفانہ خیالات بھی نظم ہیں۔شعر ملاحظہ ہوں:

ہجراں تو ہے پر یہ نہیں معلوم کچھ ہمیں
ہم آپ سے جدا ہیں کہ ہم سے جدا ہے وہ

(میر حسن)

دنیا میں محمد سا شہنشاہ نہیں

کسی راز سے خالق کے وہ آگاہ نہیں
باریک ہے ذکر قرب معراج انیس
خاموش کہ یاں سخن کو بھی راہ نہیں

(انیس)

کیا قیامت احمد نے ضیا پائی ہے
چہرے میں عجب نور کی زیبائی ہے
مصحف پہ کیوں نہ فخر ہو اس صورت کو
قرآں سے پہلے یہ کتاب آئی ہے

(دبیر)

غالب کے دور کو اردو شاعری کا عہد ذرین کہتے ہیں دہلی کے اجڑنے اور بسنے کی کہانی انیسویں صدی کی ربع صدی تک چلتی رہی۔ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں دہلی کی رونقیں لوٹ آئیں۔ بقول نورالحسن نقوی:

''دہلی کے بارے میں ٹھیک ہی کہا جاتا ہے کہ یہ بار بار اجڑی مگر اجڑ کر جب بھی دوبارہ بسی پہلے سے زیادہ پر رونق نظر آئی۔ دہلی پر جب تباہی آئی تھی تو شاعر اور اہلِ کمال ایک ایک کر کے اس کے کوچوں کو جو اوراقِ مصور کی طرح حسین و پر کشش تھے، خیر باد کہہ گئے تھے اور چند گوشہ گیر اور درویش صفت اہل ہنر کے سوا یہاں کوئی نہ رہ گیا تھا۔ کچھ مدت بعد جب حالات سنبھلے تو دہلی میں پھر صاحبان کمال کا جھرمٹ نظر آنے لگا۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر شاعر بھی تھے اور شاعروں کے قدرداں بھی۔ ان کی توجہ سے لال قلعے کی شعری محفلیں پھر سے آراستہ ہو گئیں۔ دہلی کی گلیاں شعر و نغمہ کی صداؤں سے گونج اٹھیں اور یہاں شاعری کے اس عہد کا آغاز ہوا جسے اردو شاعری کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔''(46)

دہلی چونکہ ابتداء ہی سے صوفیہ کا محور و مرکز رہی ہے۔ یہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کی دعاؤں کا نتیجہ ہی ہے کہ

یہاں شعروادب اور سماج ومعاشرہ پر صوفیانہ اثرات کی عکاسی رہی ہے چنانچہ اردو شاعری کے سنہرے دور میں غالب (اسداللہ خاں ،متوفی، 1869ء) کے علاوہ شاہ نصیر(نصیر الدین،متوفی، 1833ء)،ذوق(شیخ محمد ابراہیم،متوفی 1854ء)،مومن(محمد مومن خان،متوفی 1852ء)،ظفر(بہادر شاہ مرزا ابوالظفر ،متوفی1862ء)،شیفتہ(نواب محمد مصطفےٰ خاں،متوفی،1869ء)وغیرہ نے اردو شاعری بالخصوص غزل کے گیسو سنوارے۔اس دور میں غالب، ذوق اور مومن کو اعتبار حاصل رہا مگر دیگر شعراء کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔اس پورے عہد کے باکمال شاعروں اور قلم کاروں کے ذاکر ڈاکٹر صلاح الدین نے تذکرہ ''گلِ رعنا'' کے حوالے سے کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

> ''بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر، مولانا امام بخش صہبائی، علامہ عبداللہ خاں علوی، حکیم مومن خان مومن، مفتی صدرالدین آزردہ، مرزا اسداللہ خاں غالب، نواب ضیا الدین خاں نیر، شاہ نصیر الدین نصیر، شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم آغا جان عیش، حافظ عبدالرحمن خاں احسان اور خدا جانے کتنے سخنوران باکمال کا جمگھٹا تھا، جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا۔''(47)

اس دور میں غالب اور ان کے ہم عصروں کے کلام میں دیگر شعری خصوصیات کے علاوہ مسائل تصوف کا بیان بھی بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔مومن جیسے معاملہ بندی اور عشق مجاز کے شاعر کے یہاں بھی متصوفانہ خیالات کی نمائندگی ملتی ہے۔اس کے علاوہ ذوق نے اپنی شاعری میں شوکت الفاظ اور زبان کی ظاہری زیب وزینت، تغزل کے ساتھ ساتھ متصوفانہ رنگ کے حامل اشعار کہے ہیں۔غالب نے اپنے دانشورانہ اور مجددانہ رنگ و آہنگ میں دیگر شعری خصوصیات کے علاوہ صوفیانہ اور عارفانہ خیالات سے اپنے کلام کو مزین کیا ہے۔بہر حال اس دور میں شاعروں نے متصوفانہ شعری نمونے پیش کر کے امیر خسرو کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔بالخصوص غالب انیسویں صدی کا حاوی شاعر ہے جس کی شعری اتباع عہد جدید میں بھی کی جاتی رہی ہے۔چند شعر پیش کئے جاتے ہیں جس میں مسائل تصوف اور عرفانی رنگ نمایاں ہوتا ہے:

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر

....

پر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی کوئی بھی شے نہیں ہے

....

سب کو مقبول ہے دعویٰ تیری یکتائی کا
روبرو کوئی بت آئینہ سیما نہ ہوا

(غالب)

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

....

مومن ہے اگر چہ اس کا سب پہ ظہور
توحید وجودی کا نہ کرنا مذکور

(مومن)

سب کو دیکھا اس سے اور اس کو نہ دیکھا جوں نگاہ
وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہا ہی رہا

....

نہ ہوتا گر وہ شوخ خود نما سر گرم آرائش
اٹھاتا ہاتھ خورشید فلک آئینہ داری

(ذوق)

وقت نماز ہے ان کا قامت، گاہ خدنگ وگاہ کماں
بن جاتے ہیں اہلِ عبادت گاہ خدنگ و گاہ کماں

(شاہ نصیر)

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا جو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا

جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

(ظفر)

وہ قطرہ ہوں موجہ دریا میں گم ہوا

وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

(شیفتہ)

تصوف اور عارفانہ رنگ کی شاعری دبستان دلی کے شعراء کا وصفِ خاص رہا ہے۔تصوف میں خواجہ میر درد کو سالار کی حیثیت حاصل ہے۔ان سے پہلے بھی اس رنگ کے اشعار مل جاتے ہیں۔درد کے بعد بیشتر شعراء نے اس کو اعتبار بخشا اور اپنی محرومیوں کی تلافی کے لئے اس کے دامن میں پناہ لی۔اس دور کے شاعروں میں میر، غالب، مومن، ذوق، وغیرہ کے یہاں اس رنگ کی شاعری کا عنصر نمایاں ہے۔اس کی اہمیت اس قدر زیادہ ہوئی کہ یہ مثل مشہور ہوگئی ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است''۔تصوف کے ذریعہ شعراء نے وجود حقیقی مظاہر کائنات، وحدت الشہود، وحدت الوجود، صفائی قلب، خلوص و نیت، ہوس، صبر و رضا، وغیرہ جیسے موضوعات پیش کئے ۔اس طرح غزل میں اخلاقیات کی تعلیم عام ہوگئی اور تصوف کے ذریعہ اردو شاعری میں اخلاقیات کے بے شمار مضامین داخل ہوئے۔بہر کیف مندرجہ ذیل اشعار پر تصوف کے گہرے اثرات نمایاں ہیں جس کا محور و مرکز عشق حقیقی ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر تک بھی کلاسیکی شاعری کو اعتبار حاصل رہا۔اس دور میں امیر مینائی (امیر احمد، متوفی، 1900ء)، داغ (نواب مرزا خاں، متوفی، 1905ء)، جلال (سید ضامن علی، متوفی 1909ء)، محسن کاکوروی (محمد محسن، متوفی 1909ء) وغیرہ نے اردو شاعری میں اپنی پہچان بنائی۔امیر، داغ، تسلیم اور جلال کو دبستان رام پور کے نمائندہ شاعر کہا جاتا ہے۔جن کے یہاں دہلی اور لکھنو کی شعری خصوصیات ملتے ہیں مگر آگے چل کر اس علاقے کا اپنا ایک اسلوب تشکیل پایا اور سادگی اور معنی آفرینی جیسی خصوصیات اس دبستان کا حصہ رہی اور زبان و بیان میں رنگینی و رعنائی بھی باقی رہی۔امیر مینائی اور محسن کاکوروی نے نعتیہ شاعری کے ذریعے اپنی شعری کہکشاں سجائی تو داغ، ضلال اور تسلیم نے تغزل کو ذریعے اظہار بنایا۔بہر حال اس عہد میں بھی صوفیانہ و عارفانہ کیفیات کا اظہار بھی ان شعراء کا طرۂ امتیاز رہا:

نہ جہت تیرے لئے ہے نہ کوئی جسم ہے تو

چشم ظاہر کو ہے مشکل نظر آنا تیرا

....

نیرنگ ان کی شانِ تجلّی کے دیکھئے
اتنے ہوئے عیاں کہ نظر سے نہاں رہے

....

عجب مرقعہ ہے باغ دنیا کہ جس کا صانع نہیں ہویدا
ہزار ہا سورتیں ہیں پیدا پتہ نہیں صورت آفریں کا

(امیر)

اس روئے بے مقاب کا جلوہ ہوا نقاب
نکلی ہے رنگ رنگ سے صورت نقاب میں

....

میں ہوں نیازمند اسی بے نیاز کا
یہاں بھی تو ،وہاں بھی تو،زمین تری فلک تیرا

(داغ)

پردے میں رہ کر بزم جہاں میں ہیں جلوہ گر
روپوش بھی ازل سے وہ ہیں خود نما بھی ہیں

....

وہ دل ہم ڈھونڈتے ہیں جس میں تو ہے
وہ آنکھیں جن کو تیری جستجو ہے

(جلال)

اردو شاعری میں ابھی تک جو شعری خدوخال سامنے آئے ہیں اور مختلف شعراء کے یہاں جو فکری تجربات ہوئے وہ کسی خارجی تحریک کا نتیجہ نہ تھے، بلکہ اندرونی ماحول اور اس کے مختلف النوع اثرات کا عمل اور ردِ عمل تھا۔ ۱۹ویں صدی کے نصف آخر سے اس صورتحال میں تبدیلی واقع ہوئی۔ اس سلسلے میں سرسید احمد خان (متوفی 1898ء) کی علی گڑھ تحریک سے اردو

زبان و ادب کو فائدہ حاصل رہا مگر فکر ونظر اور عقائد میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔سماج ومعاشرہ جدید تحریکات و رجحانات اور ملحدانہ ماحول سے متاثر ہورہا ہے اور مذہبی وصوفیانہ فکر کمزور پڑنے لگی۔ایسے میں امام اہلِ سنت مولانا احمد رضا خاں بریلوی(متوفی، 1921ء) نے ان تمام کا جواب دیا۔وہ نہ صرف عالم بے بدل تھے بلکہ صوفی شاعر،اور محقق بھی تھے جن کے قلم سے اردو زبان وادب کو استحکام حاصل رہا۔اعلیٰ حضرت نے نعتیہ شاعری کا ایسا چراغ جلایا جس کی روشنی آج بھی صوفیانہ اور عشق حقیقی کو منور و روشن کئے ہوئے ہے۔اس دور کے دیگر شعراء میں محمد حسین آزاد(متوفی 1910ء)، حالی(متوفی 1914ء)اور شبلی(متوفی 1914ء) وغیرہ نے علی گڑھ تحریک کے تحت ادب کو بامقصد بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔اس تحریک کے ذریعہ اردو نظم نگاری کو بھی فروغ ملا۔اس کے علاوہ اکبرالہ آبادی(متوفی 1921ء)،اسماعیل میرٹھی(متوفی 1921ء)، چکبست(متوفی 1926ء)،اقبال(متوفی 1938ء)،شاد عظیم آبادی(متوفی 1927ء)،ریاض خیرآبادی(سید ریاض احمد،متوفی 1934ء)،اصغر گونڈوی(اصغر حسین،متوفی 1936ء)،عزیز لکھنوی(مرزا محمد ہادی،متوفی 1935ء)، فانی(شوکت علی خاں،متوفی 1941ء)،جلیل مانکپوری(جلیل حسن،متوفی 1946ء)،صفی لکھنوی(سید علی نقوی،متوفی 1950ء)،سیماب اکبرآبادی(سید عاشق حسین،متوفی 1951ء)،اور حسرت موہانی(سید فضل الحسن،متوفی 1951ء)وغیرہ اس قافلۂ شعر وادب میں شامل رہے اور جن کی شاعری میں بھی مذاقِ تصوف بہرحال شامل رہا۔اس عہد کے صوفیانہ فکر کے حامل اشعار ملاحظہ ہوں:

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

....

نفس دعویٰ بے گناہی کا سدا کرتا رہا
گرچہ اترے جی سے دل اکثر ریا کرتا رہا
(حالی)

دین و دنیا کا تفرقہ ہے مہمل
نیت ہی پر موقوف ہے تنقیح عمل
دنیاداری بھی عین دینداری ہے

مرکز ہوکر رضائے عزوجل

(آزاد)

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

....

مٹادو رنگِ وحدت میں خودی کا رنگ اے اکبر
اگر ثابت کیا چاہو تو اپنا معتبر ہونا

(اکبر)

خدا یا اول و آخر بھی تو ہے
خدا یا ظاہر و باطن بھی تو ہے

(اسماعیل میرٹھی)

اک سلسلہ ہوس کا ہے انسان کی زندگی
اس ایک مشت خاک کو غم دوجہاں کے ہیں

....

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

(چکبست)

ذروں کا رقص مستئی صبائے عشق ہے
عالم رواں دواں بہ تقاضائے عشق ہے

....

نہ کوئی نام ہے میرا نہ کوئی صورت ہے
کچھ اس طرح ہمہ تن دید ہوگیا ہوں میں

(اصغر)

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجاب وجود کی
شام فراق صبح تھی میری نمود کی

....

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام بھی

....

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں

(اقبال)

تجلیات وہم ہیں مشاہدات آب وگل
کرشمہ حیات ہے خیال وہ بھی خیال

....

حسن ہے ذات میری،عشق صفت ہے میری
یوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا

(فانی)

تھوڑی سی بصیرت ہو، تھوڑی سی بصارت ہو
ہر شئے میں ریاض اس کا جلوہ نظر آتا ہے

(ریاض)

وجود اس کا ہے واجب عقل و وجداں پہ شاہد ہیں
بجز اتنا سمجھنے کے نہ میں سمجھا نہ تو سمجھا

....

پردے میں رہ کر بزم جہاں میں ہیں جلوہ گر
روپوش بھی ازل سے وہ ہیں خود نما بھی ہیں
(شاد)

گراں سمجھ کے جسے سب نے کہہ دیا کہ نہیں
وہ بار دوش پر میں نے اٹھالیا کہ نہیں

....

اک عالم حیرت ہے کہ فنا ہے نہ بقا ہے
حیرت بھی یہ حیرت ہے کہ کیا جانئے کیا ہے
(سیماب)

عجب ادا سے چمن میں بہار آتی ہے
کلی کلی سے مجھے بوئے یار آتی ہے

....

تاب نظارہ ان آنکھوں سے کہاں
دیکھنے والوں سے پردہ چاہئے
(جلیل)

نقطہ دل میں نہ تھی گنجائش نقش جمال
عشق سے ذرے میں لیکن آفتاب آہی گیا

....

بتوں کا حسن خدا ساز دیکھنے والو
تم آئینہ کو ہم آئینہ گر دیکھتے ہیں
(صفی)

دل بینا بھی کر خدا سے طلب

آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

....

دل کو خیال یار نے مخمور کردیا
ساغر کو رنگ بادہ نے پر نور کردیا

(حسرت)

اسی دور سے شعروادب میں جدت کے اثرات نظر آنے لگے۔1936ء میں ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر انقلابی رجحان نمایاں ہوا۔ اس کارواں میں مجاز لکھنوی (متوفی 1955)، یگانہ (مرزا واجد حسین، متوفی 1956ء)، جگر مرادآبادی (علی سکندر، متوفی 1960ء)، اثر لکھنوی (جعفر علی خان، متوفی 1967ء)، امجد حیدرآبادی (متوفی 1967)، جوش (شبیر حسن خان، متوفی 1982)، حفیظ جالندھری، متوفی 1982ء) وغیرہ نے عصری تقاضوں کے ساتھ ساتھ متصوفانہ خیالات کو بھی اپنی شاعری کے ذریعے مترشح کیا ہے۔ اس دور میں مجاز، فیض، جوش، ن۔م۔راشد، جمیل مظہری، اختر شیرانی، احسان دانش، وامق جونپوری، روش صدیقی، اختر الایمان، مجروح، جذبی، مخدوم، سردار جعفری، وجد، تاباں اور ساحر وغیرہ کے یہاں خالص ترقی پسند خیالات ملتے ہیں۔ضیافت طبع کے خاطر اس دور کے شعراء کے یہاں متصوفانہ اشعار کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

دھواں سا جب نظر آیا سواد منزل کا
نگاہ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا

....

تڑپ کے آبلہ پا اٹھ کھڑے ہوئے آخر
تلاش یار میں جب کوئی کارواں نکلا

(یاس یگانہ)

رنگ و بو کے پردے میں، کون چھوٹ نکلا ہے
چھپ سکا چھپائے سے کیا کہیں شباب ان کا

....

حجاب اندر حجاب جلوہ اندر جلوہ کیا کہئے
بلا میں پھنس گئے عشاق پابند نظر ہوکر

(جگر)

کب سے ہے ابتداء نہیں معلوم
ہے کہاں انتہا نہیں معلوم
فنا کا دور دورہ ہے نہ ہست ہے نہ بود
وجود کہتے ہیں جسے سراب کی نمود

(امجد حیدر آبادی)

دل دیا کسی نے جس کو وہ ہوا صاحب دل
ہاتھ آجاتی ہے کھودینے سے دولت دل کی بات

....

مری آنکھیں اور دیدار آپ کا
یا قیامت آگئی یا خواب ہے

(آسی غازی پوری)

اس عالم تصویر کو دیکھا تو یہ دیکھا
میری ہی نظر محو ہے میری ہی نظر میں

....

جو تیرا خیال پہ چھاسکے مجھے اس بقا کی تلاش ہے
تیرا حسن جس میں سماسکے مجھے اس فنا کی تلاش ہے

(میکش اکبرآبادی)

تیرا جلوہ ہے ہر سو، رونق ہر دو جہاں ہے تو
یہاں تو ہے وہاں تو ہے ادھر تو ہے ادھر تو ہے

(حفیظ جالندھری)

تھوڑی سی بصارت ہو تھوڑی سی بصیرت ہو
ہر شئے میں ریاض اس کا جلوہ نظر آتا ہے

(ریاض خیرآبادی)

ترقی پسند دور کے چند شعراء کے یہاں بھی صوفیانہ خیالات کی نشاندہی ہوسکتی ہے آزادی ہند کے ساتھ جدید ادب فروغ پایا۔ پرانا یا قدیم ادب روایتی یا کلاسیکی ادب کہلایا۔ عہد جدید میں بھی ایسے شعراء کی کمی نہیں ہے جن کی شاعری میں مذہبی حسیت کی ضوفشانیاں محسوس کی جاسکتی ہیں۔

دیکھو میں ایک آرزوئے ناتمام ہوں
پھرتا ہوں شہر شہر تماشہ بنا ہوا

(حمیدالماس)

آج جو آئینہ دیکھا تو ہوا یہ محسوس
جانے یہ کون ہے ایسا تھا؟ یہ میں تو نہیں

(خلیل الرحمن اعظمی)

عکس ایک ٹھہرا ہوا ہے کب سے سطح آب پر
تیز طوفان ہوائیں کب ادھر کو آئیں گی

(شہریار)

ابھی کچھ دیر نہ ڈوب اے مہ تابان فراق
ابھی کچھ خواب بھی جی بھر کے کہاں دیکھے ہیں

(محمود ایاز)

ایک تنکے کی طرح ہیں ہم لوگ
وقت کے بہتے ہوئے دریا میں

(محمد علوی)

آج آئینہ جو دیکھا تو ہوا یہ محسوس
جانے یہ کون؟ میں ایسا تھا؟ یہ میں تو نہیں

(خلیل الرحمن آعظمی)

سبق اب تک بھی ابجد سے نہ آگے بڑھ سکا میرا
وہی نقطہ وہی زیرو زبر کی بات کرتا ہوں

(عطا کلیانوی)

موت وحیات کا ہے فقط رمز اس قدر
نکلی جہاں سے روح رکی پھر وہاں گئی

(قمرالدین انصاری)

سر سبز ی تحصیل بقا بعد فنا ہے
پھیلتا نہیں جب تک نہ ملے خاک میں دانہ

(مختار ہاشمی)

سکوت بت میں جودعویٰ ہے بے دلیل نہیں
کمال نطق انا تنگ ہے زبان کے لئے

(سرورمرزائی)

جوہر چہر ہ شناسی نہیں آئینے میں
اپنی بھولی ہوئی تصویر پے رونا آیا

(شاذ تمکنت)

روز و شب سلسلۂ حادثہ پیمائی ہے
وقت حالات کا خاموش تماشائی ہے

(وجد)

اردو کی صوفیانہ شاعری کے سرسری مطالعہ سے یہ بات مترشح ہوتی ہیکہ، ہر زمانے میں شعراء نے صوفیانہ شاعری کو ترسیل و تبلیغ کا ذریعہ بنایا اور فنی اعتبار سے بھی تمام روایتی پیکروں، تشبیہات، استعارات اور تراکیب وغیرہ کو حسن و خوبی سے پیش کیا۔گل و بلبل زلف و رخسار، ناصح و چارہ گر، کفر و اسلام، دیر و کعبہ، مے و میکدہ وغیرہ جسے لفظیات کو صوفیانہ تناظر میں فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا۔موجودہ دور میں بھی ایسے کئی شعراء ہیں جن کے پاس صوفیانہ جذبات اور مذہبی حسیت کی نمائندگی پائی جاتی ہے جس میں شعری روایت کی جھلکیاں بہ آسانی محسوس کی جاسکتی ہیں۔

غرض اردو کی صوفیانہ اور عارفانہ شاعری کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ متصوفانہ موضوعات، فنی لوازمات ،فصاحت و بلاغت وغیرہ اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ تصوف اردو شاعری کے خمیر میں داخل ہے اس کو اردو شاعری سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

حوالہ جات:

1 عربی ادب کی تاریخ، ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی، ص137

2 نعتیہ شاعری کا عروج و ارتقاء، ڈاکٹر سراج احمد قادری، ص49

3 مدارج نبوہ (جلد دوم) (اردو ترجمہ)، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص1008

4 ماہنامہ حمد و نعت کراچی، شمارہ ضولائی 1990، ص15

5 فنِ شاعری اور حسان الہند، علامہ عبدالستار ہمدانی، ص75

6 ارمغان ایران و ہند، ڈاکٹر زیب حیدر، ص7

7 اذکار (4) کرناٹک اردو اکیڈمی بنگلور۔ص12

8 آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ، بشیر بدرؔ ص۔282

9 ماہنامہ نگار، مدیر: نیاز فتح پوری ص 34

10 تاریخ ادبیات ایران، ڈاکٹر رضا زادہ شریف، ص148

11 ارمغان ایران و ہند۔ڈاکٹر زیب حیدر، ص27

12 کائنات تصوف، محمد اشتیاق عالم، ص440

13 شعر العجم (پنجم)، شبلی نعمانی، ص125

14 آثرِ عجم، عظیم الحق جنیدی، ص199

15 بوستانِ سعدی، غلام عباس ماھُو، ص4

16 ارمغان ایران و ہند۔ڈاکٹر زیب حیدر، ص40

17 آثرِ عجم، عظیم الحق جنیدی، ص212

18 نئے تناظر، وزیر آغا ص109

19 اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیہ کرام کا کام، مولوی عبدالحق، ص7-8

20 ایضاً ایضاً، ص10

21 ایضاً ایضاً، ص12

22 ایضاً ایضاً، ص24

23 قاضی عبدالرحمن ہاشمی میراتِ ہنر ص19

24 اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیہ کرام کا کام، مولوی عبدالحق، ص12

25 تاریخِ ادب اردو 1700ء تک (جلد اوّل) پروفیسر سیدہ جعفر۔پروفیسر گیان چند جین ص 434

26 تاریخ ادب اردو/ حصہ اوّل ڈاکٹر جمیل جالبی ص105

27 شعرائے گجرات پروفیسر اے۔ایم شعلہ ص 39

28 اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیہ کرام کا کام، مولوی عبدالحق، ص23

29 ایضاً ایضاً، ص56

30 ایضاً ایضاً، ص61

31 مقالہ اردو شاعری میں تصوف (ولی سے اقبال تک)، افضل الدین جنیدی۔ص

32 ماہنامہ ''سب رس'' اپریل 2001ء مغنی تبسم 17ص

33 دکن میں اردو نصیر الدین ہاشمی ص53

34 ایضاً ایضاً ص58

35 ایضاً ایضاً ص63

36 ایضاً ایضاً ص70

37 ماہنامہ ''سب رس'' اپریل 2001ء مغنی تبسم ص19

38 ایضاً ایضاً

39 ایضاً ایضاً

40 اُردو شاعری ولی سے پہلے محمد جمال شریف ص194

41 ماہنامہ ''سب رس'' اپریل ۲۰۰۱ء مغنی تبسم ص20

42 ایضاً ایضاً

43 مختصر تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر اعجاز حسین، ص48

44 تاریخ ادب اردو، پروفیسر نور الحسن نقوی، ص106

45 ایضاً ایضاً

46 ایضاً ایضاً

47 اردو غزل، مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی، ص160

☆☆☆

باب سوم

دکنی کے اہم صوفی شعراء

خیال اغلب ہے کہ دکنی زبان کی نشوونما (14) ویں صدی عیسوی میں اس وقت ہوئی جبکہ محمد بن تغلق نے اپنے دارالخلافہ دہلی کو تبدیل کرتے ہوئے دولت آباد بنایا۔ پائے تخت کی اس تبدیلی کے ساتھ دہلی سے عوام وخواص کے مختلف طبقات دکن کی طرف آئے اور یہاں کے ماحول اور لسانی فضا میں گھل مل گئے۔ اردو کے ابتدائی ادب کا جائزہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اردو زبان کی ابتدائی تحریریں خواہ وہ نظم ہو کہ نثر اس کی نوعیت مذہبی تھی۔ اس عرصہ میں یعنی 1350ء تا 1550ء دکن کی مقامی بولی میں کئی مذہبی رسالے لکھے گئے۔ بیشتر رسائل تصوف وعرفان اور معرفت فیضان کا احاطہ کئے ہوئے تھے۔ دکنی زبان کی ابتداء علم وعرفان اور تصوف ہی کے زیر سایہ ہوئی۔ اہل علم وعرفان زیادہ تر فارسی ادب واخلاق سے متاثر تھے۔ لہذا ان اہل

حق کے جذبات و احساسات اور تصورات میں صوفیانہ عناصر کی کارفرمائی شامل رہی۔غرض ابتداء ہی سے اردو زبان کے پیکر خیال میں گویا صوفیانہ و عارفانہ کیفیات کی زیریں لہریں موجزن رہیں۔اردو کی صوفیانہ شاعری کے ضمن میں مجنوں گورکھپوری کا جو خیال ہے وہ دکنی شاعری پر بھی منطبق ہوسکتا ہے۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''اردو شاعری نے فقراء اور مشائخ کے ہاتھوں پرورش پائی اور بالغ ہوکر بادشاہوں اور امیروں کی منظورِ نظر بنی۔خانقاہوں میں اس کا بچپن گزرا اور محلوں میں جوانی........اردو شاعری میں ایک طرف عشق و محبت اور دوسری طرف ترکِ دنیا کی جو اس قدر تحریک و ترغیب ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ اس نے بادشاہوں اور دوستوں کی صحبت میں اپنی عمر گزاری ہے۔ورنہ عوام کی روزانہ عملی زندگی میں نہ عشق و محبت کو اتنا دخل ہے نہ زہد و تقوی کو۔''(1)

علاؤالدین حسن گنگو بہمنی نے 1347ء میں جب بہمنی سلطنت کی بنیاد ڈالی تو یہاں کی مقامی بولی فروغ و ارتقاء کے مراحل و منازل طے کرنے لگی۔اور آگے چل کر ایک زبان کا روپ اختیار کرتے ہوئے، چار صدیوں تک شمالی دکن کے لسانی وتہذیبی ماحول میں نشوونما پاتی رہی۔دکنی زبان جس فضا میں پیدا ہوئی بلاشبہ اس پر ماحول کا اثر اجتماعی طور پر پڑا۔لہٰذا دکنی کئی زبانوں کا آمیزہ ہے جو مختلف بولیوں کے خمیر سے تیار ہوا ہے۔جہاں جہاں یہ زبان پھیلی اس پر مقامی بولیوں کے اثرات پڑنے لگے، آگے چل کر دکنی نے مرہٹی، گجراتی، کنڑی، اور تلگو زبانوں کے بھی اثرات قبول کئے۔مختلف بولیوں کی ملاوٹ قبول کر لینے سے جس نئی زبان کی بنیاد پڑی وہ دکنی کہلائی۔بقول ڈاکٹر محمد جمال شریف:

> دکن کا پہلا خود مختار مسلمان بادشاہ علاؤالدین حسن بہمنی تھا جس نے سنہ 748ھ م 1378ء میں بہمنی خاندان کی بنیاد ڈالی۔بہمنی خاندان 748ھ م 1378ء تا ۹۳۲ھ م 1532ء تقریباً ڈھائی سو سال تک دکن پر حکومت کرتا رہا۔اس کا پہلا پایہ تخت گلبرگہ اور دوسرا بیدر تھا۔اس خاندان کے تقریباً (18) بادشاہ گزرے جنھوں نے نہایت عظمت و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔اکثر بادشاہ عالم، علم دوست اور علم پرور تھے۔علماء و شعراء کی قدر دانی کی وجہ سے ان کے زمانے میں علوم و فنون کو کافی ترقی ہوئی۔اس

لیے بہمنی دور کو دکن کی تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔بہمنی بادشاہوں نے گو فارسی کی کافی سرپرستی کی لیکن ساتھ ہی ساتھ نئی اور ابھرتی ہوئی زبان اردو کی ترویج و ترقی میں بھی بڑا حصہ لیا اور چمن اردو کی ایسی آبیاری کی کہ وہ بہت جلد عوامی زبان سے بڑھ کر درباری اور دفتری زبان قرار پائی اہلِ علم و ادب اور شعراء کی قدردانی کی وجہ سے یہ زبان غیر محسوس طریقے پر پھیلتی اور ترقی کرتی گئی اور اس زبان کے اچھے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے جن کے ادبی کارنامے ادبیات اردو میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔(2)

’’شمالی ہند سے صوفیہ اکرام دکن پہنچ کر یہاں کی بولیوں کی اہمیت وضرورت کو سمجھتے ہوئے ان بولیوں کے ذریعے عوام کے غالب طبقے کو علم وعرفان اور مذہب کا درس دیا۔صوفیہ اکرام چونکہ انسان کے باطن سے سروکار رکھتے ہیں، اور تزکیہ نفس ہی ان کی سرگرمیوں کا مقصود ہوتا ہے۔اس لئے ان کے در پر ہر طرح کے لوگ دستِ سوال بن کر آتے اور اپنی مرادیں برلاتے۔ صوفیہ چونکہ انسانی ہمدردی، خلوص و وفا، اور محبت وغیرہ جیسے جواہر سے متصف ہوتے تھے اور یہی پیغام وہ عوام کو دینا چاہتے تھے۔لہذا حضراتِ صوفیہ مقامی بولیوں میں حق ومعرفت کا درس دیتے رہے اور اس طرح دکن کی یہ مقامی بولیاں آہستہ آہستہ زبان کی شکل اختیار کرنے لگی اور بعد میں اس زبان میں ادب بھی تخلیق ہونے لگا۔دکنی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور ارتقاء کا زمانہ چار صدیوں کو محیط ہے۔اس پورے عہد میں خواجہ بندہ نواز، فیروز شاہ بہمنی ،فخرِ دین نظامی ، فیروز بیدری ،اشرف بیابانی، مشتاق ،لطفی ،شاہ میراں جی شمس العشاق، شاہ برہان الدین جانم، ،خوب محمد چشتی ،قلی قطب شاہ ،وجہی، عبدل، افضل ،غواصی، ابن نشاطی ، ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی ،قاضی محمود بحری وغیرہ شامل ہیں جنہوں نے دکنی زبان اور ادب میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔اس سلسلے میں سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

’’دکنی اردو میں ادب کے ارتقاء کو بخوبی سمجھنے کے لئے ہم اس کو کئی ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور جو تمام تر صوفیانہ ادب پر مشتمل ہے وہ لسانیات کے نقطہ نظر سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔اور اس کا زمانہ بہمنی سلطنت کے خاتمے تک پھیلا ہوا ہے جو شخص ہندوستان کی تھوڑی بہت تاریخ سے بھی آگاہ

ہے اسے معلوم ہوگا کہ 15 ویں صدی کا خاتمہ ہونے سے پہلے ہی بہمنی سلطنت ٹوٹ پھوٹ کے 5 حصوں میں تقسیم ہوگئی۔تخلیق ادب کی نظر سے ان میں بیجاپور اور گولکنڈہ کو بہت اہمیت حاصل ہے......ان دونوں ریاستوں میں ادب اور دوسرے فنوں کی بہت ترقی ہوئی۔ بادشاہوں سے لے کر عام لوگوں تک میں شاعری اور ادب کا ذوق دکھائی دیتا ہے۔اس طرح ہم بیجاپور اور گولکنڈہ میں ترقی کرنے والے اردو ادب کو اس ترقی کا دوسرا دور کہہ سکتے ہیں۔ یہ دونوں ریاستیں جس طرح تقریباً ایک ساتھ قائم ہوئی تھیں اسی طرح ایک ساتھ ہی مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے ہاتھوں سلطنت مغلیہ کا ایک جزو بن گئیں۔ان کے بعد تیسرا دور وہ کہا جاسکتا ہے جس میں مغل دور اقتدار میں اردو ادب کا ایک بڑا سرمایہ جمع ہوگیا۔جوکوئی اس کا مطالعہ کرے گا اسے صرف اردو ادب کے ارتقاء کا اندازہ لگانے ہی میں مدد نہ ملے گی بلکہ اس بات کا احساس ہوگا کہ ایک زبان میں ثقافتی اثرات کے سبب کس طرح تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ یہ بھی دیکھا جاسکے گا کہ زبان کے ابتدائی دور میں جو سادگی وسہولت ہوتی ہے وہ کس طرح دھیرے دھیرے نیست نابود ہوجاتی ہے اور خیال کی پیچیدگیاں اسے کیسے دوسرے اسالیب سے روشناس کرادیتی ہے......اردو کے لئے بھی یہی ہوا۔زبان جب بول چال کی حد سے نکل کر ادب کے میدان میں داخل ہوئی تو اسے گردوپیش کے رائج ادبوں کو بھی پیش نظر رکھنا پڑا۔اس طرح زبان میں تغیر ہوتے ہیں۔ کچھ کے معنی مرادکو واضح کرنے میں ناکام محسوس ہونے لگے ہیں۔ بدلتی ہوئی حالت میں نئے الفاظ ادھر ادھر سے لیئے جاتے ہیں اور بنتے بھی ہیں،اس لئے دکنی اردو اور آج کی اردو میں بڑا فرق دکھائی دیتا ہے''۔(3)

دکنی کے تقریباً ہر شاعر نے کسی نہ کسی طرح سے اپنی شاعری کو صوفیانہ افکار واقدار سے سنوارا ہے۔قدیم دکنی دور میں

یہ خصوصیت شاعری کے ہر دور سے زیادہ رہی ہے۔عہد بہمنی میں ہی صوفیانہ عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔عہد قدیم میں حضرت بندہ نواز بلند پرواز کے یہاں صوفیانہ مسائل کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔اسی عہد میں دیگر شاعر جنھوں نے تصوف کو اپنا شعار بنایا تھا ان میں سید محمد اکبر حسینی، شیخ آزری، نظامی، اشرف بیابانی، مشتاق، لطفی، میراں جی شمس العشاق، اور فیروز بیدری، وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں جنھوں نے حضرت مخدوم بندہ نواز گیسودراز کی پیروی کرتے ہوئے صوفیانہ افکار و نظریات کو شعری جامہ پہنایا:

اخوگر شریعت نعل بندز ین ہے طریقت زیر بند
حق ہے حقیقت بیش بند ٹک معرفت اختیار توں

(بندہ نواز)

نظر عارف کی یوں اچھنا جو تن دیکھے تو من دسنا
مقید پن نفی ہو سب اور مطلق پر رخن دسنا

(سید محمد اکبر حسینی)

بس کر اے شہ صدرالدین راز کوں
دید میں دیدار پا آپس کوں کھول

(شاہ صدرالدین)

شریعت کن بوجھے پورا طریقت کچ کرے
حقیقت وہ نیچا دیکھے معرفت سوں تھرے

(میراں جی شمس العشاق)

اللہ واحد حق سبحان
حق یہ سرجیا بھوئیں اسمان
دونوں جگ کیرا سرور میر
جس کوں چاروں چار وزیر
بوبکر صدیق اک سسرا

عمر　خطاب　ہم　دوسرا
ای　دو　بزرگ　پیر　آزاد
عثمان　علی　دوئی　داماد
دوئی　نور　سی　ان　بل　جانو
حسن　حسین　جن　کا　نانوں
علی　کے　ای　دوئی　فرزند
بی　بی　فاطمہ　کے　دل　بند

(اشرف بیابانی)

محی　الدین　تیرا　توں　میرا　میان
توں　میرے　محی　الدین　کے　درمیان
کہیا　توں　کہ　فیروز　میرا　مرید
بڑی　بخت　میری　جو　تیرا　مرید
مجھے　ناؤں　ھے　قطب　دین　قادری
تخلص　سو　فیروز　ہے　بیدری

(فیروز بیدری)

بہمنی دور کے زوال کے بعد قطب شاہی اور عادل شاہی دور میں بھی صوفیانہ شاعری کی جلوہ گری نظر آتی ہے اگر چہ زیادہ تر شاعروں کا رجحان عشق مجازی کی طرف رہا تا ہم صوفیانہ شاعری سے بھی شعراء نے اپنی فکر اور فن کو عیاں و بیاں کرتے رہے۔ان ادوار میں برہان الدین جانم،غواصی،شیخ داول،میرانجی خدانما،میراں یعقوب،امین الدین علی اعلی،وغیرہ کے علاوہ دکنی حکومتوں کے زوال کے بعد ولی، بحری،سراج،داود،قربی وغیرہ نے بھی صوفیانہ اور عارفانہ شاعری کے کارواں کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا اور آگے چل کر اردو شاعری کو اعتبار حاصل ہونے میں دکنی عہد کی شاعری کو اہمیت کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے:

ہے　رویت　مشاہدہ　ہے　چوں　نہاں

چشم دل حاصل وہ دیکھے عیاں

(برہان الدین جانم)

غواصی اگر توں ہے سچا غواص
لگا عشق اپنے خدا سات خاص

(غواصی)

سب چھوڑ اس دنیا کوں ہیں دیکھ جان ہارے
ہشیار ہو موئے پر افسوس کھان پارے

(شیخ داول)

اے تن رہی خاکے کیرا پانچ عناصر بار
تو تجہ لورے فنا ہونا سیں کاٹ دے اس دار

(میراں جی خدانما)

سہاوے نہ عشاق کوں پارسائی
کہ پیدا کئے ہیں گنہ گار انوں کوں

(میراں یعقوب)

واصل سب کر ہوئے خدا
عاشق خود تھے ہوئے جدا

(امین الدین اعلیٰ)

خدا نما جو ہوا میں تو کچھ نہیں ہے عجب
کہ ہر ذرہ ہے جہاں میں خدا نما اے دوست

(قربی)

جلوہ گر جب سوں دو جمال ہوا
نور خورشید پائمال ہوا

(ولی)

اس عمر میں عشق جیو میں جاگ
یوں گھیر لیا جیوں بھیڑ کو باگ

(بحری)

شراب معرفت پی کر جو کوئی مجذوب ہوتا ہے
درودیوار اس کوں مظہر محبوب ہوتا ہے

(سراج)

اول خودی کے گھر کو اے داؤد توڑسٹ
میخانہ وصال میں تب سدہ بھار چل

(داؤد اورنگ آبادی)

دکنی کے صوفی شعراء کے یہاں مضامین کا تنوع اور جذبات واحساسات کی رنگارنگی ملتی ہے۔ دکنی شعراء نے اپنی شاعری کے ذریعہ دکنی معاشرت رہن سہن طور طریق لباس زیورات اور دکنی تہذیب وتمدن کے بہت سارے عناصر کو پیش کیا ہے۔ ان شعراء نے غزل، مرثیہ، قصیدہ، اور مثنوی، رباعی وغیرہ جیسی اصناف کو اپنے دائرۂ کار میں لایا ہے۔ چنانچہ دکن میں دوسرے اصناف کے مقابلے میں مثنویاں زیادہ تعداد میں لکھی گئی ہیں۔ دکن کی مثنویوں میں موضوع کے اعتبار سے وسعت و جامعیت پائی جاتی ہے۔ دکنی مثنویوں میں مذہبی، صوفیانہ، فلسفیانہ، عاشقانہ، وغیرہ جیسے موضوعات ملتے ہیں۔

دکنی شاعری میں اخلاقی عناصر کے ساتھ ساتھ روحانی وعرفانی خیالات کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ عشق حقیقی کے علاوہ عشق مجازی کی جلوہ ریزیاں دکنی شعراء کا طرۂ امتیاز ہیں۔ اس لحاظ سے جب ہم دکنی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات روز روشن کی طرح سامنے آتی ہے کہ دکنی کے شاعروں نے ایسے ایسے شعری پیکر تراشے ہیں جن کی بنیاد پر آگے چل کر شمالی ہند کے شعراء نے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ ماہر دکنیات عبدلقادر سروری رقمطراز ہیں:

''دکنی ادب کی ترقی کا زمانہ 16ویں صدی اور 17ویں صدی کا زمانہ ہے۔ ۱۷ویں صدی کا اختتام دکن کی علم دوست سلطنتوں بیجاپور اور گولکنڈہ کا بھی اختتام ہے۔ 17ویں صدی کے اواخر میں یہ سلطنتیں دہلی کا جزو بن

گئیں، مغل حکمرانوں فارسی کی روایت میں پلے تھے اس لئے ہندی ریختہ دکنی یا اردو ان کے پاس ادبی اغراض کیلئے قابل اعتنا نہیں تھی۔ اس لئے ان کے زمانے میں دکنی ادب کی ترقی رک گئی۔ اور شاعر اور انشا پرداز شمال اور جنوب کے مختلف حصوں میں منتشر ہو گئے اور اپنے ساتھ اپنے ادبی ذوق کو بھی لیتے گئے۔ اس سے دکنی ادب کی سرحدیں وسیع ہو گئیں۔ اورنگ زیب کے بعد دکن میں کچھ عرصہ تک نراجیت سی رہی لیکن نظام الملک میر قمر الدین خان کے دکن پر تسلط کے بعد اس علاقے کو تہذیبی اور ادبی اعتبار ملا۔ پھر مرکزیت حاصل ہونے لگی۔ دور وسط کی آخری بساط اورنگ آباد میں بچھی جہاں دکن اس کے اطراف و اکناف اور شمال ہند کے بہت سے اچھے اچھے شاعر اکھٹے ہو گئے تھے۔ لیکن اس نئے ماحول میں ادبی روایات نے بھی نیا موڑ پایا اور لسانی صورت حال تبدیل ہو گئی۔ چنانچہ اورنگ آباد کا ادب شمال اور جنوب کی بہترین روایات کا سنگم بن گیا، اس زمانے میں ولی اور سراج جیسے عظیم شاعر ابھرے''۔(4)

سولہویں تا انیسویں صدی کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ دہلی اور دکن کی زبان فارسی تھی۔ لیکن گھروں اور بازاروں میں بولی جانے والی زبان دکنی تھی۔ غرض دکنی زبان بول چال کے ساتھ ساتھ ادبی حیثیت بھی حاصل کر رہی تھی۔ دکنی زبان کی یہ بدنصیبی رہی کہ شمالی ہند کے مورخوں نے اس زبان اور اس کے ادب پر بے اعتنائی برتی، اس کا کھلا ثبوت قلی قطب شاہ جیسا شاعر بھی ان کی نظروں سے چھپا رہا۔ دکنی زبان گویا، ہمارے ماضی کا گراں مایہ ورثہ ہے۔ آج دکنی حیدرآباد کے اطراف و اکناف کے دیہاتوں، تلنگانہ اور رائل سیما کے علاوہ جنوبی کرناٹک کے اضلاع، گلبرگہ، رائچور، بیدر، اور بیجاپور کے دیہاتوں اور قصبوں میں بولی تو جاتی ہے مگر آج اس میں ادب بہت کم تخلیق ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر طیب انصاری اپنے ایک مضمون ''دکنی زبان، قلی سے ولی تک'' میں لکھتے ہیں:

''ولی نے دکنی زبان سے انحراف کیا وہ اردو شاعری کا باوا آدم تو بن گیا لیکن دکنی زبان کو اس سے شدید دھکا لگا۔ داؤد اور سراج نے زبان دکنی چھوڑ، ولی

دہلوی، کی اردو اختیار کیا۔لیکن اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ دکنی زبان معتوب ٹھہری، دکنی زبان آج بھی اہل دکن کے لئے عزیز ہے، آج بھی دکنی شاعری اہل دکن کے دلوں کی دھڑکن ہے۔دکنی زبان آج بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ بڑی سخت جاں ہے"۔(5)

غرض اس طرح بیسویں صدی آتے آتے دکنی زبان صرف بول چال تک محدود رہی۔اس میں شعر و ادب کے تخلیقی امکانات معدوم ہوتے چلے گئے۔اس دور میں شعراء نے اردو زبان میں شعری ایوان سجائے۔اس ایوان شعر میں غزل، مثنوی، مرثیہ،قصیدہ، رباعی اور نظم وغیرہ جیسی اصناف میں طبع آزمائی کی گئی۔اگر چہ دکنی ادوار میں صوفیانہ افکار اور اقدار کی گھن گرج صاف طور پر سنائی دیتی ہے۔تاہم دکنی شاعری کے پیکر میں مجازی اور حقیقت دونوں طرح کے عشقیہ جذبات کی کارفرمائی نظر آتی ہیں۔ذیل میں چند اہم دکنی شعراء کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے جن کی فکر و نظر میں صوفیانہ افکار و اقدار نمایاں طور پر محسوس کئے جا سکتے ہیں۔

حضرت بندہ نواز علیہ الرحمہ:

دکنی زبان و ادب میں حضرت بندہ نوازؒ وہ اولین سخنور رہے ہیں جن کی نظمیہ تخلیقات تا حال اولیت کا درجہ رکھتی ہیں۔حضرت بندہ نوازؒ 1399ء کے آس پاس گلبرگہ تشریف لائے۔اس عہد میں گلبرگہ میں فیروز شاہ بہمنی کی حکومت تھی اور دکنی ایک بولی کے روپ میں مروج تھی۔بندہ نواز بلند پرواز کی آمد سے قبل اس بولی کو مقبولیت کی رفتار میں تیز روی نہیں تھی مگر آپؒ کی آمد اور قیام کے بعد یہ بولی سے اٹھ کر زبان کا روپ اختیار کرنے لگی اور اس کی مقبولیت بھی رفتار پکڑنے لگی۔آپ دکن آنے سے قبل عربی و فارسی جیسی علمی زبانوں میں لکھا کرتے تھے۔دکن آمد کے بعد آپؒ نے دیکھا کہ مقامی بولی ترقی پذیر ہے۔لہذا آپ کی دور اندیشی نے آخر اس بولی میں اپنے مریدوں، عقیدت مندوں اور طالبان حق کی نہ صرف درس و تدریس فرمائی بلکہ کئی رسائل تصنیف و تالیف فرمائے۔واقعہ یہ ہے کہ آپ ایک جید عالم اور صوفی با صفا بزرگ ہیں اور اپنے صوفیانہ خیالات کو مقامی بولی کے ذریعہ ترسیل و ابلاغ کے مراحل تک پہنچایا اور اشاعت اسلام اور دعوتِ حق کا درس کبھی منثور تو کبھی منظوم شکل میں دیا۔

حضرت بندہ نواز کے کلام کا تذکرہ کرتے ہوئے سب سے پہلے اس نتیجہ پر پہنچا ضروری ہوجاتا ہے کہ آپ شاعری میں کیا تخلص فرماتے تھے۔آپ کے تخلص کے سلسلہ میں قدیم ادبیات کی بیاضوں میں یہ درج ہے کہ آپ کبھی بندہ، تو کبھی

شہباز، اور کبھی سید محمد حسینی بطور تخلص استعمال کرتے تھے۔ دکنی زبان وادب کے ایک نامور محقق ''دکن میں اردو'' کے مولف نصیر الدین ہاشمی آپ کے تخلص سے متعلق پس وپیش کا اظہار کرتے ہیں۔ بندہ نواز سے منسوب دکنی کلام جو مختلف بیاضوں میں درج ہے اسے رد بھی نہیں کیا جاسکتا وہ اس لئے کہ ان میں بندہ نواز اور ان کے شیخ طریقت کے نام موجود ہیں۔

مولوی عبدالحق نے ''اردو کی نشوونما میں صوفیہء کرام کا کام'' میں خواجہ بندہ نوازؒ کی ایک غزل نقل کی ہے اور پھر چند نظمیں، چکی نامہ، ایک مخمس کچھ نسخے اور کچھ متفرق اشعار بھی۔ یہ کلام آپ کے سلسلہ کے بزرگوں کی پرانی بیاضوں سے نقل کیا گیا ہے۔ جہاں تک ان غزلوں کا تعلق ہے کچھ محققین کا خیال ہے کہ یہ غزلیں ابراہیم عادل شاہ کے دور کے ایک بزرگ شہباز حسینی کی ہیں۔ اس کے علاوہ نصیر الدین ہاشمی نے ''دکن میں اردو'' میں بندہ نواز کی ایک نظم نقل کی ہے جس کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو:

میں عاشق اس پیو کا جنے مجھے جیو دیا ہے
او پیو میرے جیو کا سر قالیا ہے

....

اور معشوق بے مثال ہے نور نبی پایا
نور نبی رسول کا او میرے جیو میں بھایا
آپ کو ں اپنے دیکھنے کسی آرسی لایا

....

کھڑے کھڑے پیو جیو میں آپیں آپ دکھاوے
اسی میٹھی معشوق کوں کوئی کیوں دیکھے پاوے
جنھ دیکے آرسی کوں اسے اور نہ بہاوے

(6)

حضرت کے مذکورہ بالا کلام کے مطالعے سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ تمام مصرعے اور اشعار میں صوفیانہ عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ یعنی ان مصرعوں میں عشق کی جلوہ ریزی نمایاں ہے اس کے علاوہ، دیدار الہٰی کی تمنا اور دیوانگی کا وجد طاری ہے۔ حقیقی جام کو نوش کرنے کے بعد سرشار ہو جاتا ہے۔ سرور کائناتؐ کی عظمت وفضلیت کا بھی ان الفاظ میں ذکر کیا ہے جو قدیم بیاضوں میں حقیقت کے عنوان سے موجود ہے:

اے محمد ہجلو جم جم جلوہ تیرا
ذات تجلی ہوگی سیں سپورنہ سیرا

....

واحد اپنی آپ تھا آپسین آپ بجھایا
پرکٹھ جلوے کار نے الف میم ہو آیا
عشقوں جلوہ دینے کر کاف نون بسایا

....

مشکل بازی عشق کے چھوٹے جیو کو انا
موتوقبل ان تمو تو شاہد ہے معنا

....

اونچا مندر ہر عشق کا کوئی کیونکر پاوے
چاروں سیریاں جذبہ کر تو پے ہارتا آوے
جی لیس دیوے پانوں تل تو بھی ناپاوے

(7)

کلام بندہ نواز کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ نظموں کی ہیت میں یہ انفرادیت پائی جاتی ہے یعنی ان کے پہلے بند میں صرف دومصرعے اور بعد کے بندوں میں تین تین مصرعے پائے جاتے ہیں۔ ان نظموں میں متصوفانہ خیالات کا رفرما ہیں، یعنی عشق کا مقام اور وحدت کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے حضرت کی ایک اور غزل سے متعلق شک وشبہ کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ عہد عادل شاہ کے ایک بزرگ شہباز حسینی کی ہے اور مابعد زمانہ مخدوم بندہ نواز سے منسوب کی گئی ہیں۔ تاہم اس بات کو یقینی طور پر قبول نہیں کیا جاسکتا۔ مثالاً چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:

توں تو سہی ہے شکری کہ نفس گھوڑا سارتوں
ناہو نرم تجہ اوچری پس پاوے گا آزار توں

....

خوگر شریعت نعل بندز ین ہے طریقت زیر بند

حق ہے حقیقت بیش بند ٹک معرفت اختیار توں

....

دونوں رکا باں نیک وبدرکھتا قدم توں ایک حد

تب ہو پری کاایک جب تو با کا چابک مارتوں

....

شہباز حسینی کھوئے کردو جہاں دل دھوئے کر

اللہ اپے یک ہوئے کرتب پاوے گا دیدار توں

اس غزل میں شاعر نے نفس، ایمان، خیروشر، توبہ وغیرہ کو تشبیہات کے لبادے میں پیش کیا ہے۔

حضرت بندہ نواز کی ایک مشہور نظم ''چکی نامہ'' جو مخطوطہ کی شکل میں کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے۔ڈاکٹر زور نے اپنی کتاب، ''تذکرہ اردو مخطوطات'' میں اس کا تعارف کروایا ہے:

دیکھو واجب تن کی چکی

پیو چاتر ہو کے سکی

سوکن ابلیس کھینچ کھینچ تھکی

کہے یا بسم اللہ اللہ ہو

الف اللہ کا دستا

نے محمد ہو کر بستا

پینچی طلب یوں کو دستا

کہے یا بسم اللہ ہوا للہ

دانے ہی سوچن چن لانا
شاید ہاتوں سے لے کر بہانا
شریعت سے چمکی کی یہی

کہے یا بسم اللہ ہو اللہ

نظم ''چکی نامہ'' کے بارہ بند میں پانچ بندوں کو نصیر الدین ہاشمی نے بھی اپنی معرکتہ آرا تصنیف ''دکن میں اردو'' میں نقل کیا ہے۔اس نظم کے مطالعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی زبان میں شفافیت پائی جاتی ہے۔اور لسانی نقطہ نظر سے شک و شبہ ہوجاتا ہے کہ یہ بندہ نوازؒ کے عہد کی زبان نہیں، بلکہ بہت بعد کے دور کی ہے۔دوسری نظموں کی زبان اور اس نظم میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔اسی لئے ہم لسانی اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ نظم بندہ نواز سے منسوب کردی گئی ہے؟۔علاوہ ازیں مختلف تذکروں، مخطوطات، بیاضوں وغیرہ میں حضرتؒ سے منسوب بعض بیماریوں کے نسخے، شعری پیکر میں اور بعض اشعار آپ سے منسوب کئے گئے ہیں۔نصیر الدین ہاشمی نے بھی ان اشعار کو رقم کیا ہے لیکن وہ اس ضمن میں پس وپیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایسا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملا ہے کہ کلام مندرجہ کو خواجہ صاحب کا ہی قرار دیا جائے۔ بہت ممکن ہے کہ زمانہ مابعد میں لوگوں نے آپ سے منسوب کردیا ہو۔ چونکہ قطعی ثبوت نہیں ملا ہے، اس لئے ہم اس کے متعلق کوئی فیصلہ کن خیال ظاہر نہیں کرسکے''۔(8)

جتنا کا جل اتنا بو ل
اوس سے دونا گوند گھول

....

ذرا سی پھٹکری نمک لا تھوڑا
قلم جیسے جوں تر کی گھوڑا

....

سن تو سیا نے میری بات
بولوں داروسن کس دہات

....

جس کے منہ میں آوے باس
اس کی داروسن مجھ پاس

....

و ز ن برابر سب کوتو ل
وارد ہوا ے یوں انمول

....

پانی میں نمک ڈال مزا دیکھتا وے
جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے
یوں کھوں خودی اپنی خدا سات محمد
جب کھل گئی خود ی تو اخدا بن نہ کوئی دے

حضرت بندہ نواز کے چند ہندی گیتوں کو سخاوت مرزا نے 'سماع میں بند حجرے کی قوالی' کے چند اشعار پیش کئے ہیں ان کا خیال ہے کہ کچھ گیت ایسے ہیں جو سینہ بہ سینہ چلے آ رہے ہیں اس ضمن میں مندرجہ ذیل گیت بھی بندہ نواز سے منسوب کیا جاتا ہے:

اللہ میں تجو باج کیوں رہوں یک تلا
شاہ کابر ہا بھیدیا میرے (سارے) کیا
خواجہ نصیرالدین تن میں کھڑے رچن
اٹھنا سہاگن سجانے تیرا لالہ نہ جاگے
نس دن سوتیرا جاگا تھا میرے اللہ

نس دن سو تیرا جا گا تھا
تج کو یندا ری لائے تج کو ان کاڑی لائے
تج تج کو نیند اڑے لا گے
اٹھنا سہاگن سیج نے تیرا لالہ نہ جاگے

اس طرح کے گیت صوفیہ کی محفلوں میں گائے جاتے تھے اور بندہ نواز اس خیال کے حامی تھے کہ سماع سے گداز قلب، رقت اور سپردگی، کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ اکبرالدین صدیقی ''بجھتے چراغ'' میں لکھتے ہیں کہ

''بندہ نواز پہلا میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ جب آپ دکن تشریف لائے تو آپ نے نہ صرف دکن کی عام زبان دکنی میں وعظ کیا بلکہ پہلا یعنی خوشی کے گیت بھی لکھے جو محفل سماع میں گائے جاتے تھے۔ یہ گیت اور ان کے بعد کے بزرگوں کے گیت جو دکنی زبان میں لکھے گئے ہیں آج بھی روضہ بندہ نوازؒ میں بند سماع میں گائے جاتے ہیں''۔(9)

اللہ میں تجھ بن کیوں رہوں یک تلا
شاہ کا برہا بھیدی میں کیا
بیگی ملا ئیو کرو ہم پر میا
اس ای سنئے مبا نے درد ہے کاری
بیدل ہورھوں تو مشکل ہے بھاری
منجہ دوکھیا کوں دیونا دلداری

حضرت گیسودرازؒ کے کلام کے اس جائزہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ صوفیانہ افکار و اذکار، غرض گلبرگہ کے ادبی منظر نامے کی کوئی تاریخ حضرت بندہ نوازؒ کے تذکرہ کے بغیر ادھوری رہے گی۔ تا حال ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ بندہ نوازؒ وہ اولین سخن ور ہیں، جنھوں نے اردو دکنی کی داغ بیل دکن میں ڈالی جو بعد میں وہی شعر وادب کا ایک تناور درخت بن گیا۔☆

میراں جی شمس العشاق:

حضرت بندہ نواز کے صوفیانہ مشن کو آگے بڑھانے میں شاہ میراں جی شمس العشاق کا اہم رول رہا ہے۔ حضرت میراں جی شمس العشاق خاندان سادات کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کا نسب پندرہ واسطوں سے حضرت علی کرم اللہ وجہی سے

ملتا ہے آپ کا اصل نام امیر الدین اور عرفیت میراں جی تھی اور میراں جی بطور تخلص استعمال کرتے۔ مکہ معظّمہ آپ کا وطن مالوف تھا جہاں آپ کی ولادت باسعادت (810ھ) کو ہوئی۔ حضرت ابو بکر صدیق ابن قحافہ ابن مبارک کے محلہ قریش میں آپ کا مکان تھا۔ آپ کے والد ماجد ہندوستان میں خاندان چغتائی میں شادی کی اور مکہ معظّمہ واپس ہو گئے۔ بیجاپور میں 25 شوال المکرم 904ھ کو وفات پائی۔

آپ نے ابتدائی زندگی کی ربع صدی مکہ معظّمہ میں میں گزارے ۔ عشق رسول ﷺ کے غلبہ کی وجہ سے مدینہ منورہ میں بارہ سال تین ماہ اور پانچ یوم قیام کیا۔ آپ اس شہر کو مقدس مانتے تھے۔ اور وہاں ایک ہی کروٹ پر سویا کرتے آخری ایام میں ایک روز جمعہ کو حضرت نبی کریم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ میراں جی شاہ ،خواجہ کمال الدین بیابانی کے مرید و خلیفہ تھے اور کمال الدین، حضرت جمال الدین مغربی کے حلقہ ارادت میں داخل تھے اور جمال الدین حضرت بندہ نواز سے بیعت حاصل کی تھی۔ اس طرح میراں جی کا سلسلہ بیعت و خلافت دو واسطوں سے حضرت مخدوم بندہ نواز تک پہنچتا ہے۔

حضرت شمس العشاقؒ 22 سال کی عمر میں ہندوستان تشریف لائے اور بیجاپور کو اپنا مسکن اور وطن ثانی بنایا۔ آپ جس وقت دکن تشریف لائے بہمنی سلطنت زوال آمادہ تھی دکن کے مختلف علاقوں سے بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور بیجاپور جو بہمنی دور میں ایک فوجی چھاونی کا درجہ رکھتا تھا یوسف عادل شاہ نے اپنی خود مختاری کا اعلان کرتے ہوئے عادل شاہی سلطنت کی بنا ڈالی۔ بندہ نواز بلند پرواز کی دعاؤں کا ثمر تھا کہ شمس العشاق، بندہ نواز کے افکار و نظریات کو مقامی زبان میں پیش کرتے ہوئے دکنی نظم و نثر میں چشتیہ فکر کو عام کیا ۔ اس دوران دکنی زبان کی مقبولیت میں بھی روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور اس کے دائرۂ کار میں بھی وسعت کے امکانات تیزی کے ساتھ پیدا ہو رہے تھے۔ حضرت عشاق نظم و نثر میں کئی رسالے تصنیف و تالیف کئے۔ دکنی کے علاوہ فارسی زبان میں بھی آپ کی تصانیف کا ذکر ملتا ہے۔ فارسی میں معراج السالکین، درۃ تاج، اسرار الوحدت و غیرہ ملتے ہیں تو دکنی تصانیف میں خوش نامہ، خوش نغز، مغز مرغوب، چہار شہادت، گنج عرفان بشارت الذکر وغیرہ نام ملتے ہیں۔ حضرت نے دکن کی زبان کا ان تصانیف میں استعمال کیا ہے۔ میراں جی ایک صوفی کے ساتھ ساتھ عالم با عمل بھی تھے اور آپ کے یہاں طالبان حق و صداقت کا درس دیا کرتے اور عوام کے لیے بیجاپور کی عام زبان کو نہ صرف درس و تدریس بلکہ تصنیف و تالیف کے لیے بھی اسی عوامی زبان کو استعمال کیا جو آگے چل کر دکنی زبان و ادب میں اہمیت رکھتے ہیں اور لسانیاتی لحاظ سے بھی ان کی تحریروں کی اہمیت مسلم نظر آتی ہے۔ دکنی زبان و ادب کے ایک نامور محقق اور ''دکن میں اردو شاعری ولی سے پہلے'' کے مولف ڈاکٹر محمد جمال شریف (صفحہ 147 پر) لکھتے ہیں کہ

''میراں جی شمس العشاق عربی و فارسی کے عالم تھے۔اس زمانے کے دیگر بزرگوں کی طرح وہ بھی اپنے مریدوں اور معتقدین کو اردو میں تلقین و ہدایت فرماتے تھے اور اس مقصد کے لیے انہوں نے اردو نثر و نظم میں کئی رسالے اور کتابیں قلم بند فرمائیں۔ان میں تصوف و سلوک کے مسائل و اسرار بیان کیے ہیں جن میں سے بعض بہت اہم اور اب تک محفوظ ہیں۔''(10)

خوش نامہ، خوش نغز، شہادت التحقیق وغیرہ تصنیفات میں رنگ تصوف غالب ہے اور میراں جی کی شاعری کا محور و مرکز تصوف ہے اس لیے انہوں نے نظم و نثر میں تلقین و ارشادات کے لیے راہ تصوف کو اپنا شعار بنایا۔نصیر الدین ہاشمی نے ''دکن میں اردو'' خوش نامہ'' نظم نقل کی ہے جس کے کچھ مصرعے درج کئے جاتے ہیں:

صفت کروں میں اللہ کیری جے پوری پورن پور
قادر قدرۃ انگیکار دل نیرے نا دور
نا اس روپ نا اس دیکھ نا اس تھاں مکاں
زگنا گنو نتا کرواکس مکھ کروں بکھاں

. . . .

خوش خوش حالوں خوش خوشیاں خوشی رہے بھر پور
یہ خوش خوشیاں اللہ کیرا نوراً اعلی نور
کھنڈیا خوش خوش نامہ تمت ہوا تمام
خوش سب کوئی دایم قایم جیتا خودھن عوام

(11)

یہ نظم بقول جمیل جالبی ایک سوستر اشعار پر مشتمل ہے۔جس میں دکھ درد کا احساس اور صبر و شکر کی تلقین کا درس ملتا ہے۔اس نظم میں میراں جی کہیں کہیں جذباتی ہوجاتے ہیں جس کی بنا پر سوز و گداز پیدا ہوجاتا ہے۔اس نظم کے سلسلے میں محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

''اس نظم میں ایک نوجوان لڑکی خوش یا خوشنودی کا قصہ لکھا ہے جو شاہ پور میں سترہ سال کی عمر میں انتقال کرگئی۔وہ

بھولی بھالی اور سب کو پیاری تھی۔ دوسری لڑکیوں کی طرح شوخ و شنگ نہ تھی اور بناؤ سنگھار کی جگہ خدا کی لگن لگی ہوئی تھی۔ وہ ہر وقت اللہ سے ڈرتی اور کہتی کہ جہاں جہاں میں چھپتی ہوں وہاں وہاں تو ہی نظر آتا ہے اسی لیے وہ کہتی:

اب نا چھپوں، اب نہ ڈروں، ڈروں تو کہاں لگ ڈروں
ہمیں غریب نپایئے آستھی آسادھروں
ماتا جی بالک تھی رو سے جانا انھیں کدھر
آپ جس مارگ لالے میراں جی میں تو جاؤں جدھر

(12)

اسی طرح مثنوی ''خوش نغز'' تحریر فرمائی ہے جس میں ''خوشی'' میراں جی سے سوال کرتی ہے اور وہ اس کا جواب دیتے ہیں۔ ان نظموں کے مطالعہ سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ میراں جی نے خواتین کی نہ صرف تعلیم پر زور دیتے تھے بلکہ ان کے پیش نظر تربیت بھی اہم تھی۔ اس عہد میں انہوں نے اس طرح خواتین کی تعلیم و تربیت سے ان میں روحانی و عرفانی فکر و نظر پیدا کرنے کی سعی جمیل کی ہے۔ خوش نغز سے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں:

اللہ اسم ذاتی دوہوں جگ ازل
جلی ہم خفی سوں گیا ہے فضل
شرف نام دینا سنا لو اوپر
ملائک و جن و جگر اوپر
دوہوں جگ سر بن اللہ یک نام
کہ مخلص و عابد جیسی ہیں دام
(13)...................................
خوش پوچھے کی کہو میراں جی عالم اچھے کیتے
پیر کہیں سن جیتے تن اچھیں عالم تیتے
خوش کہی مجھ کہو میراں جی عشق ٹرایا بودہ
پیر کہیں میں آکھوں بیان دھرنا اس میں بودا

(خوش نغز)

خوش نغز ایک منظوم تحریر ہے جس میں تصوف و معرفت کے مسائل پیش کئے گئے ہیں۔اس منظوم تحریر کا طرز سوال و جواب کی شکل میں ملتا ہے۔اس مثنوی کا ایک کردار جس کا نام خوش ہے وہ میراں جی سے سوال کرتی ہے اور حضرت عشاق اس کا جواب دیتے ہیں۔اس کردار کی مناسبت سے میراں جی نے اس نظم کا نام خوش نغز رکھا ہے۔اس پوری نظم میں عرفانی و روحانی، عقل و عشق مراقبہ وغیرہ عنوانات کے تحت علم و عرفان کا درس دیا گیا ہے:

جے ھماری ارادت کی ان کا یہ احکام
نماز، تسبیح ،نیتیان، ذکر اللہ کا نام
اس پر جیتا ہے صدق سوں اوتا اچھے لاب
دین و دنیا، دیدار بہشتان پاوے بے حساب

(خوش نغز)

میراں جی کے دیگر نظموں میں ''شہادت التحقیق'' اور مغز مرغوب'' اہم ہیں۔ان نظموں کی زبان میں سادگی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ان میں بھی سلوک و معرفت اور صوفیانہ فکر و نظر کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔شہادت تحقیق طویل نظم ہے جس میں 563 اشعار ملتے ہیں۔قرآن وحدیث کی روشنی میں شریعت و طریقت کی وضاحت کی گئی ہے۔اس نظم کا تعارف کرواتے ہوئے یوسف سرمست رقم طراز ہیں:

> ''''شہادت التحقیق''، میرانجی کی ایک طویل نظم ہے جو پانچ سو ترسٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔اس نظم میں شریعت اور طریقت کے مسائل قرآن و حدیث کے ذریعے سمجھائے گئے ہیں۔اس میں بھی سوال اور جواب کا طریقہ اپنایا گیا ہے۔''طالب سوال کرتا ہے''مرشد'' جواب دیتے ہیں۔اس میں بھی شریعت اور طریقت کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس میں یہ تلقین کی گئی ہے ہے کہ سوچ سمجھ کر شریعت اور طریقت پر چلنا چاہئے جو ایسا نہیں کرتے وہ اپنی عمر ضائع کرتے ہیں۔''(14)

شہادت تحقیق کو پہلی بار پروفیسر ہاشم علی دریافت کرتے ہوئے 1966ء میں مرتب کیا ہے۔اس نظم کے چند اشعار

پیش کئے جاتے ہیں:

شریعت کن بوجھے پورا طریقت کچ کرے
حقیقت وہ نیچا دیکھے معرفت سوں تھرے
سوتی سوکرے کرے سو دیکھے دیکھے تو کچ بھوک
ست کرکاکر یا ہوئے پورا نہیں تو دونا روک

(شہادت التحقیق)

''مغز مرغوب''، نظم میں بھی صوفیانہ اور فلسفیانہ مسائل بیان ہوئے ہیں۔اس نظم کو پروفیسر ہاشم علی نے 1966ء میں ترتیب دیا ہے۔اس نظم سے چند مصرے درج کئے جاتے ہیں جن میں عشق حقیقی کی جلوہ نمائی دیکھی جاسکتی ہے:

اللہ محمد علی امام دایم ان سوں حال
سب خاصوں سوں اللہ اللہ تو آنکھوں گیان کمال
مغز مرغوب دھریا جانو امیں اس نسلخی کا نام
مرشد مکھوں سمجھی نو ھودی کشف تمام
بیس نظم اور تین زیادہ اس کا سب حساب
پڑسن پچیاں کرلی رھی تو ھر نعمت کا جواب

(مغز مرغوب)

شمس العشاق کی نظمیہ شاعری کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان اشعار کا تعلق صوفیہ کی فکر ونظر ہے۔ان کے یہاں عشق کی سرمستیاں، دیدار الٰہی کی تمنا، حضور اقدس ﷺ کی رفعت و بزرگی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت، پیر کی معرفت کے علاوہ شریعت، طریقت حقیت اور معرفت، دیوانگی وغیرہ جیسے مختلف النوع صوفیانہ اور عارفانہ کیفیات کو عیاں اور بیان کیا ہے۔

حضرت عشاق کی شاعری کے اس جائزہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان کے یہاں صوفیانہ و عارفانہ افکار و اذکار کا نیر و تاباں نظر آتے ہیں۔غرض بیجاپور کے صوفیہ کے ادبی کارناموں کی کوئی بھی تاریخ حضرت میراں جی کے ذکر کے بغیر نامکمل سمجھی جائے گی۔بہرکیف اصحاب بندہ نوازؒ میں وہ اولین سخن ور ہیں، جنھوں نے نہ صرف دکنی زبان کو ارتقاء کی راہ پر ڈالی بلکہ

خانوادۂ چشت کے سلسلہ کو دکن میں اعتبار کا حامل بنانے میں ممد ومعاون رہے۔☆

فیروز بیدری:

فیروز کا تعلق بیدر کی بہمنی سلطنت سے ہے۔بہمنی دور کے آخری دور میں اس کا شمار اہم شعراء میں ہوتا ہے۔تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اس کی زندگی کے ابتدائی حالات پردۂ خفا میں ہیں۔اس کے تعلق سے یہ بھی لکھا گیا ہے کہ وہ قادری سلسلہ میں مرید تھا۔صاحب ''دکن میں ردو'' فیروز کا تعارف اس طرح کروایا ہے:

> ''قطب الدین نام فیروز تخلص، اس دور کا ایک بلند پایہ شاعر ہے اس کا وطن بیدر تھا، زمانہ مابعد میں گولکنڈہ آ گیا، فیروز قادریہ طریقہ میں مرید تھا۔شیخ محمد ابراہیم مشہور مخدوم جی اس کے مرشد تھے۔مخدوم جی شیخ محمد ملتانی کے فرزند تھے۔شیخ ملتانی اپنے عہد میں بااثر اور تقدس مآب شخصیت کے مالک تھے، سلاطین گولکنڈہ آپ کا اور آپ کی اولاد کا بڑا احترام کرتے تھے۔''(15)

حضرت مخدوم جی شیخ محمد ابراہیم (متوفی 1564ء) اس دور کے اکابر صوفیہ میں شمار ہوتے ہیں اور وہ حضرت شیخ محمد ملتانی کے فرزند اور خلیفہ تھے اور آپ کے انتقال کے بعد جانشین بھی ہوئے۔حضرت کے خاندان کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی لہذا حضرت مخدوم جی نے اپنے فکر وعمل سے مزید شہرت پائی۔ان سے ملنے کے لیے کیا بادشاہ اور کیا فقیر سب ہی متمنی رہتے تھے۔ان کی روحانیت سے متاثر ہوکر قطب شاہی فرمانرواں عبداللہ قطب شاہ نے انہیں گولکنڈہ آنے کی دعوت دی۔مگر وہ کسی سلطنت سے وابستہ ہونا نہیں چاہتے تھے اس سلسلہ میں تذکرۂ اولیائے دکن کے حوالے سے جمال شریف رقم طراز ہیں:

> ''ابراہیم قطب شاہ نے ملاقات کی درخواست کی۔آپ نے منظور نہیں فرمایا۔بادشاہ نے عرض کیا اگر آپ نہیں آتے ہیں تو نعلین مبارک کو بھیج دیجیے تاکہ نعلین بوسی سے مشرف ہوں۔آپ نے یہ بھی قبول نہیں کیا اور جواب میں کہلا بھیجا کہ سلاطین درویشوں سے دعا چاہتے ہیں میں آپ کو تمام مسلمانوں کے ساتھ دعا میں شریک کرتا ہوں۔یہ کافی ہے۔(16)........''

اس لئے خیال اغلب ہے کہ اپنے مرید فیروز بیدری کو گولکنڈہ روانہ کیا ہوگا۔محققین میں بعضوں نے بیدر تو بعض نے

قطب شاہی دور کے ابتدائی شاعروں میں شمار کرتے ہیں۔ فیروز کی شعری عظمت و رفعت اور استادی مسلم ہے اور اس کی شعری بلندی کے قائل وجہی اور ابن نشاطی جیسے دکنی کے اکابر شاعر بھی رہے ہیں۔ بہر کیف فیروز کو شعری ملکہ حاصل تھا اور فیروز کی چند غزلیں اور ایک مثنوی ''پرت نامہ'' ملتی ہیں۔ اس مثنوی کو ڈاکٹر محمد علی اثر نے ناقص الآخر قرار دیا ہے۔ پرت نامہ کے نام کے سلسلہ میں اختلاف ہے اس کو صفت نامہ اور توصیف نامہ بھی کہا گیا ہے۔ اس مثنوی کے بقول جمیل جالبی نے 121 اشعار جمع کئے ہیں۔ جس میں فیروز نے حضرت عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالی عنہ اور اپنے پیرومرشد مخدوم جی کی مدح سرائی کی ہے:

تہیں قطب اقطاب جگ پیر ہے
تہیں غوث اعظم جہاں گیر ہے
تہیں چاند باقی ولی تارے ہیں
توں سلطان سردار بسارے ہیں
ولایت سوں جب تو اجایا علم
علم تجھ تلیں ہیں ولی سب حشم
محی الدین تون دین تجہ تے جیا
تو اسلام کون زور سرتے دیا
نہیں نور دیدا نبی کا یقیں
تہیں عین دستا علی یقیں
کہ باغ علی کوں تو گلشن کیا
چراغ حسیں کوں تو روشن کیا

مثنوی پرت نامہ کے چند اشعار سے اس بات کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ فیروز صوفیہ کا معتقد تھا اور اس کی فکر بھی مذہبی تھی۔ چنانچہ اس نے اس مثنوی میں حضرت غوث اعظم کو دنیا کا پیر اور جہاں گیر جیسے القاب سے خراج عقیدت پیش کرتا ہے اور انہیں چاند اور باقی اولیاء کو تاروں سے تشبیہ دیتا ہے اور آپ کے دم سے علم کی روشنی دیگر اولیا تک پہنچی ہے۔ مزید کہتا ہے کہ وہ اسلام جو نبی ﷺ، حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ تعالی عنہ کے دین کو اپنے زور ولایت سے تقویت پہنچائی۔ ان خیالات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ صوفیہ کرام کا عاشق اور اس کے فکر عمل میں بھی یہ کیفیت نمایاں

تھی۔صوفیہ کے اقوال بھی ہیں کہ ہر انسان پر واجب ہے کہ وہ خدا کے برگزیدہ بندوں سے محبت و الفت رکھے اور ان کی صحبت اختیار کرے چونکہ ان اللہ کے مقرب بندوں کی صحبت گویا خدا کی صحبت و محبت ہے۔فارسی کے معروف شاعر مولانائے روم نے کہا تھا کہ

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا
او نشیند در حضور اولیاء

حضرت غوث اعظم دستگیرؒ کی عظمت اور ولایت کے سبھی اکابر اولیا قائل رہے ہیں۔آپ کی بزرگی، کرامات، خلق خدا کی خدمت، پند و نصیحت اور تصنیفات وغیرہ سے ایک عالم کو فائدہ ہوا ہے اس دور میں مختلف فتنے سر ابھار رہے تھے آپ کی شخصیت نے ان تمام کا مقابلہ کرتے ہوئے حق کو پائندہ کر دیا۔اس سلسلہ میں ان کے دور کے ایک بزرگ شیخ مظفر منصور ابن المبارک نے حضرت غوث اعظم کی عظمت کے متعلق فرماتے ہیں جسے صاحب کائینات تصوف نے نقل کیا ہے:

''میں نے اپنی ساری عمر میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے بڑھ کر کوئی خوش اخلاق، فراخ حوصلہ، کریم النفس، رقیق القلب، محبت و تعلقات کا پاس رکھنے والا نہیں دیکھا۔آپ اپنی عظمت اور عروج مرتبت، انتہائی علمی وسعت کے باوجود چھونے کی رعایت فرماتے، بڑے توقیر کرتے، سلام میں پہل کرتے، کمزوروں کے پاس اٹھتے بیٹھتے، غریبوں کے ساتھ تواضع اور انکساری کے ساتھ پیش آتے۔حالانکہ آپ کسی سربرآوردہ یا رئیس کے لیے تعظیم کے لیے نہیں کھڑے ہوئے، نہ کبھی امیر کے دروازے پر گئے۔'' (17)

فیروز بیدری، غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ سے حد درجے محبت رکھنے والا شاعر تھا اس لیے بھی کہ اس نے اپنے پیر کو ان کے مشابہ پایا۔چنانچہ کتب تصوف میں رقم کیا گیا ہے کہ ہر وقت اپنے مرشد کی صورت و محبت کو دل میں جمائے رکھے اور ہر گھڑی مشاہدہ میں رہا کرے۔اسی طرح صوفیوں کے یہاں یہ قول بھی عام ہے کہ 'کوئی شخص اگر چہ تمام علوم کو جمع کرے اور مختلف طبقات کے لوگوں کی صحبت میں رہے مگر اللہ تعالی کے قرب کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کسی شیخ کامل یا امام مصلح کی تربیت میں رہ کر مجاہدہ نہ کرے۔اس طرح فیروز بیدری نے ان اقوال کو اپنی زندگی میں عملی جامہ پہناتے ہوئے صوفیانہ فکر و عمل کی

پاسداری کی ہے۔اس نے مخدوم جی سے بیعت حاصل کی اور اپنے مرشد کامل کی رہنمائی میں روحانی تربیت بھی حاصل کرتا ہے۔چونکہ اس کے مرشد قادری سلسلہ کے تھے لہذا اس نے قادری سلسلہ کے بانی حضرت غوث اعظم سے بھی محبت وانسیت کا ثبوت پیش کیا۔اس کے علاوہ وہ خواب میں حضرت غوث اعظم ملاقات کا شرف بھی حاصل کر چکے تھے اور ان کی صورت پیر کی صورت سے مشابہ نظر آئی۔بقول نصیر الدین ہاشمی:

> ''فیروز نے 'پرت نامہ' میں صراحت کی ہے کہ اس نے خواب میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ آپ ہو بہو مخدوم جی کی ہم شبیہہ ہیں اس لیے اس نے آپ کو ہر جگہ محی الدین ثانی کے نام سے یاد کیا ہے۔''(18)

اس مثنوی کے سنہ تصنیف سے متعلق محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے مگر یہ بات طے ہے کہ یہ مثنوی 940ھ سے پہلے لکھی ہوئی ہے بہر حال اس مثنوی کے مطالعہ سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ فیروز بیدری صوفیانہ و عارفانہ ماحول کا پروردہ تھا اس لیے اس کے فکر و عمل میں اس رنگ کے اشعار ملتے ہیں چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

ابراہیم مخدوم جی جیو نا
کہ مے وحدت سدا پیو نا
مرا پیر مخدوم جی جگ منے
منگوں نعمتاں میں سدا اس کنے
کریں منجہ اپر پیار اے پیر جگ
کہ تجہ پیارتے ہوئے مندھیر جگ
جسے پیر مخدوم جی پاک ہے
اسے دین و دنیا میں کیا باک ہے

....

تو سلطان سلاطین رعیت محی
تو حاکم کہ جگ پر حکومت تجی

محی الدین ثانی سو مخدوم جیو
ارے جیو اس ھت پرم مد پیو
....
سو مخدوم جی پیر فیروز کا
نگہبان فردا و امروز کا
جو تیری نظر مجھ پہ یک بار طوے
کہ سب خاک میری سوپنکار ھوے
....
محی الدین تیرا توں میرا میان
توں میرے محی الدین کے درمیان
کہیا توں کہ فیروز میرا مرید
بڑی بخت میری جو تیرا مرید
مجے ناؤن ھے قطب دین قادری
تخلص سو فیروز ہے بیدری

فیروز کے یہاں شعری جمال آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے اس کے علاوہ اشعار میں روانی، سلاست اور بے ساختگی کا بھی احساس ہوتا ہے اور فیروز کا اپنا رنگ وآہنگ اور طرز نمایاں نظر آتا ہے۔ فیروز نے اپنی زبان واسلوب اور طرز کی بنا پر اپنے پیش رو کے لیے راستہ بنایا اور آگے چل کر صوفیانہ فکر کے ساتھ ساتھ دکنی زبان کا اپنا اسلوب بنا۔☆

برہان الدین جانم:

حضرت شاہ میراں جی کے لائق فرزند اور خلیفہ برہان الدین جانمؔ ہیں۔ جن کا شمار اس دور کے اکابر صوفیہ اور قلم کاروں میں کیا جاتا ہے۔ جنھوں نے اپنے والد گرامی کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے مخلوق خداوندی کو صوفیانہ سرسبزی عطا کیا۔ تصنیف وتالیف کے ذریعے بھی اپنی خدمات انجام دیں۔ برہان الدین جانمؔ کی دکنی تصنیف ''کلمتہ الحقائق''معروف دکنی نثری رسالہ ہے جسے بیشتر محققین نے دکنی کی اولین نثری شاہ کار قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ رسالہ ''وجودیہ'' بھی نثری کتاب

ہے۔آپ کی شعری تصانیف میں وصیت الہادی، بشارت الذکر، سکھ سہیلا، منفعت الایمان، فرمان از دیوان حجت البقا وغیرہ شامل ہیں۔نثری وشعری تصانیف ورسائل کا موضوعِ سخن تصوف، اخلاق اور تربیت رہا ہے۔ آپ کی ولادت کے ضمن میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی ہے۔اس سلسلہ میں ڈاکٹر محمد علی اثر مختلف محققین کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''شاہ برہان الدین کے سنہ ولادت میں اختلاف ہے۔ڈاکٹر زور نے ان کی سنہ پیدائش ۹۵۰ھ/ ۱۵۴۳ اور سنہ وفات (999ھ/ 1591ء) قرار دیا ہے۔مولوی اکبرالدین صدیقی نے آپ کا سنہ ولادت 884ھ/ 1479ء اور سنہ وفات (992ھ/ 1584ء) لکھا ہے درست نہیں ہے کیونکہ بقول ڈاکٹر زور جانم نے اپنی تصنیف ''ارشاد نامہ'' کے آخر میں اس کو منظوم کرنے کی تاریخ 999ھ/ 1591ء) لکھی ہے۔پروفیسر سروری نے جانم کی وفات کا سنہ 999ھ/ 1591ء لکھا ہے۔''(19)

میراں جی شمس العشاق کی وفات کے بعد حضرت جانم نے اپنے والد و پیر مرشد کے کام کو آگے بڑھایا۔مقامی بولی میں اپنے مریدین، عقیدت مندوں اور طالبانِ حق کی نہ صرف تربیت فرمائی بلکہ کئی تصنیفات و تالیفات کے کام کو بھی جاری رکھا۔واقعہ یہ ہے کہ آپ ایک باعمل عالم اور باصفا صوفی بزرگ تھے جن کے مریدین اور معتقدمین کی تعداد لاکھوں میں تھی۔اوران طالبانِ حق کی روحانی تربیت کے لیے نظم ونثر میں اپنی تحریری کاوشوں کو پیش کرتے ہوئے اشاعت اسلام اور دعوتِ حق اور صوفیانہ پیغام کو عام کیا۔پروفیسر سیدہ جعفر نے حدیقہ رحمانی کے ذریعے جانم کی روحانی عظمت ورفعت کو بیان کیا ہے جس کو ڈاکٹر محمد علی اثر نے نقل کیا ہے کہ

> ''برہان الدین جانم کے ہم عصروں میں شاہ محمد گوالیاری، شاہ وجیہ الدین گجراتی، علی جیو گام دھنی، قاضی محمود دریائی، خوب محمد چشتی، مخدوم جی ملتانی اور شاہ ابوالحسن قادری کے نام لئے جاسکتے ہیں۔شاہ برہان الدین جانم عوام میں مقبول اور ہردل عزیز تھے۔''(20)

شاہ برہان الدین جانم کی مقبولت مسلم تھی اور وہ مختلف القابات کے ذریعے بھی یاد کئے جاتے تھے۔تذکرہ نگاروں

اور تاریخی کتب میں اس کا ذکر ملتا ہے۔انہیں جانم کے علاوہ برہان الدین والحقیقت، برہان الحق والدین، برہان الحقیقت والدین، قطب الاقطاب، قطب الآفاق، قطب الحق والدین، شاہ مریداں پناہ، بحر الحقیقت والمعرفت، مہدی دین و ہادی المومنین، امام العاشقین والعارفین، شمس المحققین، شاہ برہان المعظم والمکرم وغیرہ۔انہوں نے شاعری میں جانم کے علاوہ برہان اور شاہ برہان بھی استعمال کیا ہے(21)

برہان الدین جانم مختلف اصناف سخن میں اپنی فکری سرمایہ یادگا چھوڑا ہے۔انہوں نے چند ایک غزلوں کے علاوہ، مثنوی وغیرہ میں اپنے فکر وفن کو مترشح کرتے ہوئے چشتیہ سلسلہ کی تبلیغ وتلقین کیا کرتے اور سلوک ومعرفت کے جام بھی نہ صرف نوش کیا بلکہ ہزاروں مریدین ومتقدمین کے فکری وعملی زاویوں کو بدل کرر کھ دیا۔ڈاکٹر قیوم صادق سابق صدر شعبہ اردو ،گلبرگہ یونیورسٹی نے اپنی تالیف دکنی ادب میں آٹھ منثور رسالے اور سولہ منظوم رسالوں کا ذکر کیا ہے۔ان کے اہم ترین منظوم رسالوں میں ارشادنامہ، سکھ سہیلا، نسیم الکلام، حجت البقا، وصیت الہادی، بشارت الذکر، کفرنامہ، توحید حقیقت ،نکتہ واحد، رموز السالکین اور منفعت الایمان وغیرہ شامل ہیں۔جانم کی منثور ومنظوم تحریروں میں متصوفانہ خیالات عشقیہ جذبات، مقام وحدت و وجودیت کی طرف بلیغ اشارے ملتے ہیں۔ان کی ہر تحریر میں تصوف وسلوک کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔بقول ڈاکٹر عقیل ہاشمی

> ''شاہ برہان الدین جانم کے متصوفانہ نظریات دراصل خودشناسی، عشق رسول اور جذبہء خدمت خلق کی نمائیندگی کرتے ہیں۔انہوں نے اپنے خیالات کو تصوف کی تعلیم وتعلم سے مربوط کیا ہے جس میں راہ سلوک پر چلنے کی خواہش مند طالبین کے لیے حکمت وبصیرت ملتی ہے۔جانم اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس کے بارے میں قرآن نے جن تین اموریعنی ویزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمتہ کا ذکر کیا ہے اس کی وضاحت کرتے ہیں اور پھر اس مشہور قول 'من عرف نفسه فقد عرف ربه'' کی تعلیم دیتے ہیں۔ان کے دست یاب کلام اور تحریروں سے انہی باتوں کا مکمل اظہار ہوتا ہے۔''(22)

اس دور کی روایت کے لحاظ سے جانم نے ''ارشادنامہ'' کو سوال وجواب کے انداز میں نظم کیا ہے۔یہ نظم جانم کی اہم

نظموں میں شمار کی جاتی ہے جس کے ڈھائی ہزار اشعار ہیں اور اس کا سنہ تصنیف 909ھ ہے۔ اس طویل نظم جانم نے حمد باری تعالیٰ، نعت رسول ﷺ اور منقبت اور پھر صوفیانہ مسائل و مراحل کا بیان سوال و جواب میں پیش کیا ہے اور انہوں نے شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت وغیرہ جیسے موضوعات کے علاوہ ذات و صفات، کفر و اسلام، جنت و دوزخ، روح و نفس، وجود و شہود، سلوک و معرفت، علم و عرفان، تزکیہ و تصفیہ وغیرہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس نظم سے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:

صفت کروں کچھ اپنا پیر
جس تھے روشن ہوئے ضمیر
دھوں جگ میں منجہ میت دہی
سمروں لے من نیت وہی
تس کوں سمرپن تن من شاد
جس کا آہے منجہ پرساد
جگ میں آہے توں ہیں رتن
مردے میں کروں جتن
پیر میراں جی شمش العشاق
دھوں جگ رب تجھ کیا کشاف

. . . .

شریعت طریقت حقیقت سوں
مجھے لیا یا معرفت سوں
جنے مجھ کیتا اس میں سوال
جوان انپڑیا ہے درجال
ایسا قدرت کا شرف
اس میں اس میں نہیں فرق

(نظم: ارشادنامہ)

برہان الدین جانم کی ایک اور نظم ''حجت البقا'' جو سولہ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نظم کا موضوع اللہ تبارک تعالی کی بزرگی اور وحدت ہے۔ اس نظم کو مکالموں کے انداز میں نظم کیا گیا ہے جس میں مرید سوال کرتا ہے اور پیر اس کا جواب دیتے ہیں۔ ''منفعت الایمان'' ایک سو بیس اشعار پر مشتمل ہے جس کو سات حصوں میں منقسم کیا گیا ہے اور اس نظم میں طالبان حق کے لیے نصیحت آمیز باتیں بیان کی گئی ہیں کہ وہ دہریوں اور غلط صحبتوں سے پرہیز کریں۔ نظم ''وصیت الہادی'' میں جانم نے سلوک و معرفت کے مسائل بیان کئے ہیں یعنی اللہ ایک ہے، اس کی ذات میں کسی کو شریک نہ کرنا اور گمراہوں سے بچنا وغیرہ۔ بشارت الذکر ساٹھ ابیات پر مشتمل ہے جس میں ذکر و اذکار کے طور طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''نسیم الکلام'' پینتالیس اشعار پر مشتمل ہے جس میں قرآن وحدیث پر جانم نے منظوم شرح لکھی ہے۔ ''سکھ سہیلا'' گیت کے طرز پر نظم ہوئی ہیئت کے لحاظ سے یہ ترکیب بند ہے۔ چار مصرعوں کا ایک بند ہے اور چوتھا مصرع مشترک ہے۔ اس نظم میں مرید کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنے پیر سے کس طرح سلوک و عرفان کی تعلیم حاصل کر سکے یعنی حقیقت پیر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''فرمان از دیوان مختصر نظم ہے جس کے اشعار کی تعداد انتیس بتائی گئی ہے۔ اسی طرح نظم ''رموز الواصلین'' میں جانم نے روح، دل، نفس وغیرہ ذکر کیا ہے۔ غرض ان کے ہر نظم تصوف، علم و عرفان کا خزینہ معلوم ہوتی ہے:

اللہ واحد سر جنہار
دو جگ رچنار چھپا اپار
عالم کیا ظہور
اپنے باطن کیرے نور
دیکھن چوندی لایا جگ
کوئی نا سمجھے اسکوں الگ
غفلت کیتا پردا آڑ
سب جگ لیتا اس میں تاڑ

(نظم: منفعت الایمان)

سکتا قادر قدرت سوں تجکوں کوئی کیا
جس کوں لوڑی دیوی راہ کہیا یھدی من یشار

بھو روپ پرغٹ آپ چھپایا کوئی نپایا انت
مایا موں میں سب جگ باندھیا کیوں کر سوجھے پنت
(نظم: وصیت الہادی)

بھو دھات یوگی کریں بچار گر بُن نہ پاویں سوے
سادھو جن کی سیوالیویں توچہ پراپت ہووے
گر پر سادھوں کوئی یک جانے دیکھت برلا کوے
لوکا یہ مت کچھ الادھی جن بوجھ بختوں لادھی
(نظم: سکھ سہیلا)

غرض برہان الدین جانمؔ نے طویل اور مختصر نظموں کے علاوہ گیت، غزل وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کے گیت اور نظمیں ہندوی روایت کے قدیم نمونوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ان کے یہاں عشق کے علاوہ انسانی کی عظمت، دکھ سکھ، بے ثباتی، فقر وقناعت وغیرہ جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ان کے دیگر منظومات میں بھی غالب رجحان سلوک وتصوف اور عشق کی جلوہ سامانیاں نمایاں ہوتی ہیں۔ان کے یہاں چشتیہ سلسلہ کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں۔اپنے پیرومرشد کی تعلیمات اور اتباع کرتے ہوئے اپنی فکر کو مترشح کیا ہے۔جانم کا صوفیانہ رجحان ہمہ اوست (وجودی) ہے۔☆

سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ:

حضرت شاہ میرانجی کے پوتے اور برہان الدین جانم کے فرزند دلبند امین الدین اعلی (1591 تا 1675ء) اپنے والد کے پردہ فرمانے کے بعد اس عالم آب وگل میں آئے۔امین کا شمار بھی والد اور دادا کی طرح اکابر صوفیہ اور قلم کاروں میں ہوتا ہے۔جنہوں نے اپنے والد کی وصیت کے مطابق تصنیف وتالیف کے ذریعے سلسلہ ءچشتیہ کو آگے بڑھاتے ہوئے صوفیانہ فکر ونظر کی تبلیغ وتلقین اور رشد وہدایت انجام دیں اور اپنے سلسلہ کو دکن میں استحکام پہنچایا۔روضتہ الاولیاء بیجاپور کے حوالے سے ڈاکٹر محمد جمال شریف رقم طراز ہیں:

’’آپ اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ برہان الدین جانم کی وفات کے بعد پیدا ہوئے۔آپ اولیائے کامل اور مجذوبانِ واصل سے تھے اور اپنے چچا حضرت خواجہ عطا اللہ سے ارشاد بیعت حاصل کر کے رات دن محویت و

استغراق حق میں رہتے تھے۔باوجود کمال جذب کے آپ سے ارشاد وتلقین نکات معارف اسرار 1086 ھجری میں ہوئی۔''ختم ولی'' سے آپ کے وصال کی تاریخ ظاہر ہوتی ہے۔آپ سے فیض ارشاد وتلقین اور بیعت و خلافت بہت جاری ہوا۔''(23)

شاہ امین کے کئی دکنی رسائل جن میں نظم ونثر موجود ہیں ''گفتار حضرت امین'' کلمتہ الاسرار اور'' وجودیہ'' نثری رسالے ہیں ۔آپ کی شعری تصانیف میں محب نامہ، رموز السالکین، کلام اعلی اور وجودیہ وغیرہ شامل ہیں۔وجودیہ رسالہ میں نظم و نثر موجود ہے نثری وشعری رسائل کا موضوع سخن اسرار ومعرفت رہا ہے۔بیک وقت نظم ونثر میں کمال رکھتے تھے اپنی بات کو فطری طرز میں بیان کرنے پر قدرت رکھتے تھے۔وہ ایک فطری شاعر مادرذات صوفی تھے، نظم، غزلیں اور گیت وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔بقول محمد علی اثر:

''حضرت امین ایک کثیر التصانیف بزرگ تھے اردو نظم ونثر کی متعدد کتابیں ان سے یادگار ہیں، منظومات میں'' محب نامہ''، ''ناریزہ''، جواہر الاسرار''،''مدح برہان الدین جانم''،''سہیلا''،''قربیہ''،''حقیقت وجودیہ''،''غزلیں''،''گیت''، ''دہریاور'' نثری تصانیف میں ''گنج مخفی''،''وجودیہ''،''گفتار شاہ امین ''،''ارشادات''،''ظاہر و باطن ''،''عشق نامہ''،''شرح کلمہ طیب''،''کلمتہ الاسرار'' کے نام قابلِ ذکر ہیں۔''(24)

شاہ امین الدین نے مختلف اصناف میں اپنی فکر ونظر کو مترشح کیا ہے۔انہوں نے غزلوں کے علاوہ،منظومات،وغیرہ میں اپنی فکری یادگاریں چھوڑی ہیں۔امین الدین علی اعلی کی نثری ونظمیہ تحریریں میں صوفیانہ رنگ کی حامل ہیں اور ان میں باطن وسلوک کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔بقول نصیر الدین ہاشمی:

''شاہ صاحب فطری شاعر تھے۔آپ کی متعدد تصانیف ہیں جن میں سے بعض مثنویاں ہیں اور چند قصائد۔ایک قصیدہ اپنے باپ کی تعریف میں لکھا ہے دوسرا قصیدہ ایک عشقیہ نظم ہے جس کو محبت نامہ سے موسوم کیا گیا ہے۔مثنویوں میں سے رموز السالکین اور نظم وجودیہ خاص طور پر قابلِ ذکر

ہیں۔‘‘(25)

شاہ امین کا ’’رسالہ رموز السالکین‘‘ غیر مطبوعہ ہے۔ اس نظم کو رموز الواصلین بھی کہا گیا ہے اور بعض محققین نے اسے برہان الدین جانم کی تخلیق قرار دیا ہے۔ اس نظم میں امین نے اللہ تبارک تعالی کی توصیف،، صفات کے علاوہ صوفیانہ مسائل کو بیان کرتے ہوئے نور و دل، نفس و دل، فنا و بقا وغیرہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس نظم سے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:

اللہ پاک منزہ ذات
اس سوں صفتاں قائم سات
علم ارادت قدرت بار
سنتا دیکھتا بولن ہار

....

ادنی عاشق اعلی بوج
یہ دو مقصود آکھوں تج
یہ سب بوجھے اس کا سوز
بوجھے مجلس شب ھور روز

....

ناؤں رموز السالکین
سالک پھر دیکھ لاؤ یقین
واصل سنکر ہوے فدا
عاشق خود تھے ہوے جدا

....

ڈر امید میں پکڑیا ٹھاوں
ہر دم جپیں اس کا ناؤں
حق کی راہ میں پکڑ یقین

کیوں نہ اس کو ہوے امین

(نظم: رموز السالکین)

نظم ''وجودیہ'' میں روح، وحدت الوجود اور دوسرے مسائل کا ذکر ملتا ہے تو رسالہ ''قربیہ'' میں سلوک و معرفت کے مسائل سے متعلق روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور نظم ''محیط مطلق'' تصوف اور راہ سلوک کے نکات کو بیان کرتی ہیں۔ اس نظم کو اس لیے بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں انکے والد گرامی کی مدح اور ان کا ذکر ملتا ہے۔ ''گفتار امین الدین اعلیٰ'' میں طالبان حق کے لیے توحیدی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ غرض ان کے ہر نظم تصوف، علم و عرفان، شریعت و طریقت کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ امین الدین کی غزلوں سے صوفیانہ فکر کے حامل اشعار درج کئے جاتے ہیں:

جب عشق میں ہور حسن میں اول (تے کھٹ) کھٹ ہوا
اظہار ہوئے معشوق سوں تو آکے اس لٹ پٹ ہوا

.....

گھر گھر کنتجا کھول بکھانے جلوا دینے آپس کوں
عارف عاشق معشوق سوں ظاہر عالم ہوتے ہیں

.....

جب ایک تھیں دوجا ہوا پوجا ہوا اس حسن کا
توں احد احمد ہوا بند اپنا تو گھٹ ہوا

غرض شاہ امین الدین اعلیٰ نے اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے دکنی زبان کو ذریعے اظہار بنایا اور نظم و نثر میں صوفیانہ افکار و نظریات کو عام کرنے کی سعی کی ہے بقول جمیل جالبی:

''امین الدین اعلی کی ساری تصانیف نظم و نثر کا موضوع تصوف و اخلاق ہے، تصوف میں ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے وحدت الوجود کے فلسفے کو مکمل کیا، اس تصوف کی بنیاد حدیث ''من عرف نفسه فقد عرف ربه'' (جس نے اپنے نفس کو ن پہچانا اس نے اپنے خدا کو پہچانا) پر قائم ہے اس میں عرفان نفس کے لیے وجود کے تمام مراتب کا عرفان حاصل کرنے کی

تعلیم دی جاتی ہے اور یہ تعلیم جانم سے زیادہ امین الدین اعلی کی جدت فکر ونظر کی مرہون منت ہے۔''(26)

ولیؔ دکنی:

ولی دکنی اردو شعر و ادب میں بلند مرتبت کے حامل شاعر ہیں۔ ولی نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے مگر ان کو صنف غزل میں اختصاص حاصل ہے۔ چنانچہ ولی کے یہاں تغزل کے حوالے پروفیسر شارب ردولوی رقم طراز ہیں:

۔''ولیؔ کی شاعری کی مقبولیت کا راز بھی ان کا تغزل ہے۔ ولیؔ کے کلام میں شروع سے آخر تک ایک خاص قسم کی کیفیت ہے اس کیفیت کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔''(27)

ولیؔ نے اپنے عہد کی تمام تر ادبی اور سماجی فکر ونظر کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ اس دور میں جو کچھ انہوں شاعری کے حوالے سے پیش کیا وہ اردو زبان و ادب کی ترویج وترقی میں معاونت کرتا رہا اور وہ ولی کا اسلوب قرار پایا۔ لہذا تصوف اس دور کے شعر و ادب کا لازم حصہ تھا چنانچہ نظریۂ وحدت الوجود سلوک ومعرفت کی راہ کے مسافر کے لئے اساسی حیثیت رکھتا تھا۔ ولیؔ کا رجحان بھی وحدت الوجود کی طرف مائل تھا اس ضمن میں سید نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں:

''چونکہ وحدت الوجود کے نظریہ کے مطابق صرف ذات ہی کا وجود حقیقی سمجھا جاتا ہے اور ماسویٰ اللہ محض ذہنی اور اعتباری ہے۔ اس لئے دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی بے اعتبار وغیرہ مضامین ولیؔ کے ہاں بھی بہت خوبی اور ایک جذبے کے ساتھ بندھے ہیں''۔ (28)

ولی نے 'وحدت الوجود' رجحان کے تحت دنیا کی بے ثباتی، کیف وسرور اور سرمستی کو ان اشعار میں پیش کیا ہے، شعر ملاحظہ فرمائیں:

یو بات عارفاں کی سنو دل سوں مالکاں
دنیا کی زندگی ہے یو وہم و خیال محض

....

ولی کوں نہیں مال کی آرزو

خدا دوست نئیں دیکھتے زر طرف

....

عیاں ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا
بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

....

جو سنیا تیرے دہن سوں یک بچن
بھید پایا نسخۂ اسرار کا

....

یوں شعر تیرا اے ولؔی مشہور ہے آفاق میں
مشہور ہے جیوں کر سخن اس بلبل تبریز کا

....

ولؔی ہے مست قدح راز دارِ وحدت کا
نہ حاجت اس کوں صراحی نہ ابتغائے قدح

ولؔی کی شاعری میں تصوف کے عناصر غالب ہیں۔فکری اعتبار سے ان کی شاعری کا دائرہ کار حسن وعشق کو محیط ہے کہیں کہیں کائنات کے اسرار اور زندگی کے رموز کا تذکرہ بھی مل جاتا ہے۔ ان کی شاعری داخلی شاعری کی غماز ہے اور عشقیہ کیفیات سے پر بھی۔۔اس بابت ساحل احمد نے لکھا ہے:

۔''ولؔی نے داخلیت پر خصوصی توجہ دی اور جہاں کہیں خارجیت کو موضوع بنایا ہے وہاں بھی داخلیت کو مرتکز کیا ہے جس کے سبب شعر میں گداختگی اور واقعیت پیدا ہوگئی ہے، ان کی یہی رمز شناسی تصوف کے دائرہ میں بھی دل کش معلوم ہوتی ہے ولؔی کا تغزل ذہنی تعیش پسندی کا مظہر نہیں بلکہ وہاں تخیل کی بالیدگی، تصوف کی رمزیت اور انسانی زندگی سے متعلقہ ذہنی وسلبی حقائق ہیں''۔(29)

تصوف میں عشق کو اعلیٰ مقام حاصل ہے اور وہ قربِ محبوبی کا محرک بھی ہے۔ولؔی کا تصورِ عشق میں مجاز وحقیقت نمائندگی

ملتی ہے ہیں۔ ولی کے یہاں عشق کی اہمیت اس وجہ سے بھی حاصل ہے کہ یہ ضرب بہ مجاز سے حقیقت کی طرف سفر کرتا ہے اور ولی کے یہاں عشق فن ہے اور اس فن کے جاننے والے کو عارف کہتے ہیں:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

....

مجھے بولیا کہ گر عشق حقیقی سوں توں واقف نئیں
تو بہتر یوں ہے جادامن پکڑ عشق مجازی کا

....

حقیقت کی لغت کا ترجمہ عشق مجازی ہے
ووپائے شرح میں مطلب ،نہ بوجھے جو متن ہرگز

....

درِوادیٔ حقیقت جن نے قدم رکھا ہے
اول قدم ہے اس کا عشقِ مجاز کرناں

....

اے ولی عشق ظاہر ی کا سبب
جلوۂ شاہد مجازی ہے

....

عارفاں پر ہمیشہ روشن ہے
کہ فن ِ عاشقی عجب فن ہے

ولی کی نگاہ میں ''عشق'' محبوب حقیقی تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور یہ ایسی آگ ہے جس سے ہر سالک کا دل گرم ہے۔ اس آگ کے بغیر سلوک کی راہ طئے نہیں کی جا سکتی۔ عشق میں آزمائش بھی ہے۔ نالہ و آہ بھی ہے۔ بے تابی و بے چینی بھی ہے، راز بھی ہے رموز بھی، سر بھی اسرار بھی غرض تمام مراحل عشق کی تپش سے ہی طئے ہوتے ہیں۔ ولی نے اپنے اشعار میں عشق کے مختلف

جلوے اور رنگ آشکار کیئے ہیں، اشعار ملاحظہ ہوں:

نالہ وآہ کی تفصیل نہ پوچھو مجھ سوں
دفترِ درد باعشق کے دیوان میں آ

....

کنج میں تجھ عشق کے جن نے کیا ہے مقام
اس کوں ٹوٹا بوریا تخت سلیماں ہوا

....

گرد ِ غم آب نین ، درد کے معمار نے لے
خانۂ عشق جگر سوز کوں تعمیر کیا

....

زبانِ قال نہیں طفل اشک کوں لیکن
زبان ِ حال سوں کرتے ہیں عشق کی تقریر

....

حق کے نزدیک اچھے گا سووہی خاص الخاص
جیوں چتر داغِ عشق کوں رکھ سر پر اپنے اولاً

....

ہر آشنائے عقل سوں بے گانہ ہو بے گانہ ہو
جسے عشق کا تیر کاری لگے

....

اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
جب سوں رکھا ہوں عشق کے آتش اُپرقدم

....

تب سوں مثال عود مرا جیو گداز ہے
عشق کے رمز سوں نہیں آگاہ

سلوک و معرفت میں عشق کی گرمی ضروری قرار دی گئی ہے۔ کیونکہ اس راہ کے مسافر کو منزل تک پہنچنے کے لئے مختلف مشکلات و کیفیات سے گزرنا پڑتا ہے۔ ولیؔ نے عاشقوں پر گذرنے والی کیفیات، مصائب و آلام کے ساتھ ساتھ عشق کے مدعا کو بھی کو اپنے اشعار میں کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

عاشق سوں جا کے پوچھو معشوق کی حقیقت
مخفی نہیں ہے خوبی جوہر کی جوہری سوں

....

دل عشاق کیوں نہ ہوے روشن
جب خیال صنم چراغ ہوا

....

زبس تیغ نگاہ شوخ سرکشی کی ہے خوں ریزی
نگاہ چشم قربانی نمسط حیراں ہوئے عاشق

....

بجز وجدانِ دلبر کئی نہ پاوے حال عاشق کا
تو میرے راز کے نامے ستی آگاہ قاصد نئیں

....

مدعائے عاشقاں ہر آن ہے دیدار یار
یار کے دیدار بن دوجا عبث ہے مدعا

....

ولیؔ جنت میں رہنا نہیں درکار عاشق کوں
جو طالب لامکاں کا ہے اسے مسکن سولی کیا مطلب

....

گلزار زندگی میں بجز وصل سروقد
عشاق کوں نہیں ہے دوجا مدعا بلند

ولی نے دل کے مقام و مرتبہ کو صوفیانہ انداز میں بیان کیا ہے وہ دل کو خدا کا مسکن، مخزن اسرار، جہازِ عشاق، اور قرآن وغیرہ کا مقام بھی دیتے ہیں۔صوفیہ کے یہاں صفائی قلب کی اہمیت مسلم ہے جس کے بغیر قرب اور دیدارِ الٰہی ممکن نہیں۔ ولی نے مقام دل، صفائے قلب اور دیدار کی کیف و مستی کے کئی اسرار بیان کئے ہیں۔چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

کیا کہے تعریف دل، ہے بے نظیر
حرف حرف اُس مخزن اسرار

....

ہے اے ولی پرت سں معمور کعبہ دل
تیئں باج حق کے دو جادل کے حرم کا محرم

....

ہے پہنچنے کا ساماں کعبے کوں مدعا کے
دریائے عاشقی میں دل کوں جہاز کرناں

بولے ہیں اہل دل نے یہ بات تہہ دلی سوں
عارف کا دل بغل میں قرآن ہیکلی ہے

....

نکال خاطر فاتر سے جام جم کا غم
صفا کر آئینہ دل سکندری یہ ہے

....

خیال خام کوں جو کئی دھووے صفحۂ دل سوں

تصوف کے مطالب کوں وہ مشکل کر نہیں گنتے

....

پاک بازی میں دل کوں ہے عزت
صافی درپن آب درپن ہے
مرا دل پاک ہے از بس، ولؔی زنگ کدورت سوں
ہوا جیوں جوہر آئینہ مخفی پیچ و تاب اسکا

....

ہے بس کہ تیری تیں میں کیفیت مستی
یک دید میں کونین کوں بے ہوش کرے توں

....

بخشا ہے تری نین نے کیفیت مستی
تجھ مکھ نے خبردار کیا بے خبری کوں

اصطلاحِ صوفیہ میں مقامِ حیرت اور بے خودی کی اپنی اہمیت ہے جہاں کسی بھی چیز پر سالک کی توجہ نہیں ہوتی بلکہ اُس کا قلب ونظر تجلیات الٰہیہ کی فراوانی میں گم ہوجاتا ہے۔ ولؔی نے بھی عاشق پر طاری ہونے والی اس کیفیتِ ''حیرت'' اور بے خودی کو مختلف طرز میں پیش کیا ہے:

کرے عشاق کوں جیوں صورت دیوار حیرت سوں
اگر پردے سوں واہوائے جمال بے حجاب اس کا

....

وحدت کے مے کوے میں نہیں بار ہوش کوں
اس بے خودی کے گھر کی طرف سدھ کو ڈال چل

....

لیا ہے جب سوں موہن نے طریقہ خود نمائی کا

چڑھیا ہے آر سی پرتب سوں رنگ حیرت فزائی کا

....

دیکھا ہے یک نگہ میں حقیقت کے ملک کوں
جب بے خودی کی راہ میں دل نے سفر کیا

....

ہر جھلک دیتی ہے تجھ رخسار کی
آر سی کو درس حیرانی ہنوز

....

نشہ بخش عاشقاں وہ ساقیٔ گل فام ہے
جس کی انکھیاں کا تصور بے خودی کا جام ہے

....

جب سوں اے آئینہ رودیکھی تری تصویر کوں
گل رخاں تب سوں ہوئے تصویر حیرت کی قسم

جذب و بے ہوشی، ''وصل وفراق''، ''شان یکتائی''، ''رضا''، توکل، ''یقین''، ''فقر''، ''فنا فی اللہ'' وغیرہ کیفیات کا اظہار ولیؔ نے کچھ اس طرح کیا ہے، شعر ملاحظہ ہوں:

تجھ نگاہ مست سوں حاصل ہے مدہوشی مجھے
تجھ لبِ خاموش نے بخشی ہے خاموشی مجھے

....

ولیؔ وصل و جدائی سوں سجن کی
کبھو صحرا ، کبھو گلزار ہیں ہم

....

ایسا بسا ہے آکر تیرا خیال جیو میں
مشکل ہے جیو سوں تجھ کو اب امتیاز کرنا

....

وہیچ پاوے مطلب راضیۃً مرضیۃً
محض للہ جگ میں جو اعمال پنہانی کرے

....

قسمت تری ہے حق پہ نہ ہونا امید یھاں
نہیں اس قفل کوں غیر توکل کلید یھاں

....

صدق ہے آب و رنگ گلشن دیں
پاک بازی ہے شمع راہِ یقین

....

تب مسیحا فقر کے خط کوں سیکھے گا تجھ نزدیک
مشق کرنے فقر کی جب لوح پیشانی کرے

....

دیکھے گا ہر اک آن تری جلوہ گری کوں
پایا ہے تری مہر سوں جو دیدہ دری کوں

....

وہ محبت میں تری فانی ہوئے
روز و شب جو محو حیرانی ہوئے

....

عشق میں لازم ہے اول ذات کوں فانی کرے

ہو فنا فی اللہ دائم یاد یزدانی کرے

ولیؔ دکنی کی شاعری کا مطالعہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ کہ اُن کے کلام میں صوفیانہ عناصر کی ضوفشانیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ بالخصوص ولیؔ کے یہاں حسن وعشق کے حقیقی تصورات ملتے ہیں جن کے مطالعہ سے ولیؔ کے صوفیانہ مزاج کی آئینہ داری کرتا ہے۔☆

قاضی محمود بحریؔ:

قاضی محمود نام، بحریؔ تخلص ۔ ولی دکنی کے معاصرین میں قاضی محمود بحری کا شمار ہوتا ہے۔ اصل نام قاضی محمود اور بحری کے نام سے معروف ہیں۔ ان کے والد بحر الدین جو ''قاضی دریا'' کے لقب سے مشہور تھے اور وہ گوگی کے رہنے والے تھے۔ گوگی شاہ پور سے متصل موضع ہے۔ قاضی محمود کی تاریخ ولادت کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ تذکروں میں آتا ہے کہ کچھ عرصہ انہوں نے بیجاپور میں گزارا۔ شاید اسی وجہ سے ان کے کلام میں سنسکرت الفاظ ملتے ہیں چونکہ اس دور میں بیجاپور اور اس کے نواح میں سنسکرت زبان کا اثر زیادہ تھا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد حفیظ سید لکھتے ہیں:

> ''شاید اُس زمانے میں بیجاپور اور اُس کے نواح میں عربی و فارسی کی نسبت سنسکرت الفاظ زیادہ رائج تھے۔ ظاہر ہے کہ اورنگ آباد میں جو زبان بولی جاتی تھی وہ بیجاپور کے اضلاع کی رائج الوقت زبان سے مختلف تھی''۔(30)

قیام بیجاپور کے دوران قاضی محمود بحری کے یہاں علمی ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ لہٰذا جب وہ حیدرآباد کے سفر کا ارادہ فرمایا اور اپنے ساتھ اپنا علمی اساسہ بھی ساتھ لے چلے، جو حیدرآباد کے سفر کے دوران لٹ گیا۔ اس حادثہ کا ذکر حفیظ سید نے یوں کیا ہے:

> ''(بحریؔ قیامِ بیجاپور میں) اردو فارسی میں بہت سی مثنویاں، غزلیں، رباعیاں اور قصیدے تصنیف کر چکے تھے۔ کل اشعار کی تعداد کا اندازہ پچاس ہزار کیا جاتا ہے۔ حیدرآباد کے سفر میں ڈاکوں نے ان پر حملہ کیا اور انکا تمام سامان غارت کر دیا، ان کا تمام کلام بھی اسی حادثہ کی نذر ہو گیا''۔(31)

جب اس حادثہ کی خبر امیر کو پہنچی تو اس نے بحریؔ سے ہمدردی کا اظہار کیا، اور گزارش کی کہ آپ کوئی ایسی تصنیف

تصنیف فرمائیں جو دنیا میں اعتبار پا سکے۔ چنانچہ انہوں نے مثنوی، ''من لگن'' تصنیف فرمائی۔ اس تخلیق کو کافی پذیرائی حاصل ہوئی اور قاری اس سے مستفیض رہا۔ مثنوی کے اشعار کے مطالعہ سے بحری کے اساتذہ اور تعلیم وغیرہ سے واقفیت ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر حفیظ سید نے مقدمہ ''کلیاتِ بحریؔ'' میں اس کا تذکرہ یوں فرمایا ہے:

> ''یہ مثنوی 1112ھ مطابق 1700ء میں تکمیل کو پہنچی، انہیں اشعار میں انہوں نے سچے دل سے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ وہ فن شاعری اور اصطلاحات سخن سے واقف نہیں تھے، انہوں نے نہ تو کسی اُستاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، نہ وہ کسی عالم وشاعر کی صحبت سے فیضیاب ہوئے اور نہ تجربہ حاصل کرنے کیلئے دور دراز ممالک کا سفر ہی کیا''۔(32)

بحریؔ اپنے وطن گوگی میں ۱۵؍اگست ۱۷۱۸ء اس دار فانی سے کوچ کیا۔

بحریؔ شاہ محمد باقر کے مرید و خلیفہ تھے، بحریؔ کے حلقہء ارادت میں سکندر عادل شاہ بھی شامل رہا۔ بحریؔ اپنے مرشد سے بہت عقیدت رکھتے تھے اور اپنی مثنوی، من لگن، میں نہایت عجز و انکسار سے اپنے مرشد سے دستِ طلب کرتے ہیں:

مولا　کے　محب　، نبی　کے　نائب
مانس　نہیں،　مظہر العجائب

....

تر　لوک　اُپر　تری　امیری
درحال　کرے　تو　دستگیری

....

سب　چھوڑ　پکڑ　پڑا　ہوں　کونا
یا　پیر　تو　دستگیر　ہونا

بحریؔ اپنے علاقے میں ایک شاعر سے زیادہ صوفی کامل کے طور پر مشہور ہوئے اور یہ شہرت آج بھی قائم ہے، ان کے مزار پر ہر سال عرس منایا جاتا ہے جس میں عقیدت مندوں کا ایک جمِ غفیر رہتا ہے۔ محمود بحری کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں جن کے مطالعہ سے سے کیفیتِ عشق کا اظہار ہوتا ہے:

اس عمر میں عشق جیو میں جاگ
یوں گھیر لیا جیوں بھیڑ کو باگ

....

یو عشق برا ہے یا بھلا ہیو
دیو ہے بھوت ہے یا بلا ہے

....

لڑکائی تھی مجھ اُپر مسلّم بولو
تو یہی جو عشق کا غم

....

یا مجھ میں نواہوا ہے پیدایا
جگ میں اول تے ہے ہویدا

قاضی محمود بحریؔ عشق وحال کے بزرگ تھے اس لیے ان کی شاعری میں رنگِ تصوف نمایاں ہونا عینِ فطرت تھا۔ چنانچہ ان کا کلام صوفیانہ افکار ونظریات کی غمازی کرتا ہے۔ سید اعجاز حسین اعجاز مثنوی ''من لگن'' کے متعلق فرماتے ہیں:

''یہ مثنوی سر سے پیر تک تصوف میں ڈوبی ہوئی ہے، کہیں کہیں حکایت وتمثیل میں تصوف کے نکات بیان کئے ہیں مگر زیادہ تر صفحے کے صفحے تصوف کے مختلف عنوان پر لکھے ہوئے ہیں، توحید، روح، انسان، عرفان، نفس، دل، عشق وغیرہ جو اہم مسائل ہیں سب کے متعلق کچھ نہ کچھ خامہ فرسائی کی ہے''۔(33)

بحریؔ کے کلام سے چند اشعار کا انتخاب کیا جاتا ہے جن کے مطالعہ سے تصوف کے کئی رنگ نمایاں ہوتے ہیں:

اے جو تجھ نے جلوہ گریو جیو ہور یو تن ہوا
تن ہوا جنوں کو ں یو جیو تجھ درپن ہوا

....

ہے تو یوں ہے تو ہم ہور تم
تیئں تو بونیں جو اوچ سب نیں

....

یک تو نہیں، کیا کام جو سب ہے یارب
سب کیا تو، اور ذرے ہیں تو رب ہے یارب

....

نیں بات تیرے چک پہ چک دیدیاں کی دولت سوں مرے
یودل جو تھا سو خلوتی یک تل میں بازاری ہوا

....

دیکھنا تھا جگ کوں گر یک جام وحدت کا جمال
جام میں جگ کی خیر پایا جو کہتے ہیں جسم ہوگیا

....

سچ عاشق توں وحدت عشق پر بی
یوں کثرت اس کی ات گت ولوے پر

....

میں معما ہوں یک بڑا اے دوستکھول
سکے سے نہ منجہ بن اُن ہو ران

....

سب کے اوپر ہے حق بڑاا لحق
میں بلا دور اس اپر کِھن کِھن

اس انتخاب کا پہلا شعر ’حقیقت روح‘‘ کو بیان کرتا ہے تو دوسرا اور تیسرا شعر وحدت الوجود اور شہود کی طرف اشارہ ہے۔شعر چار تا چھ میں ’’وحدت در کثرت‘‘ کا اظہار ملتا ہے تو سات اور آٹھ عظمتِ انسانی کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔

مثنوی ''من لگن'' کے بیشتر اشعار میں انہوں نے ''انسان'' کی مختلف صفات جیسے لا یموت، جاوداں، مظہر خدا اور اشرف المخلوقات وغیرہ بیان کی ہیں، غرض ان کا کہنا ہے کہ انسان کا مرتبہ تمام مخلوقات میں برتر اور بلند تر ہے، کہتے ہیں:

یو جگ　ہے　جدید　آدمی　آد
اس　گھر کو　یو　آدمی　ہے　بنیاد

....

اس　آدمی　بیچ　کیا　کمی　ہے
سدگیان　کی　صورت　آدمی　ہے

....

تھا　آدمی　آد　میں　مکرم
اب　کیا　تو　کہو　طلسم　اعظم

....

انجام　کہتے　تو　اے　برادر
نامرگ　اسے　ہوسکے　نہ　محشر

....

یعنی　نہ　یو شمس　ناقمر　ہے
اللہ　کے　امر　سوں　امر　ہے

....

جیو　کیا　جن　کون　سو یو جگ　ڈھنڈے　کیا　جانتے
پوچھنا　ان　کوں،　سوجاننا　سیاں　کوں　پوچھنا

''خودی و بیخودی'' کے اسرار بھی مثنوی ''من لگن'' میں بیان ہوئے ہیں:

اس　وقت　میں بیخودی　سو　ہے　گا
یو خود　نہیں　نور　ہے　خدا　کا

....

تو لے یہ خودی خدا کی سوگند
جس خاص خودی سوں آشنا ہوا

بحری ایک صاحب دل صوفی تھے اور تصوف کے اسرار و رموز کو جانتے تھے چنانچہ ان کلام میتں ''مقام دل''، فنا و بقا، عشق کی سرمستی اور وصل وفراق کی کیفیت اور تزکیہ نفس وغیرہ اصطلاحات کو بحسن وخوبی اپنی شاعری میں پیش کرتے ہوئے صوفیانہ جذبات واحساسات کو مترشح کیا ہے:

بحریا کر دل کوں گھٹ چپ ہر کدھر دوڑ انکو
گر کچیک بستی تو یو ہے اس سوں آگل سب اُجڑ

....

بن پتنگ آپ سے فنا کرتا
روپ میں روپ، بلکہ رنگ میں رنگ

....

اس فنا میں جسے بقا کا بھید ہے سو بحریا جیوتے
مرگئے سوجا اس مرجیاں کو پوچھنا

....

گرچہ یک عشق سونچ سچر یا ہے
باس بلبل میں ہور پتنگ میں رنگ میں

....

ہت لے کز لک کمال وحدت کا چھل
سٹے دل نے وصل ہور دوری

....

نفس جنوں عزا ہے عزت دے نکور کھ سرپہ لات

لات بھی لائق نہیں ہے بن ماکھی ہورلات کچھ

بحریؔ ایک روشن دل صوفی اور عشق حقیقی کے سرمستی کے اسرار سے واقف تھے، چنانچہ وہ عشق کی حقیقت، افادیت اور اہمیت سے بخوبی واقف تھے،لہذا اُن کا کلیات تصوف کے اسرار و رموز اور معرفت وسلوک کے اشعار سے پر ہے، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ انکے کلیات میں تصوف کے مختلف النوع موضوعات پر اشعار ملتے ہیں اور مثنوی ''من لگن'' تو اُن کے صوفیانہ افکار کی معراج ہے۔☆

داؤد آورنگ آبادی:

داؤد اورنگ آبادی کی ولادت کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی کا خیال ہے کہ وہ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ اور محی الدین قادری زور نے لکھا ہے کہ

''ولی اورنگ آبادی کا کم عمر ہم عصر تھا جو ان کے بعد بھی عرصہ تک زندہ رہا اور سنہ 1754ء میں وفات پائی۔اس کے آباء و اجداد بلخ سے عہد اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور ولی کی طرح اس شہر کی علمی و ادبی فضا سے متاثر ہوئے۔ولی نے آکری زمانے میں اپنے کلام میں جو پختگی اور زبان میں جو ہمہ گیریت پیدا کی تھی داؤد نے اس کو اور آگے بڑھایا۔وہ خوش آواز تھے اور جب مشاعرے میں غزل سناتے تو ان کی آواز کی دلکشی پر لوگ جھوم جھوم جاتے۔وہ پر گو شاعر نہیں تھے لیکن ان کے ہم عصر ان کے کمِا سخن کے بڑے مداح اور معترف تھے۔''(34)

داؤدؔ کی حیات، تعلیم، اور تلمذ کے سلسلہ میں کوئی خاص معلومات نہیں ملتے اس ضمن میں محققین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے ہے، اورنگ آباد کے علمی و ادبی اور اس دور کے علماء و ادباء کی صحبت فیض نے ان کی صلاحیتوں کو سنوارا۔ دیوان داؤد اورنگ آبادی کی مرتبہ خالدہ بیگم نے داؤدؔ کی تعلیم اور شعر گوئی کا جائزہ لیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''داؤدؔ کی باقاعدہ تعلیم نہیں ہوئی تھی بلکہ انہوں نے اپنی افتادِ طبع اور فطری صلاحیت کی بناء پر شعر گوئی کا آغاز کیا تھا اس کے علاوہ اورنگ آباد اس زمانے میں شعر و ادب کا مطلع انوار بنا ہوا تھا، مولف محبوب الزمن اور مولف تذکرہ شعرائے اردو اورنگ

آباد نے متفقہ طور پر داؤد کی لیاقتِ شعری کا نکھار علماء وفضلاء کی محبت بتلائی ہے۔
شعر گوئی اور شعر فہمی کے اس ماحول کے علاوہ خود ان کا ذوقِ فطری نور علی نور ہو کر
سونے پر سہاگہ کا کام کر گیا اور چند ہی روز میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہو گئے"۔

(35)

مذکورہ بالا اقتباس اور کلام داؤد سے یہ بات نما ہوتی ہے کہ مشق سخن کے ذریعے اس مقام تک پہنچے ہیں جس کا اظہار اپنے شعر میں کچھ اس طرح کرتے ہیں:

مجہ کوں کچھ علم نہیں ہے وہ خدا آپ علم
شعر کہنا مجھے داؤد خداداد آیا

داؤد نہ صرف ولی کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں بلکہ ان سے حد درجہ عقیدت کا اظہار اور ان کے اثرات ان کے کلام میں جا بجا نظر آتے ہیں اور اپنے کو ولی ثانی کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں:

علیؓ کی ہے قسم! سن شعر میرا
کہے عالم ولؔی ثانی یہی ہے

....

ولؔی ثانی نہیں داؤد لیکن
غزل کہتا ہے ہر ایک با تلازم

....

حق نے بعد از ولؔی مجھے داؤؔد
صوبۂ شاعری بحال کیا

....

کہتے ہیں سب اہل سخن اس شعر کوں سن کر
تجھ طبع میں داؤؔد دو ولؔی کا اثر آیا

....

بعد از ولؔی ہوئے ہیں کئی شاعراں، و لیکن
داؤدؔ شعر تیرا مشہور ہے دکن میں

داؤد کے کلام کے مطالعہ سے یہ بات یقین کے کہی جاسکتی ہے کہ ان کے رنگِ سخن میں ولی کے اثرات نمایاں نظر آنے لگتے ہیں۔اس کے علاوہ تصوف کے عوارف ومعارف بھی داؤدؔ نے ولؔی سے اخذ کرتے نظر آتے ہیں:

راست اے داؤدؔ کہتا ہے ولی
عشق میں صبر و رضا درکار ہے

....

پڑھو ناصح ان کے مصرع ولؔی کا
نصیحت عاشقاں کوں کب رواہے

....

ولایت کے ہے دفتر سوں وہ منکر
رکھے جو نام دیوانِ ولؔی کوں

داؤدؔ کے کلام میں تصوف کا مزاج اور تصوف کے مضامین بھی ملتے ہیں۔انہوں نے جگہ جگہ اپنے کلام کو صوفیانہ افکار ونظریات سے متصف کرتے ہیں اور عشق کی بالادستی کے قائل بھی ہوجاتے ہیں۔اس سلسلہ کے اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

میرے یوفکر عالم بالاسوں گئی گذر
مجہ شعر کوں پسند اب اے سروقد کرو

....

تجہ کوں شاعری کہیں کہ ہے مجذوب
معنہ اس شعر کے وہ کیا جانے

....

عشق میں داؤدؔ جو ہے پاک باز

رمز میرے شعر کا پانے لگا

....

جذبۂ عشق مت کہہ اے داؤدؔ
جو کہ داؤدؔ اہل راز نہیں

....

گوہر شناس بحر معانی ملا ہے یار
دل کے صدف سوں کیوں نہ نکالوں سخن کے تیئں

....

گر چاہتے ہو عشق میں ذکر صمد کرو
احمد کا میم لے کے اُو سے بھی احد کرو

اگر چہ داؤدؔ کے دیوان میں صوفیانہ اشعار کی کثرت تو نہیں ملتی تاہم صوفیانہ اشعار کی کمی بھی محسوس نہیں کی جاسکتی۔ داؤدؔ نے اپنے پیش رو ولی دکنی کی طرح عشق حقیقی کے نقش ہائے رنگ رنگ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔اپنے کلام میں انہوں نے عشق کو استعاراتی طور پر پیش کرتے ہوئے اس کی راہ میں آنے والے مصائب و آلام کا ذکر کیا ہے اور ولی کی طرح مجاز سے حقیقت کی جست کا اظہار کیا ہے:

عشق نے تجھ خال کے مجھ کوں خیالی کیا
دل کوں خیالات سوں غیر کے خالی کیا

....

شمع جاں سوز عشق بازی ہے
جس کے شعلے سوں تن گدازی ہے

....

عشق میں درد و بلا درکار ہے
سو سنا جو روجفا در کار ہے

....

آتشِ عشق سوں جو جلتا ہے
ووسدا مثل شمع گلتا ہے

....

لذت عشق جس کوں ہوتا ہے
شوق میں پیو کے عمر کوتا ہے

....

جس کو تحصیل علم عشق نہیں
تجہ درس کی کتاب کیا جانے

....

جگت میں جس نے علم عشق حقیقی کا کیا حاصل
لیا ہے درس اول نسخۂ عشقِ مجازی کا

داوٗد نے مقامِ دل کو غواصِ بحرِ معرفت قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ قلب کی صفائی سے دیدار انوار کی جلوہ گری ہوتی ہے اور وہ دل بصیرت آمیز ہو جاتا ہے۔ داوٗد نے دل اور اس کے متعلقات کو شعری حسن کے زیور سے آراستہ کیا ہے یعنی، دل کے مقام کو صوفیانہ نظریات سے مترشح کیا ہے، اشعار دیکھئے:

اے دل غواصِ بحر معرفت ہو
میسر گوہر مقصد ہے دم میں

....

خیال یار جب سوں دل نشین ہے
مرا دل تب سوں مثل دو بین ہے

....

سینہ صافی سوں مثل درپن کر

شمع فانوس دل کی روشن کر

....

صاف کر دیکھ دل کے درپن کو
ہیت پری اوس میں جستجو مت کر

....

صاف ہو دیکھ یار ہے من میں
عکس جیوں جلوہ گر ہے درپن میں

مقام حیرت اور اس کی کیفیت، تجلیات الٰہیہ میں گم ہونا جس کے ذریعے سالک جذب کی کیفیت میں آجاتا ہے ان اظہار بھی ان کے یہاں ملتا ہے۔ان کیفیات کا اظہار اپنے اشعار کے حوالے سے سادگی اور روانی کے ساتھ کرتے ہیں۔شعر ملاحظہ ہوں:

صافی تیرے حسن کی کون سکے کر بیاں
دیکھ کے تیرا جمال آئینہ حیران ہوا

....

دیکھ کر آئینہ تجھ کوں محو حیرانی ہوا
تاب سون تجھ حسن عالم تاب کی پانی ہوا

....

جو کیا جامِ عشق کی مئے نوش
عالم ہوش سے ہوا بے ہوش

....

اے ساقی بدمست مئے عشق نے تیری
لے ہوش مجھے ہوش سوں بیہوش کیا ہے

....

جو　باده　محبت　کاتری　نوش　کیا　ہے
یک　بار　دوعالم　کوں　فراموش　کیا　ہے

داؤد صوفی نہ سہی مگر ان کی زندگی صوفیانہ ماحول میں گزری ہے۔ اٹھارویں صدی کا اورنگ آباد میں صوفیانہ اقدار غالب تھے لہذا اس دور کے تمام شاعروں کے یہاں صوفیانہ اقدار و اخلاق کی مثالیں دیکھیں جاسکتی ہیں۔ داؤد نے ''خودی ، بے خودی'، عرفانِ خودی، معرفت، قناعت،' حق، چشم نظر وغیرہ کی مختلف کیفیات کو شعر کے زیورِ حسن میں پیش کیا ہے:

اول　خودی　کے　گھر　کو　اے　داؤد　توڑ　سٹ
میخانہ　وصال　میں　تب　سده　بھار　چل

....

ہاں　مبارکباد　اے　عشاق　عیش　بے　خودی
مست　ہولے　جام　مئے　آتا　ہے　ساقی　بے　حجاب

....

آپ　سوں　بے　خود　و　بے　ہوش　ہے　نت　اے　داؤد
عشق　کے　نشہ　کی　کھایا　ہے　جینے　معجون　کوں

....

سراغ　اپنا　نہیں　پاتا　ہو　میں　آپ
ہو　اہوں　اس　قدر　اپنے　سے　گم

....

جو　شمار　نفس　سوں　واقف　نیں
معرفت　کا　حساب　کیا جانے

....

جو رکھا　ملک　قناعت　بیچ　ہو　ثابت　قدم
اوس　کوں　نقش　بوریا　تخت　سلیمانی　ہوا

....

حرف حق مت بول مخفی دل میں رکھ
گرچہ تیرا صدق جیوں منصور ہے

....

مست ہے جس کے ایک دور سوں دل
چشم نیں بے خودی کا پیالا ہے

....

خواب غفلت میں نہیں ہوشیاری
چشم بیدار جو ہوے سو دیکھے

....

بجا ہے گر کرے عاشق کوں ایک دور میں مست
ہے جامِ چشم صنم میں شراب بے ہوشی

''خودی'' بے خودی اور عرفان خودی کا تصور ابتداء ہی سے شعر و ادب میں پایا جاتا ہے۔اس کے علاوہ معرفت الحق کی تلاش صوفیوں کا شیوہ رہا ہے اور چشم کی اصطلاح اردو شاعری میں مقبول رہی ہے کہیں یہ اصلاح مجاز کے لیے تو کہیں حقیقت کے لیے بھی مستعمل رہی ہے۔محولہ بالا کلام داؤد اورنگ آبادی کی صوفیانہ شاعری کی غمازی کرتا نظر آتا ہے۔لہذا انہوں نے تصوف کی ان اصطلاحات کو اپنے کلام میں استعمال کیا ہے۔غرض داؤد کا طرزِ اظہار دلکشی لیے ہوئے ہے اور ان کے یہاں ولی کی طرح مجاز کا بیان بھی حقیقت کا روپ لیے نظر آتا ہے، کیونکہ وہ عشق کے شغل کو افضل رکھتے ہیں۔☆

سراجؔ اورنگ آبادی:

سراج اورنگ آبادی ایک مذہبی خاندان کے چشم و چراغ تھے میں۔محی الدین قادری زور کے مطابق ان کے والد سید درویش ابن سید گوہر مدینہ کے ایک بزرگ سید محمد کی اولاد میں تھے جو ہندوستان آکر دہلی کے نواح میں قیام پذیر ہوئے تھے بعد کو ان کی اولاد دکن میں آبسی تھی۔اورنگ آباد میں سنہ 1711ء میں ان کی ولادت باسعادت ہوئی تھی۔سراج نے بارہ سال کی عمر میں علوم متداولہ کی تعلیم مکمل کر لی۔اس زمانے میں ان پر کیف و مستی کی کیفیت طاری ہوا کرتی اور بے اختیار اشعار منہ

سے جاری ہوجاتے۔ بے خودی کے عالم میں وہ گھر سے نکل کھڑے ہوتے۔ رات دن صحرا نوردی کرتے اور زیادہ تر وقت شاہ برہان الدین غریب کے مزار پر گزارتے۔(36)

سراج اورنگ آبادی کی حیات کے اوراق کا مطالعہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ سراج ابتداء ہی سے راہ سلوک و معرفت کے لیے بنے تھے لہذا ان کے مزاج میں صوفیانہ افکار کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جاسکتا ہے۔اس سلسلہ میں ان کے لڑکپن کے واقعے کو محمد عبدالجبار خان ملکاپوری نے نقل کیا ہے جس کو خود سراج نے بیان کیا تھا وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ فقیر بارہ برس کی عمر میں جوش جذبہ و غلبہ شوق سے سات برس تک برہنہ تن و برہنہ سر رہا۔ اکثر اوقات عالم بے خودی میں حضرت شاہ برہان الدین غریب دولت آبادی کے روضے کے اطراف گھومتا تھا''۔ (37)

سراج اورنگ آبادی کو راہ معرفت کی سمت عطا کرنے میں ان کے پیرو مرشد حضرت شاہ عبدالرحمن چشتی کا اہم رول رہا ہے جب بیعت و خلافت سے سرفراز ہوئے تو ان کے مزاج میں روحانیت کے غلبہ کو استحکام پہنچا۔ بقول ڈاکٹر صدیق محی الدین:

> ''اسی زمانے میں حضرت شاہ عبدالرحمن چشتی سے اُن کی ملاقات ہوتی ہے۔سراؔج کی طبیعت پر ان کے روحانی فیضان کا غیر معمولی اثر ہوا،سراؔج کا متاثر ہونا، تعجب کی بات بھی نہیں کیونکہ سراج خود ابتداء ہی سے اسی راہ کے مسافر تھے اور اب انہیں ایک صحیح رہبر و رہنما بھی مل گیا تھا۔سراؔج نے 1146ء ہجری یا 1147 ہجری میں شاہ عبدالرحمن سے بیعت کی اور انہیں اپنا روحانی مرشد و پیشوا قبول کیا''۔(38)

سراج اورنگ آبادی نے اپنے پیر کی عظمت کا اظہار اپنے کلام میں کچھ اس طرح کیا ہے:

مشعلِ سوزِ جگر ہے ہر غزل میری سراج
شمع دل روشن ہے فیضِ شاہ رحماں کے طفیل

....

دیکھا ہے جب سیں مصرعہ موزون و قدِ یار
اس دن سیں سراؔج نے فکر غزل کیا

....

گنجِ مخفی میں آشنا ہے سراؔج
جب سیں ہوئی ہے نگاہ رحمانی

سراج اورنگ آبادی کی شخصیت کا پرتو ان کی شاعری میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔سراؔج کی شاعری میں صوفیانہ عناصر سے پر اور اسرار و معرفت کی آئینہ داری معلوم ہوتی ہے سراج کی شاعری صوفیانہ شاعری کا نقطہ آغاز تھا جس کا نقطہ عروج درد کی شاعری کو کہا جاسکتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''سراج کی شخصیت کی تعمیر میں جن عناصر نے حصہ لیا تھا، ان میں عالم جذب و کیف سے پیدا ہونے والی ''محویت'' نے بنیادی رنگ بھرا تھا،عشق کے غلبے نے نشہ بے خودی کو جنم دیا تھا، فارسی زبان و ادب کے گہرے شغف نے اظہار کے وسیلوں کو بہتر و موثر بنانے میں مدد دی تھی''۔(39)

سراؔج کے کلام میں تصوف کی اصل روح کارفرما نظر آتی ہے، وہ صوفی منش انسان تھے ساری زندگی صوفیانہ عقائد پر سختی سے کاربند رہے۔عشق حقیقی کے جذبات کے لئے انہوں نے شاعری کو وسیلہ اظہار بنایا۔اس شعری اظہار کے لیے ولی دکنی کو اپنا آئیڈل بنایا۔لہذا ولی کی روایت کے حقیقی جانشین کہلائے اور ولی کی وراثت کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔سراج کے ایک شعر سے ولی دکنی کی سخن فہمی کے قائل نظر آتے ہیں۔اس کے علاوہ درج ذیل تعلیٰ آمیز شعر کہہ کر وہ خود بھی بطور نعمت اپنی اہمیت اور شہرت کا اعلان کر رہے ہیں:

تجھ مثل اے سراؔج بعد ولیؔ
کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

....

سراؔج لطف ترے شعر کا وہی پاویں
جو کوئی عقل و شعور و قیاس رکھتے ہیں

....

ہر مصرعۂ موزوں سلکِ گہر ہے اے سراؔج
بازارِ عالم میں نہیں کوئی تجھ سخن کا جوہری

اپنے وقت کے دکنی محقق عبدالقادر سروری نے سچ ہی کہا ہے کہ:

''سراجؔ کے زمانے تک اس میں شک نہیں کہ ولیؔ کی شاعری کے الفاظ، اسالیب استعارات وتلمیحات میں تھوڑی سی تبدیلی یا وسعت پیدا ہو چکی تھی، تاہم سراجؔ نے مجموعی طور پر غزل میں ولیؔ کی روایات کو حتی الامکان قائم رکھا۔ اسی لئے ان تبدیلیوں اور سراجؔ کے ذاتی عنصر کو علیحدہ کر کے دیکھئے تو دونوں کی شاعری میں بہت کم بنیادی فرق نمایاں ہوگا''۔(40)

سراج اورنگ آبادی کا مزاج ومنہاج صوفیانہ رنگ میں رنگا ہوا تھا،لہذا ان کا کلام بھی اسی رنگ کی غمازی کرتا ہے۔ایک صوفی منش انسان دنیا وآخرت سے بےخبر رہتا ہے اور وہ صرف اللہ کا عرفان اور دیدار کا طلب گار ہوتا ہے۔ظاہر ہے سراج کی بھی طلب دیدار یار اور قرب الہٰی رہی ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنے کلام کے ذریعے کیا ہے:

الٰہی مجھے محرم راز کر
خزانے حقیقت کے سب باز کر

....

شریعت کے مذہب کی منزل دکھا
طریقت کے مشرب کی محفل دکھا

....

حقیقت کے دریا میں غواص کر
اپس معرفت میں مجھے خاص کر

....

تماشا دیکھا باغِ عرفان کا
کروں سیر وحدت کے میدان کا

....

دیکھا مجھ کو دیدار بے ہوش کر

یہ بیہودہ گوئی سیں خاموش کر

....

دل مراتجہ چشم کی گردش میں ہے بیمار آج
اے طبیب مہرباں دے شربت ِ دیدار آج

....

یا الٰہی مجھ کوں دکھلا جلوۂ رخسارِ یار
اب تلک پایا نہیں ہوں شربتِ دیدارِ یار

سراج اورنگ آبادی، ولی کی طرح نظریہ وحدت الوجود کے قائل ہیں مگر باوجود اس کے ان کے کلام میں وحدت الشہود کی بھی جلوہ سامانی نظر آتی ہے۔اس کے علاوہ ان کے یہاں بھی عشق مجازی سے عشق حقیقی کے جست لگانے کا احساس پایا جا تا ہے۔عشق کو ہی اصل قرار دیتے ہیں اور سلوک وعرفان کی منزل کو حاصل کرنے کے لیے جذبہ عشق کو ہی اہمیت دیتے ہیں اس کے علاوہ راہ سلوک کے مصائب وآلام، وحدت کا جام، عشق کا مقام، وغیرہ کیفیات کا اظہار سراج کچھ اس طرح کرتے ہیں:

جلوہ گر ہے ہر طرف عکس ِ رخ جاناں سراجؔ
مجھ نظر میں آر سی ہے ہر درو دیوار آج

....

سراجؔ یہ مجھے استاد مہرباں نے کہا
کہ علم عشق میں بہتر نہیں ہے کوئی علوم

....

ہرگز نہیں ہے اس کوں حقیقت کی چاشنی
جس نے مزہ چکھا نہیں عشق مجاز کا

....

نظر کر دیکھ ہر شئے مظہرِ نور ِ الٰہی ہے

سراؔج اب دیدۂ دل سیں صمد دیکھا صنم بھولا

....

نور جاں فانوس جسمی سے جدا کب ہے سراؔج
شعلۂ تارِ شمع سیں کہتا ہے من حبل الورید

....

طلب کی راہ میں سختی جو پیش آوے تجھے سالک
خیالات جہاں کوں فتح کر زیرو زبر کرناں

....

دورنگی خوب نہیں یک رنگ ہوجا
سراپا موم ہویا سنگ ہوجا

....

سنا ہے جب سیں تیرے عشق کا شور
لیا زاہد نے مسجد کا کنارا

سراج اورنگ آبادی زندگی بھر کیف وجذب اور بے خودی، محویت، فنا فی اللہ، کے عالم میں گزاری۔ اور ان تمام کیفیات کا اظہار اپنے کلام کے ذریعے کرتے ہیں:

دل میرا بے خودی کے دریا میں
سب سے آزاد ہو مہنک ہوا

....

سراج کیوں نہ غزل خوان بے خودی ہوے
ہوا ہے بلبل بے اختیار گلشنِ حسن

....

تاب نہیں ہم کلام ہونے کی

دیکھ کر تجھ کوں ہوش کھوتا ہوں

....

شرابِ معرفت پی کر جو کوئی مجذوب ہوتا ہے
درودیوار اُس کو ں مظہرِ محبوب ہوتا ہے

....

اے سراؔج اپنی خودی کو بیخودی میں محوکر
شغل جاری رکھ ایک دم ہوالرحمن کا

....

مے خانۂ وحدت کا جوکوئی جام پیا ہے
آرام کے کوچے سے نکل کر بے خبر آیا

....

راہِ خدا پرستی اول ہے خود پرستی
ہستی میں نیستی ہے اور نیستی میں ہستی

اردو شاعری میں عشق کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔اسی کے پیش نظر صوفی شاعر کا رنگ عشق اعلیٰ و ارفع ہوتا رہا ہے۔سراج نے اس مرکزی نکتہ کو اپنی شاعری میں اس خوبی سے برتا کہ اس مضمون میں بلندی،وسعت اور گہرائی پیدا ہوگئی۔ان سے پہلے اس طرح کی مثالیں قال قال ہی نظر آتی ہیں۔سراج سے پہلے اس موضوع کو سطحی طور پر برتا جارہا تھا۔سراج نے اسے ہمہ گیریت عطا کی تھی آگے چل کرصوفی مشرب شاعری نے سراج کی اس روایت سے فائدہ اٹھایا بالخصوص علامہ اقبال نے''عشق''کومعراج تک پہنچادیا اس ضمن میں سراج کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

بے خطرہ، اے روضۂ رضواں ہے، میسر
تجہ عشق کی آتش میں جوکوئی بے خطرآیا

....

معلوم ہوا عشق کے اطوار سیں یوں کر

مجھ عقل کی بنیاد کوں برباد کریگا

....

نجانوں عشق کی بجلی کدھر سیں آئی ہے
کہ مجھ جگر کے کھلے کوں جلا تمام کیا

....

سینہ میں رازِ عشق کا پوشیدہ کیوں رہے
یہ آہ و نالہ پردہ درِ عاشقاں ہوا

....

عقدہ دل کوں کھولتا ہے تمام
عشق تیرا ہے کاشف ہرراز

....

عیاں ہے سینہ ٔ عاشق سیں عاشقی کا داغ
کہ جیوں کہ پردۂ فانوس سیں عیاں ہے چراغ

....

لیلئ گل چہرہ مقصود کوں پایا ہے وہ
جو ہوا ہے مثل مجنوں بلبل گل زار ِ عشق

....

عشق میں آکہ عقل کوں کھوناں
باخرد ہو کے بے خرد ہوناں

سراجؔ نے عشق کی مختلف کیفیات کے اظہار میں کہیں تشبیہ تو کہیں استعارہ کے ذریعے کلام میں حسن پیدا کیا ہے۔تصوف ہی ان کی حیات کی ابتداء اور انتہا ہے۔ان کی سیرت اور کلام میں تصوف لازم وملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔جس

کے بغیر انکے کلام کا تجزیہ ناممکن نظر آتا ہے۔وہ نہ صرف زندگی بلکہ اپنی شاعری میں بھی عشقِ حقیقی کے مداح نظر آتے ہیں۔بقول ڈاکٹر محمد حسن:

> ''سراج جو کچھ بھی تھے وہ عشق اور جمال پرستی کی بدولت تھے۔اگر وہ صوفی تھے تو اسی وجہ سے اور شاعر تھے تو اسی وجہ سے انہوں نے اپنے وجود کے ہر تار کو عشق کے نغمے سے باندھ لیا تھا۔''(41)

سراجؔ کا کلام تصوف اور تغزل کے حسین امتزاج سے تشکیل پاتا ہے۔ان کے یہاں کلام میں رفعت،خلوص،صداقت کے عمدہ مثالیں مل جاتی ہیں۔انہوں نے عشق کی مختلف النوع کیفیات کے اظہار کے لیے فنی نزاکت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اعلیٰ وارفع اور بلند و بالا شاعری کی ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔☆

حوالہ جات 3:

1　ادب اور زندگی، مجنوں گورکھپوری،ص55

2　دکن میں اردو شاعری ولی سے پہلے،ڈاکٹر جمال شریف،ص50

3　اردو ادب کی تنقیدی تاریخ،سید احتشام حسین،ص 27-26

4　اردو زبان کی تاریخ۔مرزا خلیل احمد بیگ،ص154

5　دکنی زبان (آغاز وارتقاء) انجمن ترقی اردو گلبرگہ۔ص66

6　اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیا کا کام۔عبدالحق۔ص16

7　دکنی ادب کی تاریخ۔ڈاکٹر زور۔　ص23

8　حضرت بندہ نواز کی ہندوستان شاعری (مضمون) نصیر الدین ہاشمی۔مشمولہ/ مقالات ہاشمی۔ص23

9　بجھتے چراغ،اکبرالدین صدیقی۔　ص11

10　دکن میں اردو شاعری ولی سے پہلے''،ڈاکٹر محمد جمال شریف،ص147

11　دکن میں اردو،نصیر الدین ہاشمی۔ص69

12　دکن میں اردو مثنوی: سراج اورنگ آبادی تک،ڈاکٹر ملک راشد فیصل،ص62

13 دکن میں اردو،نصیر الدین ہاشمی،ص70

14 دکنی ادب کی مختصر تاریخ، یوسف سرمست،ص72

15 دکن میں اردو،نصیر الدین ہاشمی،ص 81

16 دکن میں اردو شاعری ولی سے پہلے،ڈاکٹر محمد جمال شریف،ص 157

17 کائنات تصوف،سید محمد اشتیاق عالم ص 409-408،

18 دکن میں اردو،نصیر الدین ہاشمی،ص83،

19 علی عادل شاہی دور میں اردو غزل،ڈاکٹر محمد علی اثر،ص60

20 علی عادل شاہی دور میں اردو غزل،ڈاکٹر محمد علی اثر،ص60

21 علی عادل شاہی دور میں اردو غزل،ڈاکٹر محمد علی اثر،ص59

22 ماہنامہ سب رس،حیدرآباد،اپریل 2001،ص39

23 دکن میں اردو شاعری ولی سے پہلے،ڈاکٹر محمد جمال شریف،ص399

24 عادل شاہی دور میں اردو غزل، پروفیسر محمد علی اثر،ص194

25 اردو شہ پارے،ڈاکٹر زور،،ص69

26 تاریخ ادب اردو (جلد اول)،ڈاکٹر جمیل جالبی،ص390

27 مطالعہ ولیؔ (تنقیدی و انتخاب)، ڈاکٹر شارب ردولوی ص 50

28 ولیؔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ محمد خاں اشرف ص 116

29 ساحل احمد۔غزل پس منظر پیش منظر ص57

30 کلیات بحریؔ (مقدمہ)، ڈاکٹر محمد حفیظ سید ص51

31 " " " ص 50

32 " " " ص 51

33 آئینہ معرفت، سید اعجاز حسین اعجاز ص204

34 دکنی ادب کی تاریخ،ڈاکٹر محی الدین قادری زور،ص 112

35 دیوانِ داؤد اورنگ آبادی, خالدہ بیگم ص6

36 قدیم اردو غزل (تنقید و انتخاب)، پروفیسر محمد علی اثر، ص43

37 حیدرآباد کے ادیب, زینت ساجدہ ص91

38 سراج اورنگ آبادی حیات اور شاعری ڈاکٹر صدیق محی الدین, ص34

39 تاریخ ادب اردو (جلد اوّل)، ڈاکٹر جمیل جالبی, ص 566

40 سراج اور اُن کی شاعری۔عبدالقادر سروری , ص93

41 اردو کی عشقیہ شاعری،ڈاکٹر محمد حسن، ص342

☆☆☆

باب چہارم

شمالی ہند کے اہم صوفی شعراء

شمالی ہند میں اردو کے ابتدائی فقرے بابا فرید، قطب الدین بختیارِ کا کی، نظام الدین محبوب الٰہی، شیخ باجن اور شیخ حمید الدین ناگوری وغیرہ جیسے اکابر صوفیہ کے یہاں ملتے ہیں۔اس طرح شعری نمونے سعد سلمان لاہوری، ورحضرت امیر خسرو

سے منسوب کلام میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ آج تک کی تحقیق میں اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ مسعود سعد سلمان لاہوری (1046ء۔1121ء) اردو کے پہلے صاحب تصنیف (دیوان) شاعر ہیں۔ جن کی زبان کو امیر خسرو (۱۲۵۳ء۔ ۱۳۲۵ء) نے ہندوی قرار دیا ہے۔ نیز محمد عوفی کے تذکرہ ''لباب الالباب'' (1220ء) میں بھی مسعود کے دیوان کو 'ہندی' کہا گیا ہے۔ مسعود سعد سلمان لاہوری کے دیوان کا سراغ اب نہیں ملتا۔ خسرو اور سلمان کے درمیان دو صدیوں کا فاصلہ ہے۔ ڈاکٹر محمد انصار اللہ اپنے ایک تحقیقی مضمون ''اردو غزل (دسویں صدی ہجری / سولویں صدی عیسوی تک) میں حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کو اولین شاعر مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے شعر جن کے انتساب کی صحت پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ ان کا مستند کلام کو محققین نے دریافت کیا ہے ان میں ایک دوہا اور ایک چوپائی شامل ہیں جس کے نمونے پیش کیا جاتے ہیں:

سائیں　سیوت　گل　گیے
ماس　نہ　رہیا　دیہہ
تب　لگ　سائیں　سیویاں
جب　لگ　ہوں　سوں　کیہہ

(دوہا)

راول　دیول　ہے　نہ　چاہیے
پھاٹا　پہنا　روکھا　کھاییۓ
ہم　درویشہنہ　ایہے　ریت
پانی　لوڑین　اور　میست

(چوپائی)(1)

امیر خسرو اُردو ہندی کے پہلے شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں جن کے یہاں صوفیانہ اشعار بھی ملتے ہیں وہ مزاجاً صوفی شاعر تھے اس کے علاوہ ان کی وابستگی خانقاہ اور دربار سے تھی۔ چنانچہ محققین کا خیال ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کا چراغ روشن کیا جو آگے چل کر اس کی روشنی ملک کے گوشے گوشے میں پھیلی۔ چنانچہ ان کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

زحالِ مسکین مکن تغافل درائے بنائے بتینان! کہ تابِ ہجراں نہ
دارم اے جاں نہ لینھو کا ہے لگائے چھتیاں

....

شانِ ہجراں دراز بتوں زُلف و روز صلش چو مرکو تاہ
سکھی پیا کوں جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

امیر حسن دہلوی (امیر خسرو کے ہم عصر اور پیر بھائی) کے بارے میں کہا جاتا ہیکہ انہوں نے اس قدیم اُردو یا ہندوی میں ایک دیوان مرتب کیا تھا جواب ناپید ہے۔امیر حسن دہلوی کے بقول جمیل جالبی فارسی کے معروف شاعر عبدالرحمن جامی نے ''سعدی ہندوستان'' کہا تھا۔ان کے متعلق تذکروں میں آتا ہے کہ وہ فارسی زبان کے پر گو شاعر تھے۔عہد تغلق میں حضرت برہان الدین غریب کے ہمراہ دولت آباد کا رخ کیا۔انہوں نے بھی فارسی اور ہندوی میں امیر خسرو کی طرح شعر کہتے تھے۔شعر دیکھیے:

ہر لحظ آید درد والم دیکھوں اسے ٹک ھالے کر
گوتم حکایت ہجر خود بہ آن صنم صی لائے کر

....

آں ہم تن گوئند مرا در کوے ما آید پھرا
ماہی صفت تر پھوں جو ٹک نہ دیکھوں جا کر

شمالی ہند میں اُردو شعر گوئی کا باضابطہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔اس طرح کئی برسوں تک اردو شاعری گجرات اور دکن کے علاقوں میں پھیلی اور پھولی۔دکن میں اُردو زبان صوفیہ کرام کی بدولت ترقی و ترویج کے مراحل سے گزرتی رہی۔شمالی ہند میں اُردو شاعری، کے نمونے امیر خسروؒ کے بعد شرف الدین بوعلی قلندر، شیخ یحییٰ منیریؒ، سید محمد جون پوری، شیخ بہا الدین باجن ،عبدالقدوس گنگوہی، وغیرہ کے یہاں ملتے ہیں۔جنہوں نے دوہے، فالنامے اور ملفوظات اور راگ راگنیوں اور منظوم باریوں کے ذریعے صوفیانہ شعری کا اظہار کیا:

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روے
بدھنا ایسی رین کو بھور کدھی نے ہوے

(شیخ شرف الدین بوعلی قلندر)(2)

شرف حرف مائل کہیں درد کچھ نہ بسائے

گرد چھوئیں دربار کی سو درد دور ہوجائے

(شیخ شرف الدین منیری)(3)

ہوں بلہاری سجنا ہوں بلہار

ہوں سرجن سہرا ساجن مجھ گل ہار

(سید محمد جونپوری)(4)

محمد سرور پریم کا رحمت اللہ بھریا

یا جن جوڑا وار کر سر آکیں دھریا

(شیخ بہاالدین باجن)(5)

صدق رہبر صبر توشہ دشت منزل دل رفیق

ست نگری دھرم راجا جوگ مارگ

(شیخ عبدالقدوس گنگوہی)(6)

ہاشم جی پھولاں لہر

پیویں وحدت کے بحر

ہوویں متوالے سحر

دنی ضوں قاتل زہر

(سید شاہ ہاشم حسنی العلوی)(7)

اردو کی ابتدائی نشوونما میں نام دیو، کبیر، گرونا نک، وغیرہ کا نام بھی لیا جاتا رہا ہے۔ اگرچہ نامدیو (مرہٹی کے شاعر)، کبیر (دوہوں کے مشہور شاعر بنارس کے متوطن) اور گرونانک (پنجابی شاعر) رہے ہوں مگر ان کے یہاں اردو زبان کے ابتدائی نقوش کو دیکھا جاسکتا ہے۔ بقول نورالحسن نقوی:

"گویا یہ وہ زمانہ ہے جب سارے ملک میں ایک زبردست لسانی تبدیلی رونما ہورہی ہے یعنی بہار و بنگال ہو یا مرہٹواڑہ، راجستھان ہو یا پنجاب ہر جگہ مقامی زبان میں عربی، فارسی الفاظ تیزی سے داخل ہورہے ہیں اور

زبان کی ساخت کھڑی بولی سے متاثر ہورہی ہے۔دلی اور نواحی اضلاع اس
کا اصلی مرکز ہیں۔''(8)

ان بزرگوں کی شاعری کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں جن کے یہاں زبان اردو کے ابتدائی نقوش کے ساتھ ساتھ متصوفانہ رنگ بھی نمایاں ہوتا ہے:

مائے نہ ہوتی، باپ نہ ہوتا،کرم نہ ہوتی کائیا
ہم نہیں ہوتے،تم نہیں ہوتے،کون کہاں تے آئیا

(نام دیو)(9)

ہمن ہے عشق نہ مستا ہمن کو ہوشیاری کیا
رہے آزاد یا جگ سے ہمن دنیا سے یاری کیا
جو بچھڑے یار ہیں پیارے سے بھٹکتے دربدر پھرتے
ہمارا یار ہم میں ہے ہمن کو انتظاری کیا

(سنت کبیر)(10)

نانک دنیا کیسی ہوئی
سالک مت نہ رہیو کوئی
بھائی بندھی ہیت چکایا
دنیا کارن دین گنوایا

(نانک)(11)

شمالی ہند میں اردو زبان اور ادب ارتقائی شکل میں یقیناً موجود تھی۔مگر آگے چل کر گجرات اور دکن میں زبان تیزی سے ترقی کرتی رہی اور وہ گجری اور دکنی کہلائی جس میں شعراء نے تصوف و اخلاق اور علم وحکمت کے خزینے پیش کئے۔اردو زبان عہد اور رنگ زیب سے ترقی کے مدارج طے کرنے لگی۔شمالی ہند میں اردو کی شعری روایت کو زندہ رکھنے میں شاہ حسین (متوفی ۱۵۹۹)،مولانا عبداللہ عبدی، شیخ بہاؤالدین برناوی، حاجی محمد نوشہ (متوفی ۱۶۵۳ء گنج بخش)،، شیخ عثمان جالندھری، منشی ولی رام (مشیر دارالشکوہ)، افضل پانی پتی، مولانا غنیمت کنجاہی، ناصر علی سرہندی، شاہ مراد، عبدالواسع ہانسوی،، میر جعفر

زٹلی اور چندر بہان برہمن، وغیرہ شامل ہیں جنھوں نے اردو شاعری کی روایت کو زندہ رکھا اور آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ بنے رہے۔ان بزرگوں کے کلام کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں:

جگ میں جیون تھوڑا کون کرے جنجال
گیندے گھوڑے ھتی مندر کیندا ہے دھن مال
کہاں گئے ملاں،کہاں گئے قاضی،کہاں گئے کٹک ہزاراں
لیہہ دنیا دن دوئے پیارے ہر دم نام مہال
کہے حسین فقیر سائیں داں جھوٹا سبھ بیوپار

(شاہ حسین)(12)

گم کر اپنا آپ اے عاقل
جسے ہونا ہے حق کا واصل
اس کا اسم ہے اسمِ خدا
کیا ہو اس کی صفت ادا

(حاجی محمد نوشہ)(13)

عاشق دیوانہ ام آؤ پیارے حبیب
از ہمہ بیگانہ ام آو پیارے حبیب
اے دل و دیں جانِ من آو پیارے حبیب
ذکر تو سامانِ من آو پیارے حبیب
بر دلِ عثماں غریب رحمتِ خود کن قریب
زانکہ تو ہستی مجیب آو پیارے حبیب

(شیخ عثمان جالندھری)(14)

چہ دلداری دریں دنیا کہ دنیا سے چلانا ہے
چہ دل بندی دریں عالم کہ سرپر چھوڑ جالا ہے

قبا و چیرہ رنگین همہ از لن تو بکشایند
رہیں گے کفن کی چادر جو تیرا خاص بانا ہے
طلب دیدار سیدارم کہ روز اول شفاعتھا
بسارو مت ولی راما کہ آخر رام راما ہے

(منشی ولی رام)(15)

شراب بے خودی سے مست ہو ہر آن اور ہر دم
نشہ وحدت میں سر خوش ہو کے کثرت کو بھلاتا جا

(شاہ مراد)(16)

خدا جانے یہ کس شہر اندر ہمن کوں لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالہ ہے
پیا کے ناؤں عاشق کو قتل با عجب دیکھے ہوں
نہ برچی ہے نہ کرچھی ہے نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے

(برہمن)(17)

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے
ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے
بہت سے مکر جو جانے اوسی کو سب کوئی مانے
کھرا کھوٹا نہ پہچانے، عجب یہ دور آیا ہے

(جعفر زٹلی)(18)

مذکورہ بالا اشعار کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ گجرات، اور دکن کے ساتھ ساتھ شمال میں بھی اردو شاعری ارتقائی مراحل طے کرر ہی تھی۔اس دور کے بھی شعراء نے رنگ تصوف کو اپناتے ہوئے اپنی شعری دنیا سجائی۔تصوف اس دور کا محبوب اور پسندیدہ موضوع رہا جس میں شعراء نے اپنے جوہر دکھلائے ہیں۔

عہد محمد شاہی میں ولی کا دیوان دہلی پہنچا تو گھر گھر شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا اور اس طرح دہلی میں شاعری کا

پہلا دور دورشروع ہوا۔خان آرزوؔ، آبرو، ناجیؔ، فائزؔ مضموں، یک رنگ، انجام، حاتم فغاں، مظہر جانِ جاناں وغیرہ جیسے شاعروں کے نام ملتے ہیں۔ پھر میر، سوداؔ اور درد کا دور آیا تو اُردو شاعری نے غزل قصیدہ رباعی مثنوی مرثیہ شہر آشوب وغیرہ میں مذہبی عشقیہ، اخلاقی آشوبیہ، رثائی، ہر قسم کی شاعری میں معراج کمال حاصل کیا۔سودا، میر، درد، سوز، یقینؔ، قائمؔ، میر حسنؔ، انشاء، مصحفیؔ، اثرؔ وغیرہ اور بے شمار شاعر ہوئے جنہوں نے شمالی ہند میں ولی کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔

اردو شعر و ادب کا یہ عہد جس میں میر تقی میر نے بھی شاعری کی ہے اس کو عہد زرین اور عہد میر سے بھی معنون کیا جاتا ہے۔میر اور ان کے دور کی شاعری اپنے عہد کی تاریخ ہے۔عہد میر میں دلی پر جو ستم ڈھائے گئے۔اس کے چشم دید گواہوں میں میرؔ، سوداؔ اور دردؔ وغیرہ رہے۔چنانچہ یہ عہد انتشار و خلفشار، مصائب و آلام سے دوچار تھا۔اس دور کی شاعری کا مطالعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ داخلی سوز و ساز کے ساتھ ساتھ ولی کی شعری روایت کے اثرات بھی اردو شاعری پر قائم رہے۔اس دور میں میرؔ، قائمؔ، آبروؔ، سوداؔ وغیرہ جیسے قدآور شاعروں نے ولیؔ کے اثرات قبول کئے۔ مثلاً:

منھ دھونے اس کے آتا تو ہے اکثر آفتاب
کھاوے گا آفتابہ کوئی خود سر آفتاب

(میرؔ)

سحر اس حسن کے خورشید کو جا کر جگا دیکھا
ظہور حق کوں دیکھا خوب دیکھا با ضیا دیکھا

(مظہر)

سب صفت اس کی دیکھ لے اس میں
کہہ تو بندہ خدا سے کیا کم ہے

(حاتم)

اگر میں جانتا ہی عشق میں دھڑکا جدائی
تو جیتے جی نہ لیتا نام ہرگز آشنائی کا

(سوز)

شعر میں میرے دیکھنا مجھ کو

ہے میرا آئینہ صفائے سخن

(دردؔ)

آئینہ و جود و عدم میں اگر ترا

رود رسیاں نہ ہوتو کہیں ہم کو روز نہ ہو

(سوداؔ)

غرض اٹھارویں صدی میں قائم مرزا مظہر جانِ جاناں کی زبان دانی، میرؔ وسوزؔ کی سادگی، فغاںؔ وتاباںؔ کی سلاست و روانی سوداؔ کی مضمون آفرینی اور میرؔ کی سادگی، ہجر نصیبی، سلاست، روانی، سادہ بیانی وغیرہ سے اُردو شاعری نئے اسالیب، نئے رجحانات سے متصف رہی اور ایک نئی شعری شناخت قائم ہوئی۔ شمالی ہند کے شعراء نے شاعری میں سوز و گداز، سادگی اور رنگینیٔ طبع کے ساتھ ساتھ صوفیانہ اور عرفانی جذبات و احساسات کی پر اثر ترجمانی کی ہے۔ اس پوری صدی میں مظہر اور خواجہ میر دردؔ ایسے صوفی وصافی شاعر رہے جنہوں نے پاکیزہ فکر، اخلاقیات اور روحانی اقدار کو نمایاں کیا ہے اور صوفیانہ فکر ونظر کو اپنی شاعری کا ذریعہ بناتے ہوئے صوفیانہ شاعری کی ایسی مثال قائم کی ہے جس کا جواب آج تک بھی اردو شاعری میں ملنا محال ہے۔ مختصراً اٹھارویں صدی ہجری کی شاعری کا مطالعہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس عہد میں اسلوب و بیان اور موضوعات میں تنوع کے علاوہ تراکیب، محاورات، صحتِ تلفظ، صنائع بدائع اور دیگر خصوصیات شعری کو حُسن وخوبی کے ساتھ پیش کیا گیا۔ علاوہ ازیں اس دور میں زبان کی شائستگی کے ساتھ ساتھ قلب و ذہن کی پاکیزگی بھی شامل رہی۔ اس دور کے تمام شاعروں نے قلب ونظر کو مصفا کرنے کے لئے تصوف کا بھی سہارا لیا۔ بالخصوص خواجہ میر دردؔ اس کارواں کے میر کارواں ٹھہرے۔

مغلیہ سلطنت انتشار کا شکار ہوئی۔ دہلی کے حالات بگڑے لوگ امن وسکون، تلاش روزگار میں لکھنو کا رخ کیا۔ لکھنو میں نوابین کا عہدؑ پرسکون وخوشحال تھا۔ شعرائے دہلی کثیر تعداد میں وہاں جمع ہوئے۔ ان کے اثر سے لکھنو میں شعروشاعری کا چرچا شروع ہوا دبستان لکھنو کی بنیاد پڑی۔ وہاں انشاءؔ و مصحفیؔ اور ناسخؔ و آتشؔ، اور ان کے سلسلے کے شعرا نے غزل قصیدہ، مثنوی، رباعی، وغیرہ میں شاعری کی۔ عاشقانہ، مذہبی رثائی شاعری ہوئی۔ میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ اور ان کے شاگردوں نے کربلائی مرثیہ کو درجہ کمال تک پہنچایا۔ نسیم نے صنف مثنوی کو بام عروج پر پہنچایا۔ اگر چہ اس دور میں نئی شعری روایت کی بناڈالی گئی اور ولی کے اثرات کم ہوتے گئے۔ تاہم لکھنو کے عیش پرستانہ ماحول میں بھی متصوفانہ خیالات کا اظہار بھی ہوتا رہا اور روحانی فکر ونظر کو بھی یہاں کے شاعروں نے آگے بڑھایا۔

مخلوق ہوں یا خالق مخلوق نما ہوں
معلوم نہیں مجھ کو کہ میں کون ہوں کیا ہوں
(مصحفی)

ظہورِ آدمِ خاکی سے یہ ہم کو یقیں آیا
تماشا انجمن کا دیکھنے خلوت نشیں آیا
(آتش)

عالم ہے محو آئینہ خانہ کی سیر میں
اپنے سوا کسی کے کوئی روبرو نہیں
(ناسخ)

ہمشکل مصطفی کا ہے کیا حسن کیا جمال
صبح جبیں ہے اور شب گیسوئے بے مثال
یہ خطا یہ لب یہ چشم یہ ابرو یہ رخ یہ خال
یاقوت و مشک و نرگس و نجم و مہ و ہلال
اک گل پہ یاں ہزار طرح کی بہار ہے
چہرہ نہ کہیئے قدرت پروردگار ہے
(انیس)

قرآں میں قتل نفس کی حرمت ہے جابجا
سید کا خوں حلال کہاں سے تمہیں ہوا
ہے نفس مصطفی بخدا سبط مصطفی
آخر جزائے من قتل مومناً ہے کیا
سید نہیں امام نہیں مقتدا نہیں
مومن بھی تمہارے عقیدہ میں کیا نہیں

(دبیرؔ)

سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں دہلی میں شاہ نصیرؔ، استاد ذوقؔ، غالبؔ، ظفرؔ، مومنؔ، اور امیرؔ، داغؔ، جلالؔ اوران کے شاگردان اپنے شعری کمالات دکھلائے۔ اس دور میں غالب نے شاعری کو آفاقی اور کائناتی بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ایک ہمہ جہتی شاعر اس پورے دور کو غالبؔ کے عہد سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ غالب کی فکری وفنی جہتیں وسیع ہیں۔ خارجی اور داخلی عناصر کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ، صوفیانہ، حکیمانہ فکر ونظر بھی ان کے کلام دیکھی جا سکتی ہے۔ غالبؔ کے علاوہ اس دور کے دیگر شعراء کے یہاں بھی وہ تمام خصوصیات کے علاوہ متصوفیانہ، حکیمانہ وفلسفیانہ مزاج کی نمائندگی ملتی ہے ۔لہذا اس دور کے کلام میں باطنی اسرار و رموز کو صنائع و بدائع کے زیور سے آراستہ کرتے ہوئے شاعروں نے اپنی شعری کہکشاں سجائی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

آپ آئینہ ہستی میں ہے تو اپنا حریف
ورنہ یاں کون تھا جو تیرے مقابل ہوتا

(ذوقؔ)

نیرنگِ حسن و عشق کے کیا کیا ظہور ہیں
بسمل کو اضطراب ہے قاتل کو اضطراب

(شیفتہؔ)

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(مومنؔ)

محبت کی حلاوت ہم سے پوچھو
کوئی اس کا مزہ کیا جانے کیا ہے

(ظفرؔ)

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں سب شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

(غالبؔ)

اُردو شاعری کا آفتاب نصف النہار پر جگمگا رہا تھا کہ غدر ۱۸۵۷ء کی آندھی نے مغلیہ سلطنت کا ٹمٹماتا چراغ گل کر دیا۔ سلطنت مغلیہ ختم ہوگئی۔ برطانوی حکومت کا آغاز ہوا۔ نئے دور کا آغاز ہوا۔ دہلی لکھنو وغیرہ کی بزم شاعری اجڑ گئی اُردو شاعری کا دور قدیم ختم ہو گیا۔

نئے دور کے نئے تقاضوں اور مغرب کے اثرات کے باعث اُردو میں جدید شاعری کا آغاز ہوا۔ لاہور میں آزادؔ اور حالیؔ نے انجمن پنجاب لاہور کے نئے طرز کے مشاعروں میں شرکت کرتے ہوئے جدید طرز کی نظموں کی بناڈالی۔ جس میں ''طرح کے بجائے''عنوان'' دیا جاتا تھا۔ ان مشاعروں سے جدید شاعری کے فروغ کے امکانات پیدا ہوئے۔ اردو شاعری میں نئے موضوعات داخل ہوئے اور شاعری نہ صرف اصناف کے اعتبار سے بلکہ موضوعاتی لحاظ سے بھی اس میں تنوع پیدا ہوا۔ اردو شعر و ادب میں اصلاحی، قومی، حقیقی زندگی کی عکاسی ہونے لگی۔ آزاد، حالی، شبلی، اکبر، اسماعیل میرٹھی، نظم، شرر،، وغیرہ نے قدیم اصناف کے ساتھ ساتھ جدید اصناف میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ بیسویں صدی میں اقبال کا دور شروع ہوا۔ انہوں نے ہر قسم کے جدید رجحانات و مضامین میں شعری کارنامے یادگار چھوڑے۔ سرورؔ، چکبستؔ، محرومؔ، جوشؔ، شادؔ، سیمابؔ، وغیرہ بے شمار شعرا نے نظمیں غزلیں وغیرہ لکھیں۔ اصغرؔ، جگرؔ، حسرتؔ، فانیؔ، وغیرہ نے جدید غزل گوئی کو نیا موڑ دیا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد تقریباً ہر شاعر کے یہاں متصوفانہ خیالات و جذبات کی ترجمانی غزل اور دیگر اصناف میں بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس پورے دور کی متصوفانہ شاعری کے نمونے (رباعیات کے حوالے سے) ملاحظہ ہوں:

مشکل سے تجھ او گل رعنا پایا
کونین میں پھر کر تیرا کوچہ پایا
دنیا عقبیٰ سے عاشقی حاصل کی
صغریٰ کبریٰ سے یہ نتیجہ پایا

(داغ)

بے فائدہ انسان کا گھبرانا ہے
ہر طرح سے اسے رزق کو پہونچانا ہے
قاروں کے خزانے سے بھی مل جائیگا

منظور جو اللہ کو دلوانا ہے

(حالی)

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا

آتش پہ مغاں نے راگ پایا تیرا

دہری نے کیا دہرے تعبیر تجھے

انکار کسی سے نہ بن آیا تیرا

(شاد)

ارباب قیود تجھ کو کیا دیکھیں گے

خواہان نمود تجھ کو کیا دیکھیں گے

روایت کے لیے شرط ہے میدانِ وفا

پابند وجود تجھ کو کیا دیکھیں گے

(اکبر)

کس روز یہ دل کفر کا مسکن نہ ہوا

کس شرک سے آلودہ یہ دامن نہ ہوا

ہم نے سو طرح دشمنی دوست سے کی

اللہ ری دوستی وہ دشمن نہ ہوا

(فانی)

کیوں مطلب ہستی و عدم کھل جاتا ہے

کیوں راز طلسمِ کیف و کم کھل جاتا ہے

کانوں نے جو سن لیا وہی کیا کم ہے

آنکھیں کھلتی تو سب بھرم کھل جاتا ہے

(یگانہ)

خود سے نہ اداس ہوں نہ مسرور ہوں میں
بالذات نہ روشن ہوں نہ بے نور ہوں میں
مختار ہے مختار ہے مختار ہے تو
مجبور ہوں مجبور ہوں مجبور ہوں میں
(جوش)

کھنچے نہ گئی ابھی تصویر شہود
پیشانی فطرت پہ نہ تھے نقش سجود
اک سادہ ورق تھا دفتر کون وفاد
اس وقت بھی میں عبد تھا اور تو معبود
(اثرلکھنوی)

شمالی ہند میں اردو شاعری نے ولی کے بعد تا عصر جدید تک ایک طویل فاصلہ طے کیا ہے۔ان ادوار میں غزل کو جو مقبولیت حاصل رہی دیگر اصناف اس سے محروم رہے۔بیسویں صدی کے بعد شعری موضوعات میں تنوع پیدا ہوا۔زمانے کی تبدیل ہوتی روش نے شعراء کو اس طرف خاص متوجہ نہیں کیا۔اس کے باوجود متصوفانہ فکر ونظر سے ان کی شاعری کا دامن خالی نہیں رہا۔غزل کے علاوہ رباعی وغیرہ میں بھی متصوفانہ شاعری کے نمونے اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اردو شاعری کا محبوب ومقبول موضوع تصوف رہا ہے۔ایسے شعراء جن کا مزاج صوفیانہ نہ رہا انہوں نے بھی اپنے کلام کے ذریعے متصوفانہ شاعری سے اپنے کلام کو سنوارا ہے۔غرض اردو شاعری کی سرشت میں تصوف کی جلوہ گری نمایاں رہی ہے اور شاعری کے محدود دائرے کو نشر کرنے ،نئی فکر ونظر پیدا کرنے اور ایک منفرد اسلوب نگارش سے متصف کرنے میں صوفیانہ شاعری نے اہم کردار ادا کیا ہے۔بقول صفی حیدر:

> ''تصوف نے ادب کو ذہنی آزادی عطا کی جس سے حکیمانہ اظہارِ خیال میں کافی مدد ملی اور زبان و بیان نے ادبی لحاظ سے عالمانہ اسلوب کی راہ پائی۔اس کا وجود اردو شاعری کے حقائق میں نہایت کارآمد اور مثالی ثابت ہوا۔تصوف کی وجہ سے الفاظ ومحاورات،زبان اردو میں استعمال ہونے لگے

جن میں جامعیت و بلاغت کی انتہائی وسعت تھی۔لفظ لفظ مفہوم و معنی کی دنیا معلوم ہوتا تھا، بلکہ خیالات کی بوقلمونی اور کلام کی جاذبیت نے اردو ادب میں سپردگی اور ندرت کے آثار پیدا کر دئے،نظریہ عشق و محبت میں شدت اور انداز تخیل میں دلاویزی کی لہر دوڑ گئی،جس نے صوفیانہ شاعری میں اضطراب و کشش کی بجلی بھر دی جو اپنی اثر آفرینی سے باز نہ رہی اور اس سے ہر طبقہ یکساں طور پر مستفید ہوا ہے۔"(19)

شاہ مبارک آبروؔ:

شاہ مبارک آبرو کا اصل نام شیخ نجم الدین، آبروؔ تخلص اور شاہ مبارک کے نام سے معروف رہے۔تذکروں میں آیا ہے کہ ان کا نسبی سلسلہ شاہ محمد غوث گوالیاری اور فرید الدین عطارؒ جیسے بزرگوں تک پہنچتا ہے۔آبروؔ کے تعلق سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ خان آرزو کے تلمذ میں داخل تھے۔آبروؔ کی ولادت 1684ء میں گوالیار میں ہوئی۔عہد جوانی میں دہلی پہنچے اور شاہ کے ملازم ہوئے۔شمالی ہند کے ابتدائی اردو شاعروں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔آبرو نہ صرف بحیثیت شاعر بلکہ خاندانی بزرگی اور دینداری کی وجہ سے بھی محترم و مکرم رہے۔چنانچہ پروفیسر محمد اکرام لکھتے ہیں:

"خاندانی بزرگی اور ان کی دینداری کی وجہ ہی سے ان کے نام کے ساتھ شاہ کا لقب لگایا گیا ہوگا۔ علاوہ شاعری کے اپنی درویش منشی کی وجہ سے وہ مشہور ہوئے اور باعزت زندگی گزاری۔ اردو شاعروں کے تذکروں میں انہیں شاعر نادرہ گوئے ریختہ (میرؔ) ،غنچہ گلزارِ گفتگو(میر حسن) شمع محفل گفتگو (گردیزی) وغیرہ کہا گیا ہے۔گویا سب نے ان کا نام عزت سے لیا ہے"۔(20)

آبروؔ جس دور میں لکھ رہے تھے وہ ایہام گوئی کا دور تھا۔یعنی ایہام شاعری کی ایک خصوصیت ہے جو ہندی شاعری کے توسط داخل ہوئی ہے۔اعجاز حسین اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں کہ

"اس دور کی تیسری خصوصیت ایہام گوئی ہے جو ہندی کے دوہوں سے آئی ہے اس نئی چیز نے ہماری شاعری میں خرابیاں پیدا کرنی شروع کر دیں۔ بے تکلفی اور سادگی کی جگہ ایہام نے لے لی اور سیدھی سادی

بات کو ذومعنی بنانے کی فکر میں شاعروں نے اثر اور لطف کا سرمایہ اپنے

ہاتھوں سے کھودیا۔'' (21)

آبرو کو بھی ایہام گو شاعر کہا گیا مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کے یہاں ایہام اور رعایت لفظی کے ساتھ ساتھ سادگی اور صفائی ءوالے اشعار بھی خوب ہیں۔ جن کے متعلق ماہرین کا خیال ہے ان کا حسن بیان آج بھی دلوں پر اثر کرتا ہے۔ آرزوؔ کی شاعری میں ایہام اور غیر ایہام کی ایک ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

خداوند اٹھادے درمیاں میں ہجر کے پردے
ہمارے دام میں صیاد کو لیا یا ہمیں پردے

....

آیا ہے صبح نیند سے اٹھ رسما ہوا
جامہ گلے میں رات کا پھولوں بسا ہوا

آبروؔ کے کلام میں نہ صرف ایہام بلکہ سچے دلی جذبات و احساسات کی ترجمانی بھی ملتی ہے جو قاری کے دامن دل کو چھو لیتی ہے:

یوں آبرو بناوے دل میں ہزار باتیں
جب روبرو ہو تیرے گفتار بھول جاوے

....

دور خاموش بیٹھ رہتا ہوں
اس طرح حال دل کا کہتا ہوں

....

جس قدر کرتے ہیں خرچ اخلاص کم ہوتا نہیں
آبرو گنج رواں ہے جگ میں مال دوستی

آبروؔ کی شاعری میں مختلف النوع موضوعات کے علاوہ تصوف کا رنگ نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے اس لیے کہ آبروؔ فطرتاً صوفی شاعر تھے اس کے علاوہ ماحول اور خاندانی روایت میں تصوف کے اثرات نے بھی ان سے صوفی آمیز شعر کہلوائے

ہیں:

یہ شعلہ عشق کا حسن ازل کا نور ہے گویا
جلا ہے جب سے سینہ تب سے کوہ طور ہے گویا

....

عشق ہے اختیار کا دشمن
صبر و ہوش و قرار کا دشمن

....

حال عاشق کا کیا بیاں کیجئے
خوار ہے خستہ ہے تباہی ہے

....

زیست ہے اس کی کہ اپنے جان پیارے میں ملا
جی ہستی غافل رہا جگ جگ جیا تو کیا ہوا

....

نفس ِ کافر کوں قتل جو کیا
رتبا ہے اوس کسی کوں غازی کا

....

دل تو دیکھو آدم بے باک کا
عشق سیں پھرتا ہے پتلا خاک کا

عشق کی گرمی، حسن کا دیدار، فنا کا تصور، جہادا کبر، مقام آدمیت، وغیرہ صوفیانہ اصطلاحات کا استعمال اس بات کی گوہی دے رہے ہیں کہ وہ ایک صوفی منش انسان ہیں اور ان کی شاعری بھی ان خصوصیات کی غمازی کر رہی ہے۔ آبرو صوفی تو نہیں تھے مگر صوفیانہ فکر و عمل ان کی شاعری کا حصہ رہی۔ آبرو نے ہجر و وصل کو ایک قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ راہِ سلوک میں ہجر کی کیفیت ہو کہ وصل کی۔ اس سے سالک کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ بے خودی کے عالم میں ہر آن سالک گرفتار رہتا

ہے۔اس کے علاوہ آبرو شاہ مبارک نے، دیدار، مشاہدہ، حیرت اور قناعت وغیرہ جیسے صوفیانہ لفظیات کا استعمال کرتے ہوئے اپنی متصوفانہ فکرونظر کومترشح کیا ہے انکے یہاں متصوفانہ جذبات واحساسات وتصورات کا اظہار ملاحظہ فرمائیں:

کل یوم جان فی شان اس کے تئیں ہوئے یقیں
جس کسی نے مدت ہجراں کا دیکھا امتداد

....

وصل ہو یا ہجر اس کے حق میں دونوں ایک ہیں
آبرو کو ہوگیا ہے یار سیں اب اتحاد

....

وصل اور ہجر دونوں یکساں ہیں
جب ہوا آپس کے بیچ پیارا اخلاص

....

آبرو جیو ڈوب جاتا ہے
بے خودی کی جب آوتی ہے لہر

....

بے خودی کی راہ میں کچھ حکم کی حاجت نہیں
آپ سیں جاتا ہوں اپنے شوق میں دلدار کے

....

دیدار کی شرابیں پیتے ہیں چشم سیتی
مستوں کا ہے درس کے یارو ایاغ اور ہی

....

چھوڑ تسبیح ہزار دانوں کی
ہاتھ میں اپنے ایک دل لے شیخ

....

جوہر نہیں کچھ اور تو دل میں صفاتو ہے
منھ کیوں چھپاتے ہو سجن آئینہ تو ہے

....

تری تصویر پر نیرنگ کے معنی کو جو دیکھے
سوئی حیرت میں جاکر صورتِ دیوار ہوتا ہے

....

ہر گدا گو شئہ قناعت میں
شاہ ہے ملک بے نیازی کا

شاہ مبارک آبرو ؔایہام گوئی کے دور میں سادہ مزاجی اور سادگی پسندی کو قائم رکھا۔شاہ صاحب اپنے حسن اخلاق اور عمل وکردار کی وجہہ سے سماج وسوسائیٹی میں قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔اُن کی فکروشعور زندگی کی گہری فلسفیانہ حقیقتوں تک نہ پہنچا ہو لیکن عملی زندگی کی عام سچائیوں تک اُن کی دسترس ضرور تھی۔آبروؔ کو صوفی تو نہیں کہا جاسکتا بلکہ صوفیانہ مزاج کا حامل شاعر ضرور کہا جاسکتا ہے۔☆

شیخ ظہور حاتمؔ:

حاتمؔ کا اصل نام ظہور الدین اور تخلص حاتمؔ تھا اور شاہ حاتمؔ کے نام سے ادبی دنیا میں معروف ہوئے۔انکی پیدائش 1699ء دہلی میں شیخ فتح الدین کے گھر ہوئی۔ان کے والد پیشہ کے اعتبار سے سپاہی تھے۔حاتمؔ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ شورش زدگی کا ماحول تھا۔اخلاقی،سیاسی،معاشی،معاشرتی بدحالی عروج پر تھی ایسے پرآشوب اور افراتفری کے ماحول میں انہوں نے خوش مزاجی سے زندگی گزاری۔ان پر مصائب وآلام کی گھڑیاں بھی گزری مگروہ جوانمردی کے ساتھ ان کا سامنا کیا۔اور درویشانہ اور قلندرانہ زندگی کو اختیار کیا وہ مجرد تھے اور آزاد منش انسان بھی۔ان کی حیات کم وبیش اٹھارویں صدی عیسویں کو محیط ہے۔شاہ حاتمؔ نے اُردو اور فارسی میں شعری اثاثہ یادگار چھوڑا ہے۔''دیوان زادہ'' نام سے ۱۷۵۵ء میں ایک شعری مجموعہ مرتب کیا۔ایک طویل عمر پاکر جولائی ۱۷۸۳ء میں اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔

حاتمؔ کی حیات کا زیادہ تر حصہ فقیرانہ اور قلندرانہ ماحول میں گذرا۔انہیں خدارسیدہ بزرگوں اور درویشوں سے حد درجہ

عقیدت رہی اور وہ فردوسیہ سلسلہ کے بزرگ بادل علی شاہ سے بیعت بھی حاصل کی تھی اور انہی کے زیرِ تربیت رہتے ہوئے ان کے اثرات قبول کیے۔ شاہ بادل کے رحلت فرمانے کے بعد حاتمؔ نے شاہ سلیم کے حلقہء ارادت میں داخل ہوئے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

گردشِ دوراں سے حاتم غم نہ کھا
حق نکالے گا تجھے افلاس سو

....

خود کو چھوڑ آ حاتمؔ خدا دیکھ
کہ تیرا رہنما ہے شاہ بادل

....

حاتم کیا ہے حق نے دو عالم میں سر بلند
بادل علی کے جب سے لگے ہیں قدم سے ہم

....

جناب حق سے نہ ہو کیوں فیض حاتمؔ کو
ہوا ہے تربیت وہ بادلِ عادل کی صحبت میں

حاتمؔ کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ شاہ صاحب نے اپنی شاعری میں اخلاقیاتی مضامین اور متصوفانہ اقدار کو پیش نظر رکھا۔ شاہ حاتم نے اس دور کے رجحانات کو اپنی شعری فکر کا حصہ بنایا اور اردو شعر و ادب کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار بھی ادا کیا۔ دہلی میں اس دور میں ولی دکنی کی شعری اتباع کی جارہی تھی لہذا حاتم نے بھی ولی کے اثرات قبول کئے۔ لہذا ان کے یہاں ''ہمہ اوست'' کا تصور نمایاں ہونے لگتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عبدالحق کی رائے ملاحظہ فرماتے ہوئے اس قبیل کے اشعار دیکھیے:

> ''حاتمؔ بنی نوع انسان کا ایک بلند اور وسیع تر تصور رکھتے ہیں، جس میں پوری کائنات شامل ہے وہ شریف انسانیت کو اپنا عقیدہ اور نصب العین قرار دیتے ہیں۔ اُن کی فکر پر اس اعتقاد کی گرفت و گیر سخت ہے۔ یہ فکر تصور انہیں

وحدت الوجود کے راستے سے ملا ہے۔''(22)

کہیں وہ صورت خوباں ہوا
کہیں وہ عاشق حیراں ہوا

....

کہیں لفظ و کہیں معنی کہیں حرف
کہیں یو تھی کہیں قرآن ہوا ہے

....

کہیں وہ صاحب مال و زر و شان ہوا
کہیں وہ بادشاہ تخت لامکان ہوا

....

کہیں فقیر کی صورت ہوا سوال کیا
کہیں وہ شیخ و مشائخ بناو حال کیا

....

کہیں مدرسے میں فاضل ہو قیل و قال کیا
کہیں جمال دکھایا کہیں جلال کیا

شعرائے متقدمین نے انسانی عظمت اور رفعت کو اپنی شاعری کا محور و مرکز بنایا اور انسانی عظمت، مقام و مرتبہ کو واضح انداز میں پیش کیا ہے حق، دل، فقر، عشق اور عاشق وغیرہ جیسے الفاظ کو صوفیانہ و عارفانہ فکر میں پیش کرنے کی سعی جمیل کرتے ہیں۔حق کی گفتگو صوفی کا شعار اور دل اس کا مقام بھی۔اس مقام پر پہنچنے کے بعد ایک عاشق صادق عشق کی راہ میں اس طرح فنا ہوتا ہے کہ اسے دنیا و مافیہ کی خبر نہیں رہتی۔ان تمام کیفیتوں کا شعری اظہار حاتمؔ کے یہاں ملاحظہ فرمائیں:

اناالحق گر نہ کرتا رازِ دل فاش
تو اتنا خلق میں رسوا نہ ہوتا

....

طلب میں حق کے اے حاتم قصور ہمت کا ہے تیری
وگرنہ حضرتِ انساں سے کیا ہو نہیں سکتا

....

دل کی مرے حقیقت کیا پوچھتے ہو یارو
یا حیرت ِتپاں ہے یا یادِ رفتگاں ہے

....

دل ہے وابستہ تیرے دامن سے
دست میرا رسا نہیں تو نہ ہو

....

تیری تصویر دل سے مٹی نہیں
نقش ہے نقش ِ راہ کے مانند

....

عاشقوں کے سیر کرنے کا جہاں ہی اور ہے
ان کے عالم کا زمین و آسماں ہی اور ہے

....

زاہد و ورد و وظائف سے نہیں حاصل کار
جن کو ہو حسن اجابت و دعا ہی اور ہے

....

تمہارے عشق میں ہم ننگ و نام بھول گئے
جہاں میں کام تھے جتنے تمام کام بھول گئے

....

جب سے آپ سے ہی گزر گئے ہم
پھر کس سے کہیں کدھر گئے ہم

....

عاشق کا جہاں میں گھر نہ دیکھا
ایسا کوئی در بدر نہ دیکھا

صوفیوں کے ارشادات میں یہ قول بھی مشہور ہے کہ جس نے ''فقر'' کو اختیار کیا وہی دولت مند ہے۔فقر کی برتری کے سلسلہ میں حاتم کہتے ہیں:

میّسر فقر کا ہے جس کو د یہیم
وہی ہے بادشاہ ہفت اقلیم

....

بیٹھنے کو شاخ پر نہیں کرتیں نگاہ
اس چمن کے بلبلوں کا آشیاں ہی اور ہے

بہرکیف حاتم مزاجاً صوفیانہ اقدار و افکار کے حامل شاعر تھے جنہوں نے صبر ورضا،فقر وقناعت، وہ روحانیات کو اپنی شاعری کے ذریعے مترشح کرتے رہے، حضرت میر بادل علی شاہ سے بیعت حاصل کرنے کے بعد اُن کے خیالات میں مزید صوفیانہ نکھار پیدا ہونے لگا۔ چنانچہ ان کی حیات اور شاعری متصوفانہ رنگ و آہنگ کی غمازی کرتی ہے۔☆

مرزا محمد رفیع سودا:

مرزا محمد رفیع سودا دہلی کے ایک تاجر مرزا محمد شفیع کے گھر 1706ء میں عالم آب و گل میں تشریف لائے۔ان کی ولادت سے متعلق محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے مگر ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحقیق کے بعد مذکورہ بالا تاریخ کو درست قرار دیا ہے ۔اسی طرح جالبی صاحب نے ان کی وفات ۲۷ جون 1781ء لکھا ہے۔سودا کی پرورش آسودہ حال خاندان میں ہوئی تھی جس کا اثر ان کی شاعری میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ان کے یہاں شعری صلاحیت غیر معمولی تھی۔اردو قصائد میں ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ہجو گوئی میں ان کی غیر معمولی صلاحیتیں تھی۔قصائد کے علاوہ،شہر آشوب،مثنوی،واسوخت،سلام،مرثیے اور غزل وغیرہ اصناف میں بھی اپنی توانائیاں صرف کی ہیں اور بلاشبہ وہ اپنے دور کے اہم ترین شاعروں میں بھی شمار کئے جاتے ہیں۔

سوداؔ نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شاعری کی ہے۔ان کے اساتذۂ سخن میں خان آرزوؔ، سلیمان قلی خاں دلاورؔ شامل ہیں اور کبھی کبھی شاہ حاتمؔ سے بھی مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ابتداء میں فارسی شاعری کی بعدازاں اردو کی مقبولیت اور خان آرزو کے کہنے پر کوچہ اردو میں داخل ہوئے۔سوداؔ کی شاعری میں بھی معاصرین کی طرح متصوفانہ اور اخلاقی مضامین دیکھے جا سکتے ہیں۔ان کی شاعری میں نہ صرف فارسی روایت بلکہ معاصرین سے بھی اخذ واستفادہ کی مثالیں مل جاتی ہیں۔سوداؔ کی شاعری کے ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی، لکھتے ہیں:

''سوداؔ کے ہاں فارسی کے زیر اثر جو مضامین بار ہا آتے ہیں ان میں بے ثباتی ونیرنگی زمانہ کے علاوہ اخلاقی مضامین اور تصوف کے عام کلیے بھی شامل ہیں ۔''(23)

سوداؔ خوش اخلاق، خلوص ومروت کا نمونہ تھے۔ان کے مزاج میں بلند اخلاقی، عجز وانکسار بھی ان کے مزاج کا حصہ تھا۔اس لیے ان کے مراسم اس دور کے اکابروں سے بھی تھے اور عام وخواص میں مقبول بھی تھے لہذا کیا خواص اور کیا عوام سب انہیں احترام سے پیش آتے۔سودا نے خود اپنی کتاب ''عبرت الغافلین'' میں اخلاقیات کی تہذیب پر اظہار خیال کیا ہے جسے جمیل جالبی نے نقل کیا ہے:

''وہ شخص جو بہت کچھ ہے اور خود کو کم سمجھتا ہے دراصل بہت کچھ ہے۔اور وہ شخص جو کم ہے مگر خود کو بہت سمجھتا ہے یا خود سر ہے وہ ذلیل ہو جاتا ہے، آدمی کو چاہئے کہ اپنے اوقات اخلاق کی تربیت وتہذیب میں صرف کرے۔''

(24)

سوداؔ نے علم وعمل کا جو مظاہرہ کیا ہے اس سے ان کے متصوفانہ مزاج کی نمائندگی ہوتی ہے۔لہذا ان کے اس شخصی پہلو کے سبب ان کے یہاں یعنی ان کے مزاج اور شاعری میں اخلاقی اور روحانی اثرات بھی محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ان کے دور کا متصوفانہ مزاج بھی، ان کی شخصیت اور فن کی ترقی میں مدومعاون رہا ہے۔بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

''معاصرین کے ان تاثرات سے سوداؔ کے مزاج وسیرت کی ایک واضح تصویر اُبھرتی ہے۔خوش خلقی، گرم جوشی، ہنستا ہوا چہرہ، شیریں زبانی، یار باش اور ظرافت وہ خوبیاں ہیں جو سودا کو اپنے دور کی ایک دلکش شخصیت بنا دیتی ہے وہ جہاں جاتے

ہیں مقبول ومحبوب ہوجاتے ۔ ساری ہجوگوئی کے باوجود عاجزی و انکساری ان کے
مزاج کا حصہ تھی۔''(25)

سوداؔ اپنے دور کے مقبول شاعر تھے۔ بعض محققین نے ان کے کلام کو تصوف سے خالی قرار دیا ہے جن میں محمد حسین آزاد اور شارب ردلوی شامل ہیں۔ آزاد کا کہنا ہے کہ متصوفانہ مضامین پیش کرنے میں مرزا سوداؔ پھیکے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح شارب ردلوی بھی کہتے ہیں کہ سودا کے یہاں صوفیانہ مسائل کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ مگر جمیل جالبی کا خیال ان حضرات سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے یہاں ہر طرح کے مضامین پائے جاتے ہیں جن میں صوفیانہ اور اخلاقی پہلو بھی ان کی شاعری میں در آئے ہیں۔ ان محققین میں جمیل جالبی کی بات میں وزن محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کے کلام میں حسن و اخلاق، خلق ومروت کی مثالیں مل جاتی ہیں اور عملی اعتبار سے اسے تصوف سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ہاں ایک بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ ان کے کلام میں میرؔ جیسا عشق اور دردؔ کی طرح تصوف ملنا محال ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا کلام صوفیانہ شاعری سے کورا ہے۔ اس ضمن میں جالبی صاحب نے بڑی پتہ کی بات کہی ہے۔ ان کا قول درج کیا جاتا ہے:

''ان کی غزل میں مضامین کا دائرہ بھی محدود ہے۔ حسن وعشق ادائے محبوب،
سراپا، مے وساغر، جام ومینا، شیخ، زاہد وواعظ، تہذیب ومعاشرت کے عام
اصول اور تصوف کے چند مروجہ خیالات ان کی غزل کے وہ موضوعات ہیں
جو بار بار آتے ہیں۔''(26)

سوداؔ کی شاعری سے کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں جن میں عشق، دل، سلوک ومعرفت، انسان کے ظاہر و باطن، فناو بقا ،وغیرہ صوفیانہ اصطلاحات کی عکاسی ملتی ہے:

توڑوں یہ آئینہ کہ ہم آغوش عکس ہے
ہووے نہ مجھ کو پاس جو تیرے حضور کا

....

فضل حق ہو تو تنزل ہی ترقی ہوجائے
قطرہ گوہر ہو صدف سے میں نکلتے دیکھا

....

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا
کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا

....

عاشق فنا میں اپنی نابود جانتے ہیں
جی کا زیاں جو ہووے تو سود جانتے ہیں

....

حالِ دل سے میرے جب تک وہ خبردارانہ تھا
جز دم سرد کوئی محرم اسرار نہ تھا

....

حال باطن کا نمایاں ہے میرے ظاہر سے
میں زبان اپنی سے اظہار کروں یا نہ کروں

....

ہستی سے نیستی میں جو بہتر نہ ہو مزا
ہنستا ہوا جہان سے ہر گز نہ جائے گل

مذکورہ بالا اشعار میں سودؔا نے آئینہ اور عکس سے انسان کے ظاہر و باطن کو پیش کرر ہے ہیں تو کہیں انسان کو عارف کہتے ہیں اور وہ تمام کائنات کے بھید کو جاننے والا تو کہیں ایک عاشق صادق جو ہر وقت عشق کی آگ میں جل رہا ہے۔سودؔا نے سلوک و معرفت کی بات بھی کہیں کنائے میں تو کہیں استعارے کے حولے سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔مزید انھوں نے سالک کو اپنی ہستی کو فنا کرنے کی بات کرتے ہیں جو دراصل ''ہمہ اوست'' کے فلسفے کو بیان کرتا ہے جو اردو شاعری اور صوفیہ کے یہاں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔

سلوک و معرفت میں وجود، عدم، آئینہ، دل، نفس ،ساقی، جام ،آہ جیسی صوفیانہ لفظیات مستعمل ہیں۔سودؔا نے بھی ان لفظیات کو اپنے کلام میں برتتے ہوئے اس بات کا اشارہ دیا ہے کہ ان کے یہاں بھی متصوفانہ، عارفانہ اور اخلاقی مضامین بھی ملتے ہیں۔اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کوسوں کا نہیں فرق وجود اور عدم میں
قصہ ہے تمام آمد و شد کا دو قدم میں

....

آئینہ وجود و عدم میں اگر ترا
رودرمیاں نہ ہوتو کہیں ہم کو رونہ ہو

....

پردے کو تعین کے درِ دل سے اٹھادے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

....

ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

....

نہ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے کام
مدعا ہم کو تو ساقی سے ہے اور جام سے کام

....

آہ و زاری سے میری شب نہیں سوتا کوئی
تجھ سے نالاں ہوں میں ایک خلق ہے نالاں مجھ سے

....

اے آہ تیری قدر اثر نے تو نہ جانی
گو تجھ کو لقب ہم نے دیا عرش مکانی

ان اشعار میں سودؔا نے وجود کا سفر، عدم کی راہ کو بیان کیا ہے جس میں وجود کا سفر مسلسل ہے اور موت اس کا توقف ہے اور پھر یہ سفر جاری رہتا ہے۔سودا نے ان تصورات اور نظریات کو مختلف انداز میں بیان کرنے کی سعی کی ہے۔اس کے علاوہ

سالک پر مختلف کیفیات وارد ہوتے ہیں جہاں پر وہ کفر و اسلام سے بے نیاز ہوتا ہے اور اس کا مدعا صرف اور صرف وجودِ حقیقی کے جلوے کے سوا کچھ نہیں رہتا ہے اور سالک کے دل میں اک آہ ہوتی ہے جس سے وہ مقام معرفت کی منزلیں طے کرتا ہے اور اس کی آ کری منزل عرش مکاں ہوتی ہے۔

سوداؔ کے یہاں متصوفانہ اشعار بھی ملتے ہیں جو ان کے معاصرین اور روایت کا حصہ معلوم ہوتے ہیں اور اس دور میں صوفیانہ اور عارفانہ معاشرہ کی دین ہے کہ سودا نے بھی اس طرح کے اشعار سے بھی اپنی شعری کہکشاں سجائی ہے جسے رنگ تصوف کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس سلسلہ میں قاضی افضال حسین کا یہ قول درست معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے ان کی رباعیات سے متعلق کہا ہے اور ان کی یہ بات دیگر اصناف سخن کے لیے بھی صادق آسکتی ہے۔وہ کہتے ہیں:

''سودا نے صرف وہ تصورات نظم کیے ہیں جو معاشرہ میں،صوفیاء کے اثر سے رائج ہو گئے تھے۔ چنانچہ ادیان کی بنیادی وحدت کا تصور جس کا ذکر صوفیاء نے اپنے اقوال،مواعظ میں متواتر کیا ہے۔سوداؔ کی کئی رباعیوں میں نظم ہوا ہے۔ظواہر کی نفی اور عبد و معبود کے درمیان مخصوص تعلق،صوفیاء کے فکری نظام میں اس وحدت کے اساس ہیں۔''(27)

سوداؔ کے رنگ تصوف کو عیاں کرنے کے لیے رباعی اور قصیدہ سے مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

میں دیرو حرم ڈھونڈ کے یارو ہارا
دونوں میں نہ پایا اسے جُز اندھیارا
دل داغ سے روشن جس دم جو شمع
اپنا تن وجان اپنے قدم پر وارا

....

سوداؔ کو میں پایا مئے وحدت میں مست
اس سے نہ کسی تیشہ دل کو ہے شکست
ناقوس و اذاں سن کے یہ بوئے آزاد
اے برہمن و شیخ صدارا عشق الست

....

امر حق سے ملائک نے یہ چاہا سو نہیں
علم کا بار ترے کوہ فلک کو یہ ازل
عرض دونوں نے کیا یوں جناب اقدس
بوجھ اس میں ہے بہت ہم ہیں گرفتار کسل
آخرش تجھ کو ہے پایا متحمل اس کا
جب یہ دیکھا کہ کسی سے نہیں سکتا ہے سنبھل

غرض سوداؔ کے یہاں صوفی آمیز اشعار کی تعداد زیادہ نہ سہی مگر ان کا کلام تصوف کی چاشنی سے متصف نظر آتا ہے۔ دیگر صوفی شاعروں کی طرح ان کے کلام میں وہ صوفیانہ چمک دمک نہیں ملتی مگر ان کے یہاں صوفیانہ فکر کے اشارے ضرور ملتے ہیں اور سوداؔ کے کلام کا مقام صرف تقلیدی حدود میں متعین کیا جاسکتا ہے اور ان اشعار میں زیادہ تر وحدت الوجود کے اشارے محسوس کئے جاسکتے ہیں۔☆

خواجہ میر دردؔ:

پیدائشی نام خواجہ میر، تخلص دردؔ، 19 ر ذی قعدہ 1133ھ مطابق 13 ستمبر 1719ء کو دہلی میں خواجہ محمد ناصر عندلیب کے گھر پیدا ہوئے۔ دردؔ کے والد صوفی صفت انسان تھے۔لہذا صوفیانہ فکرونظر اور پاکبازی ان کو ورثہ میں ملی تھی۔ دردؔ والد کی طرف سے نقشبندیہ اور والدہ کی طرف سے قادریہ تھے اسی وجہ سے وہ نجیب الطرفین صحیح النسب سید کہلائے اور اپنے کتب میں کئی جگہ تحدیث نعمت کے طور پر اپنے نسب پر شکر ادا کیا ہے۔قدیر احمد نے دردؔ کے حوالے سے اپنی تصنیف میں دردؔ کا نسبی سلسلہ یوں بیان کیا ہے:

> ''خواجہ میر درد کے بیانات سے بھی آپ کا خاندان گیارہویں پشت میں حضرات خواجہ نقشبند تک اور پچیسویں پشت میں حضرت امام عسکریؓ تک پہنچتا ہے آپ کی دادی کے والد حضرت غوث اعظم کی اولاد سے تھے۔لہٰذا آپ بھی نجیب الطرفین ہیں''۔(28)

دردؔ اپنے تخلص کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''قرآن شریف کے پہلے پارہ میں جو الف لام میم حروف مقطعات آئے

ہیں ان کی نسبت بعض اہل معارف نے فرمایا ہے کہ اگر انہیں ملا کر لکھا جائے تو الم کی صورت پیدا کرتا ہے اور الم عربی میں درد کو کہتے ہیں اور یہی میرا تخلص ہے''۔(29) درد کی زندگی کا مطالعہ اس بات کا شاہد ہے کہ وہ کمسنی سے ہی اپنے والد کے روحانی فیض سے تصوف کی بہت سی منزلیں طے کر چکے تھے۔ بچپن ہی میں والد کے ہاتھ پر بیعت کی اور جملہ طریقت کے مقامات انہی کی نگرانی میں طئے کئے۔ درد اپنے والد گرامی کے وصال کے بعد اُنکی معرفت انگیز کتاب ''نالہ عندلیب'' سے روحانی اور علمی روشنی حاصل کی اور وہ خود اس کتاب سے متعلق کہتے ہیں: 'مجھ جاہل کے دل پر حقائق ودقائق کے جو بھی باب کھلے وہ حضرت قبلہ کونین کی تصنیف ''نالہ عندلیب'' کے فیض سے کھلے، میرا اتمام حال وقال ''نالہ عندلیب'' کے مطابق ہے''۔(30) وہ اپنی ایک رباعی میں اپنے پیر ومرشد کے فیضِ روحانی کا ذکر یوں کرتے ہیں:

اے بحرِ علوم! سب کو باری باری
ہے تجھ سے ہی اب حصول فیض جاری
تا حشر تری مریدی و پیری کا
جوں موج، یہ سلسلہ رہے گا جاری

درد کی تعلیم کے سلسلہ میں ذکر ملتا ہے کہ انہوں نے باقاعدہ تلمذ کم لوگوں سے حاصل کیا اور اُن کے اساتذہ کا ذکر بھی نہیں ملتا کیونکہ درد کو بھی اپنے والد کی طرح اکتسابی علوم کی بجائے وہبی علم کی دولت حاصل تھی اور اُن کی تمام تر محنت معرفتِ الٰہی اور نسبت مع اللہ کی حصول کی خاطر تھی۔ درد کی تعلیم سے متعلق قاضی جمال حسین کا خیال یہ ہے:

''اپنے والد کے کہنے پر درد نے وسط جوانی میں علوم رسمیہ کی تحصیل کی، اور عقائد معقولات، اصول تصوف کے علاوہ بھی دیگر علوم بہ قدر ضرورت پڑھے۔ لیکن یہ علوم انہوں نے کس سے حاصل کئے اور کس کے شاگرد ہوئے؟ اس کی تفصیلات نہیں ملتیں''۔(31)

درد نے اوائل عمر میں ملازمت بھی کی بعد ازاں اپنی مرضی سے اسے ترک بھی کر دیا۔ ۲۹/سال کی عمر میں درد نے اپنے بزرگوں کی متابعت میں درویشی اختیار کر لی اور اپنے والد سے خلافت حاصل کی۔ اس کے بعد اپنے روحانی سلسلہ کی تشہیر میں جٹ گئے اور اس سلسلہ میں کئی تصانیف بھی تحریر کیں۔ قدیر احمد نے درد کی تصانیف کا ذکر یوں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اپنی عبادت و ریاضت، اپنی نظم ونثر، غرض دینی اور دنیاوی اپنی ہر دلچسپی کو آپ

نے اپنے سلسلہ کی تشہیر کا ذریعہ بنایا۔ ''واردات درد، علم الکتاب، نالہ درد، دردِ دل ،آہِ سرد، شمع محفل'' آپ کی نثری تصانیف ہیں۔ فارسی اور اردو شاعری کے دو علیحدہ دو اوین ہیں۔ ان سب شہ پاروں کا مقصد صرف طریقہ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترویج و ترقی ہے''۔(32)

درد کی روحانی وعرفانی رہبری کے ساتھ ساتھ شعری ذوق کی تربیت میں بھی والد مکرم حضرت ناصر عندلیب کا بڑا رول رہا ہے۔ اس عہد میں درد کے والد دہلی میں مختلف شعری محافل میں شرکت کرتے تھے اور وہ اپنے ہمراہ اپنے فرزند کو بھی لے جاتے۔ چنانچہ درد کی شعری تربیت میں یہ محفلیں ممد ومعاون رہیں۔ درد نظریاتی صوفی نہیں بلکہ عملی صوفی تھے اور صوفیہ کے مختلف مدارج سے کما حقہ واقف بھی تھے۔ ان کا کلام فارسی اور اردو مسائل تصوف سے پرنظر آتا ہے۔ درد کی عرفانی اور صوفیانہ شاعری کے ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ یوں گویا ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ درد کی عظمت اس بات میں منحصر نہیں کہ ان کے کلام میں صوفیانہ خیالات پائے جاتے ہیں، بلکہ اس بات میں ہے کہ ان کی شاعری ایک صوفی کی شاعری معلوم ہوتی ہے۔ ایک صوفی کی شاعری نہ صرف اس بناء پر کہ اس میں صوفیانہ عقائد و مسائل کا تذکرہ ہے۔ بلکہ اس بناء پر بھی کہ ان کی ساری شاعری کا لب ولہجہ سے میری مراد یہ ہے کہ ان کے سوچنے اور کہنے کا ڈھنگ غیر صوفی شعراء سے مختلف ہے یعنی معنوی اور خارجی دونوں اعتبارات سے ان کی شاعری پر صوفیانہ زندگی اور ذہن کی چھاپ ہے''۔(33)

درد کی اردو شاعری کمیت کے لحاظ سے مختصر ہے مگر کیفیت کے اعتبار سے خزینہ تصوف ہے۔ جس میں معرفت اور حقیقت کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ درد کی طرزِ ادا بھی اتنی پراثر ہے کہ اس کے اثرات دل پر مرتب ہوتے ہیں اس اثر انگیزی کی وجہ درد خود بیان کرتے ہیں جسے قاضی جمال حسین نے اپنی تصنیف میں تحریر کیا ہے:

''درد کا موقف یہ تھا کہ کلام میں تاثیر صفائے قلب سے پیدا ہوتی ہے، اور بات میں اثر درد دل سے آتا ہے۔ اگر قلب باصفا ہے اور دل درد سے پُر ہے تو ہر بات نالۂ درد اور آہِ سرد بن جائیگی''۔(34)

دردؔ نے راہِ سلوک اور تصوف کی منزلوں کو شعری پیراہن عطا کیا ہے۔صوفیہ کی بعض اہم اعمال، اشغال اور صحت مند روایتوں کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔انہوں نے فقر کی تعلیم، تربیت کے ساتھ ساتھ اس کا مقام و مرتبہ کو بھی واضح کرنے کی سعی کی ہے۔اس سلسلہ میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دولت ِ فقر کے حضور، گرد ہے جاہ و سلطنت
کہتے ہیں یاں جسے ہما ، اپنی نظر میں زاغ ہے

....

نہ یاں قصہ سکندر کا ، نہ مذکور سلیمانی
ہماری بزم میں ہوتا ہے اور ہی ذکر سلطانی

....

زنہار ، ادھر کھولیو مت چشمِ حقارت
یہ فقر کی دولت ہے کچھ افلاس نہیں ہے

''قناعت''، ''قبض وبسط'' کی راہ تصوف میں اہمیت ہے، چنانچہ قناعت پسندی کو دنیا کی کوئی طاقت اپنے مقاصد سے باز نہیں رکھ سکتی، جب سالک حق وصداقت کی منزل تک پہنچتا ہے تو اس کا قلب صاف وشفاف ہوجاتا ہے اور اللہ تبارک تعالی کی جانب سے حق وصداقت کا صدور ہوتا ہے۔صفیہ کے یہاں جلوۂ حق بند ہونے کی قبض اور کھل جانے کو بسط کہتے ہیں۔لہٰذا ان کیفیات کا بیان دردؔ کے درج ذیل اشعار میں محسوس کیا جاسکتا ہے:

نہ مطلب ہے گدائی سے،نہ یہ خواہش کہ شاہی ہو
الٰہی!ہووے وہ ، جو کچھ کہ مرضی ِ الٰہی ہو

....

ہم بھی فلک سے کرتے سو چیز کی طلب
ڈھونڈ ھا ، پر اپنے دل میں تو کچھ چاہ ہی نہیں

....

ہم سے دل مردہ اگر رات کے جاگے تو کیا

چشم بیدار تو ہے پر دل بیدار نہیں

....

اس کی باتیں مجھ سے کیا پوچھو ہوتم
مدتیں گذریں کہ دیکھا ہی نہیں

....

رک نہیں سکتی ہے یاں کی واردات
کب یہ ہوسکتا ہے دریا تھم رہے

....

ہر آن ہے واردات قلب پر
آتا ہے یہ قافلہ کہاں سے

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ذرہ ذرہ میں خدا ہے یعنی اللہ کی جلوہ نمائی ہر جگہ موجود ہے اس کے لیے کوئی مخصوص جگہ نہیں ہے۔ مگر یہ شان جلال ہے کہ اس نے انسان کو مظہر صفات الٰہی کا مرکز بنایا ہے۔انسان کیا دنیا کی ہر چیز اللہ کے نور سے روشن ہے ۔صوفیہ کے یہاں مثل بوئے گل کا جلوہ دیکھنے کے لیے،چشم بینا چاہئے اور صدائے حق کے لیے، پردۂ ساز سے دنیا مشاہدہ نیز ،مظہر صفات الٰہی،عرفان خداوندی حاصل کرنے کے لیے خودی کی نفی ضروری ہے سالک کے لیے ضروری ہے کہ وہ خودی کی منزل سے گزرتے ہوئے فنا فی اللہ کی لذت سے آشنا ہو جائے اور اہلِ عرفان جزو اور کل کا مشاہد بھی کرتے ہیں۔غرض کائنات میں انسان ہی کی ہستی خداوندے قدوس کی صفات کا مظہر کہلاتی ہے۔اس کے باوجود خدا کی بزرگی،عظمت ورفعت اور برتری کا ادراک انسان کے بس کی بات نہیں مگر اللہ جسے چاہتا ہے اس کو وہ تمام نعمتوں سے سرفرازی عطا کرتا ہے مگر صوفیہ اور اللہ تعالی کے مقرب بندے ان صفات سے متصف ہوتے ہیں۔اس طرح کی مختلف کیفیات کو دردؔ نے صوفیانہ اور عارفانہ پیکر میں ڈھالا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

چھپے ہرگز نہ مثل بو وہ پردوں کے چھپائے سے
مزا پڑتا ہے جس گل پیرہن کو بے حجابی کا

....

اے درد اس جہان میں آ کر صدائے غیب
بے پردہ ہووے جس سے وہ پردہ ہے ساز کا

....

ماہیتوں کو روشن کرتا ہے نور تیرا
اعیان ہیں مظاہر ،ظاہر ظہور تیرا

....

حجاب رخ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا

....

نہ ہم غافل ہی رہتے ہیں نہ کچھ آگاہ ہوتے ہیں
انہیں طرحوں میں ہم ہر دم فنا فی اللہ ہوتے ہیں

....

ازبسکہ ہیں محو لاتعین
ہرجا بے اعتبار ہیں ہم

....

کھلا ہے باب عرفاں جس کے اوپر
اُسے ہر ورق گل کا گلستاں

میر دردؔ نے اپنی شعری پیکر میں عظمتِ انسانی،عروج انسانی، دردانسانی،قلب انسانی اور مقامِ انسانی (آدمیت) غیرہ جیسی صفات کو عارفانہ رنگ میں پیش کرتے ہوئے انسان کی رفعت اور بزرگی کو نمایاں کرنے کی سعی جمیل کی ہے اس کے علاوہ دردؔ نے اپنے صوفیانہ اور عارفانہ کلام کے ذریعے کہیں کائنات میں انسانی وجود کی حقیقت،عشق کا سوز و ساز، احساس محویت،ترک دنیا،وحدت در کثرت،قولِ الست،شراب معرفت، جبریت اور بیعت وغیرہ کو شعری پیراہن عطا کیا ہے:

گر دیکھئے تو مظہر آثار بقا ہوں

در سمجھے ، جوں عکس مجھے محو فنا ہوں

....

ممنون مرے فیض کے سب اہل نظر ہیں
جوں نور ہر اک چشم کا دیدار نما ہوں

....

ہے مظہر ِ انور ِ صفا میر کدورت
ہر چند کہ آہن ہوں پر آئینہ بنا ہوں

....

احوال دو عالم ہے مری دل پہ ہویدا
سمجھا نہیں تا حال پر اپنے تئیں کیا ہوں

....

آواز نہیں قید میں زنجیر کے ہرگز
ہرچند کہ عالم میں ہوں عالم سے جدا ہوں

....

جلوہ تو ہر اک طرح کا ہر شان مین دیکھا
جو کچھ کہ سنا تجھ میں، سو انسان میں دیکھا

....

دونوں عالم سے کچھ پرے ہے نظر
آہ! کس کا دل و دماغ ہوں میں

....

دریائے معرفت کے دیکھا تو ہم ہیں ساحل
گردار ہیں تو ہم ہیں درپار ہیں تو ہم ہیں

....

باوجو یکہ پر و بال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

....

ہووے کب وحدت میں کثرت سے خلل
جسم و جاں گو دو ہیں پر ہم ایک ہیں

....

جو ہوئے ہیں قرار آپس میں
میں ترا اور تو مرا ہے گواہ

....

دے وہ شراب ساقی کہ تا روز ِ رسِ خیز
جس کے نئے کا کام نہ پہونچے خمار تک

....

زاہد اگر نہیں کی تو نے کسو سے بیعت
پیر مغاں کی ہاں کر دست سے بسو سے بیعت

خواجہ میر دردؔ نہ صرف شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت کے رمز شناس تھے وہ روحانیت کے علمبر دار اور صوفیانہ فکر ونظر کے نبض شناس بھی تھے۔ تصوف کے مختلف رموز کو درد نے تمام تر خوبیوں کے ساتھ پیراہن شعری سے صوفیانہ و عارفانہ تجربات کو تخلیق کے تقاضوں سے متصف کیا اور شاعری میں صوفیانہ رنگ کی ایسی آویزش کی کہ اردو شاعری میں فکر کی پاکیزگی اور تازگی پیدا ہوگئی۔ غرض دردؔ نے زمانے کی تمام تر حشر سامنیوں کے باوجود نظم وضبط اور صبر و استقلال کا دامن نہیں چھوڑا۔ یہ دراصل ان کے والد کی تربیت تھی کے دلی پر کئی آفتیں آئیں مگر دردؔ نے دہلی کو کبھی نہیں چھوڑا۔ عمر کی آخری سانس تک رشد و ہدایت کا کام انجام دیتے ہوئے 24 رصفر بروز جمعہ قبلِ صبحِ صادق 1199ھ مطابق ۱۱ رجنوری 1775ء چھیاسٹھ برس کی عمر میں واصلِ بحق ہوئے۔☆

میر تقی میرؔ:

اصل نام میر محمد تقی ، میرؔ تخلص ، 23۔1722ء اکبرآباد (آگرہ) میں محمد علی متقی کے گھر پیدا ہوئے۔میرؔ کے والد درویش صفتی کی اعلیٰ مثال تھے چنانچہ اکبرآباد میں اپنے زہد وتقویٰ کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔میرؔ کی ابتدائی تعلیم اور حالات کا تذکرہ بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی :

''میرؔ نے اپنے بچپن کے حالات میں سب زیادہ فقیروں اور درویشوں کی صحبت پر زور دیا ہے۔جن میں سید امان اللہ، احسان اللہ اور بایزید کا خاص طور پر (ذکر میر میں) ذکر کیا ہے۔میرؔ کے صوفیانہ کلام میں بار بار ان مضامین کی بازگشت ملتی ہے جو میر نے ان بزرگوں سے سنی تھی''۔(35)

میرؔ کی سیرت وشخصیت بننے میں عشق کا عنصر اہمیت رکھتا ہے۔ان کے والد کی ہمیشہ سے یہ تلقین رہتی تھی کہ بیٹا عشق سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔اس خصوص میں ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں :

''اے بیٹے عشق اختیار کر کہ (دنیا کے) اس کارخانے میں اسی کا تصرف ہے۔اگر عشق نہ ہو تو نظم کل کی صورت نہیں پیدا ہو سکتی۔سوز وساز دونوں عشق سے ہیں، عالم میں جو کچھ ہے وہ عشق ہی کا ظہور ہے''۔ (36)

میرؔ ایک نازک مزاج، قلندر صفت، عظیم شاعر تھے جنھوں نے ایک طویل عمر پا کر زندگی کے مختلف نشیب وفراز سے گزرتے ہوئے لکھنو میں 1810ء کو انتقال کیا۔

میرؔ ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے شاید اسی لیے یہ منفرد شخصیت کا پرتو ان کی شاعری کا بھی طرۂ امتیاز بنا رہا۔میر جس دور کی نمائندگی کر رہے تھے وہ زمانہ مسلسل مصائب وآلام سے گذر رہا تھا جو زمانے کے پیدا کئے ہوئے تھے۔اس لیے ان کی شاعری کو درد وکرب کا احساس دلانے والی اور قنوطی شاعری کی مثال بھی کا جا سکتا ہے۔زمانے کے مدوجزر اپنوں کی بے وفائیاں وغیرہ نے ان کے مزاج میں وہ کیفیت پیدا کر دی تھی کہ انہوں نے آپ بیتی کو جگ بیتی بنا ڈالا اور اسی احساسِ غم کو شعری سانچے میں ڈھال کر پیش کر دیا۔میرؔ کی شاعری کو مجموعی طور پر عشق اور درد وغم کا شاعر بھی کہہ سکتے ہیں۔میر نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے جس میں مثنوی، رباعی وغیرہ شامل ہیں مگر ان کی شاعری کا اصل غزل ہے۔اور ان کا غزلیہ اسلوب دو صدیاں گزر جانے کے باوجود تازگی وشگفتگی لیے ہوئے ہے۔

میرؔ کی شاعری کا داخلی پہلو بڑی اہمیت رکھتا ہے اور یہ داخلیت پسندی دبستان دلی کا اہم عنصر بن گیا ہے مگر ان کے شعری احساس میں خارجی عناصر بھی نمایاں ہوتے نظر آتے ہیں۔ حسن و عشق اُن کا خاص شعری موضوع رہا ہے۔ جس میں وہ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتے ہیں، اور اپنے باطنی کیفیات کو نہایت مصورانہ ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں، ڈاکٹر جمیل جالبی میرؔ کی غزل کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کی غزل کی ایسی بہت سی خصوصیات ہیں جن پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے مثلاً میرؔ کی شاعری میں قدرتی مناظر ان کے جذبے کا حصہ بن کر آتے ہیں، ایک ایسی تصویر جو آئینہ کی طرح صاف تو ہے لیکن جسے مصور اپنے موقلم سے صفحۂ قرطاس پر بنانا چاہے تو منہ سے خون تھوکنے لگے۔ میرؔ اپنے تخلیقی عمل سے آنکھوں کے سامنے لفظوں سے ایسی صاف تصویر لا رکھتے ہیں جسے رنگوں سے ابھارنا ممکن نہیں ہے۔ اس میں میرؔ مخصوص طرز و آہنگ کی وہ جھنکار موجود ہے جو میرؔ کے ہر رنگ کو ایک نیا اچھوتا رنگ بنا دیتی ہے۔ یہ تصویریں بظاہر خارجی رنگ لئے ہوئے ہیں لیکن یہ میرؔ کے باطن سے خارج میں آتی ہیں''۔(37)

میرؔ کی شاعری ہر زمانے کے فرد کی دل کی آواز ہے تو ہر زمانے میں ان کی آواز کو محسوس کیا جائے گا اور اس کیفیت کو آفاقیت کہا جاسکتا ہے:

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہیگا

....

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

میرؔ کی شاعری میں داخلی سوز و ساز کا اظہار ملتا ہے جس میں عشق کی نیرنگیاں غالب نظر آتی ہیں۔ اس طرح ان کا کلام صوفیانہ کیفیات سے بھی متصف ہوجاتا ہے۔ میرؔ باضابطہ صوفی نہیں تھے، مگر صوفیانہ مزاج و منہج ان کی شخصیت اور شاعری میں موجود تھا۔ اس لیے ان کا کلام اسرارِ دل سے معمور تھا۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ عشق کی کیفیات سے پر نظر آتا ہے۔ میرؔ نے

عشق کے تصورات کو شعری اظہار و بیان سے معمور کر دیا اور اس تصورِ عشق کو حزن و ملال کے ساتھ پیش کرتے ہوئے ایک وحدت بنا دیا۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> ''میرؔ کے نزدیک عشق ہی خالق، عشق ہی خلق اور عشق ہی باعثِ ایجادِ خلق ہے۔۔۔۔۔زندگی تلاشِ عشق ہے اور دل عشق کا مقامِ خاص ہے۔ خود آگاہی یہیں سے حاصل ہوتی ہے، اس خود آگاہی سے بندہ خود معبود ہو کر اپنی علویت کا اظہار کرتا ہے، اس کی خودی گم ہو جاتی ہے اور فرد و کائنات ایک وحدت بن جاتی ہے''۔(38)

عشق کی شاید ہی کوئی ایسی کیفیت ہو جس کا اظہار میرؔ نے نہ کیا ہو۔ عشق کی کیفیات کے کچھ رنگ ملاحظہ فرمائیں:

یارب کوئی تو واسطہ سرگشتگی کا ہے
یک عشق بھر رہا ہے زمین آسمان میں

....

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

....

عشق معشوق عشق عاشق ہے
یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق

....

ہیں مسلمان اُن بتوں سے ہمیں
عشق ہے لا الہ الا اللہ

....

کیا حقیقت کہوں کہ کیا ہے عشق
حق شناسوں کے ہاں خدا ہے عشق

....

کون مقصد کو عشق بن پہنچا
آرزو عشق مدعا ہے عشق

....

لوگ بہت پوچھا کرتے ہیں کیا کہئے میاں کیا ہے عشق
کچھ کہتے ہیں سرِ الٰہی کچھ کہتے ہیں خدا ہے عشق

راہِ عشق اتنی آسان نہیں۔اس راہ میں مصائب و مشکلات ہیں اور جان و ایمان کا بھی خطرہ ہے۔:اگر سالک کو منزل عشق مل گئی تو سمجھو کہ یہ طریقت کی انتہا ہے اور اس مقام پر پہنچ کر سالک مذہب و ملت، کعبہ و بت خانہ وغیرہ اسے یکساں دکھائی دینے لگتے ہیں، میرؔ کہتے ہیں:

عشق صمد میں جان چلی وہ چاہت کا ارمان گیا
تازہ کیا پیمانہ صنم سے دین گیا ایمان گیا

....

گئے عشق کی راہ سر پر قدم
بلا پر چلے آئے ہر ہر قدم

....

میرؔ کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو تم ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترکِ اسلام کیا

صوفیہ کے یہاں ''دل'' کو عشق کا مقام قرار دیا گیا ہے ہے اس لئے میرؔ کے یہاں بھی دل کا مقام بڑا اعلیٰ و ارفع ہے۔مزید میرؔ کہتے ہیں کہ صفائی قلب کے بغیر عشق کی جلوہ گری ممکن نہیں اس لیے عاشق کو چاہئے کہ وہ صفائے قلب و نظر پیدا کرے اور جس کسی کا قلب و نظر مصفا نہیں ہوتا وہ معشوق کے دیدار سے محروم ہوتا ہے:

طریق عشق میں رہنما دل
پیمبر دل ہے قبلہ دل خدا دل

....

عرش و دل دونوں کا ہے پایہ بلند
سیر رہتی ہے ان مکانوں پر

....

دل نے ہم کو مثال آئینہ
ایک عالم کا روشناس کیا

....

صفائے دل جو ہوئی ٹک تو دیکھیں ہیں کیا کیا
ہم ایسے آئینے کو اپنے کیوں جلا نہ کریں

....

شیخ جو تھا دیدار بتاں کا منکر ایسا تھا معذور
دل کو بصیرت تھی نہ اُس کے بے نوری تھی بصارت میں

میرؔ صوفیانہ فکر و نظر کے نظریات سے کماحقہ واقف تھے۔اس لیے ان کے یہاں وجود و شہود کے تصورات بھی نمایاں ہوتے ہیں۔وجودیہ اور شہودیہ رمز کو میرؔ اس طرح بیان کرتے ہیں:

ہے ماسوا کیا جو میرؔ کہیے
آگاہ اس سے سارے ہیں آگاہ

....

اول کہ آخر، ظاہر کہ باطن
اللہ ہی اللہ ، اللہ ہی اللہ

....

حق ڈھونڈھنے کا آپ کو آتا نہیں ورنہ
عالم ہے سبھی یار کہاں یار نہ پایا

....

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس کا ہی ظہور تھا

....

یہ دو ہی صورتیں ہیں یا منعکس ہے عالم
یاعالم آئینہ ہے اُس یار خود نما کا

....

جو خوب دیکھوتو ساری وہی حقیقت ہے
چھپانا چہرے کا عشاق سے تکلف تھا

تصوف میں ''انسان'' کی ذات کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہی ذات عرفانِ خدا کا ذریعہ ہے۔میرؔ حقیقت انسانی اورعظمت انسانی کومعرفت انگیز طرز میں بیان کرتے ہیں۔شعر ملاحظہ ہوں:

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ
ہم نہ ہوئیں تو پھر حجاب کہاں

....

تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم یہ فہم کا اپنی قصور تھا

....

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں

خانقاہی نظام میں ''من عرف نفسہ فقد عرف ربہ'' کا درس دیا جاتا ہے جس سے انسان خودآ گہی سے واقف ہوتا ہے۔صوفیہ کے یہاں اس کی اہمیت مسلم ہے۔میر کے یہاں بھی اس طریق کے مختلف اشعار ملتے ہیں جس میں عرفانِ نفس اورخودآ گہی کے پہلونکل آئے ہیں۔شعر ملاحظہ فرمائیں:

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں

معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

....

خلطہ ہمارا اس کا حیرت ہی کی جگہ ہے
ڈھونڈا جہاں پہ اس کو واں آپ ہی کو پایا

....

حقیقت نہ میرؔ اپنی سمجھی گئی
شب و روز ہم نے تامل کیا

....

تلاش اپنی نہ کم تھی جو وہ ملتا
بہت میں دیکھ کر آخر رہا بیٹھ

....

من میں جب تک ہے جاں تکلیف ہے
ہم میں بھی اس میں ابھی حجاب ہے میاں

غرض میرؔ کے یہاں راہ سلوک کے تمام تر امکانات پائے جاتے ہیں۔ان کے یہاں حق شناسی، تلاش وجستجو، مقام حیرت، فنافی اللہ، بے خودی، توکل، وغیرہ کیفیات کا بیان ملتا ہے:

آخر کو مرگئے ہیں اُس کی ہی جستجو میں
جی کے تئیں بھی کھویا لیکن اُسے نا پایا

....

ہر صبح اُٹھ کے تجھ سے مانگوں ہوں میں تجھی کو
تیرے سوا میرا کچھ مدعا نہیں ہے

....

حیرت حسن یار سے چپ ہیں

سب سے حرف و کلام ہے موقوف

....

محو کر آپ کو یوں ہستی میں اس کی جیسے
بوند پانی کی نہیں آتی نظر پانی میں

....

کچھ نہ دیکھا پر بجز اک شعلہ پُر پیچ و تاب
شمع تک ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

....

آپ کو اب کہیں نہیں پاتے
بے خودی سے گئے ہیں کدھر ہم

....

ہے توکل جب سے ہم درویش ہیں
کر ہی چکتے ہیں جو کچھ دل میں ٹھنے

میر تقی میر ایک عہد ساز شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی فکر وفن اور اسلوب نہ صرف متقدمین و معاصرین سے جداگانہ تھا بلکہ متاخرین نے بھی طرز میر کو اپنانے کی کوشش کرتے رہے مگر جو طرز و اسلوب میر کا رہا وہ یکتائے زمانہ تھا۔ میر کو کسی نے رومانوی شاعر کہا تو کسی نے قنوطی تو کسی نے صوفی شاعر اور کسی نے کچھ اور کہہ دیا۔ میر کی شاعری کو مخصوص و محدود نہیں کیا جا سکتا۔ میر آفاقی شاعر ہونے علاوہ پوری زندگی کے شاعر ہیں جس میں سماج و سوسائٹی کے تمام مد و جزر ان کی شعری فکر کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ میر کی الم ناکی اور دردانگیزی میں متصوفانہ خیالات بھی مترشح ہو رہے ہیں ان کے یہاں عشق مجازی عشق حقیقی کا زینہ بنا ہوا ہے چونکہ میر کے شعری رویوں میں داخلیت پسندی غالب ہے اور اس داخلی اظہار نے ان سے متصوفانہ کیفیت کا اظہار کروایا ہے۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ عشق کی کیف و مستی سے معمور رہا ہے میر نے اس تصور کو اپنی شعری حس کے ذریعہ اپنے تخیل کا حصہ بنایا اور جذباتی سطح پر اس میں حزن و یاس کو ملا کر ایک وحدت تاثر بنا دیا۔ اور اس طرح ان کا ایک منفرد اور حاویانہ اسلوب پوری اٹھارویں صدی کو محیط ہے۔ ☆

شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ:

مصحفیؔ کا مکمل نام غلام ہمدانی ہے اور ان کے والد کا نام شیخ ولی محمد تھا۔ مصحفیؔ کے حالات میں ان کی سنہ پیدائش اور تاریخ وفات کے سلسلے میں تذکروں میں اختلاف ہے۔ سیدہ جعفر کے مطابق ان کی ولادت 1747ء اور وفات 1824ء بتائی جاتی ہے۔ ابتداء میں ان کا قیام امروہہ میں بھی رہا ہے جس کے بارے میں تاریخ میں آتا ہے کہ وہاں علوم وفنون کی ریل پیل رہی ہے اور مصحفی کی تعلیم وتربیت اور ادبی مذاق میں اس مقام کا اہم رول رہا ہے جہاں انہوں نے اوائل عمری میں شعر وسخن کی ابتداء میر عبدالرسول کی نگرانی میں شروع کی۔ بعد ازاں 1768ء میں مدرسہ غازی الدین خاں دہلی میں فخر الدین چشتی کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ لڑکپن سے ہی ان کے مزاج میں صوفیانہ رنگ وآہنگ تھا۔ لہذا بقول صاحب ''آب حیات'':

> ''ابتداء سے غربت اور مسکینی اور ادب کی پابندی طبیعت میں تھی۔ ساتھ اس کے خوش خلقی اور خوش مزاجی تھی جس نے بزرگان دہلی کی صحبتوں تک رسائی دی تھی''۔(39)

دہلی میں مصحفیؔ کے قیام کے دوران اس عہد کے مسلم الثبوت قلم کاروں جیسے میرؔ، دردؔ، حاتمؔ، مظہر، اور سوداؔ وغیرہ سے ان کے مراسم رہے۔ مصحفیؔ کے مزاج میں وسیع المشربی تھی۔ ہر تکلیف کو صبر ورضا کے ساتھ سہتے اور عفوودرگزر ان کے مزاج میں داخل تھی اور بغض وکینہ سے ہمیشہ دور رہے۔ انہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

کسی سے رکھتا نہیں مصحفی میں دل میں غبار
کہ مثل آئینہ عالم ہے یاں صفائی کا

اس اثناء میں دہلی پر تباہی کے بادل منڈلانے لگے تو دہلی سے ترک سکونت اختیار کرتے ہوئے ۱۷۸۳ء کو لکھنو منتقل ہوئے۔ یہاں پر بھی اس دور میں انہیں صوفیانہ ماحول ملا جس کی بدولت ان کا رجحان متصوفانہ رہا۔ اس عہد کے لکھنوی ماحول کے ضمن میں ڈاکٹر سید عبدالباری رقم طراز ہیں:

> ''اس عہد کے تصوف پر محی الدین ابن العربی کے فلسفۂ وحدت الوجود کا خاص اثر تھا، تصوف پسند طبائع لکھنو کے اس عہد کے معاشرہ میں موجود تھیں مگر اب خانقاہوں میں تو ہم پرستی کا چراغ جلانے والوں کی بھی پذیرائی ہوتی تھی۔ وحدت الوجود کا

موضوع اس وقت یوں بھی معروف ومشہور تھا کہ مثنوی مولانا رومؒ بڑے ذوق شوق
سے پڑھی اور سنی جاتی تھی۔ اور مدارس میں شیخ کبیر (محی الدین ابن عربی) کے
اقوال کی تشریح وتفسیر نصاب کا جزو تھی''۔(40)

لہذا مصحفی کے یہاں بھی اس ماحول کی بھرپور نمائیندگی محسوس کی جاسکتی ہے جس میں ان کی پرورش ہوئی تھی چنانچہ اس دور کے اثرات کو قبول کیا۔ ہمہ اوست کی گونج ان کے کلام میں سنائی دی جانے لگی اور اس نظریہ کا عکس ان کے درج ذیل اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے:

مخلوق ہوں یا خالق مخلوق نما ہوں
معلوم نہیں مجھ کو کہ میں کون ہوں کیا ہوں

....

ہوں شاہد تنزیہ کے رخسار کا پردہ
یا خود ہی میں شاہد ہوں کہ پردے میں چھپا ہوں

....

گوش شنوا ہو تو مرے رمز کو سمجھے
حق یہ ہے کہ میں سازِ حقیقت کی نوا ہوں

....

کرتے ہیں رُخ اس آئینہ خانہ میں ہم جدھر
اپنی ہی شکل آتی ہے ہر جانظر ہمیں

دیوانِ مصحفی کے مقدمہ میں امیر مینائی نے مصحفی کے تعلیمات کو پیش کیا جس میں وحدت الوجود کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ مصحفی اپنے اس مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''زندگی کو ذمہ داری کے ساتھ گذارنا اور ہر اگلے لمحہ پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ زندگی
کی آخر قدر موت ہے جو ہر ایک کی گھات میں ہے، موت زندگی کی سب سے بڑی
حقیقت ہے جو زندگی کو معنی دار بناتی ہے۔ اس میں معنی پیدا کرنے کیلئے شاید یہ

ضروری ہے کہ زندگی کے خالق کی توحید کا اقرار کیا جائے۔اور اس اقرار کے لئے اس دنیا میں اور زمانہ کی پوری کارگاہ میں اتنے شواہد ملتے ہیں، انسان کی فطرت اور کائنات کی ہیئت پر اتنی دلیلیں مہیا کر دیتی ہے کہ ماننا پڑتا ہے کہ اس کارخانہ کو چلانے والا کوئی ہے تو وہ ایک ہی ہے''۔(41)

مصحفی نے شریعت وطریقت، اور ظاہر و باطن دونوں کو اہمیت دیتے آئے ہیں اور انسان کی ذات کی بزرگی و رفعت اور عظمت انسانی کو اپنے کلام میں پیش کرنے کی سعی کی ہے اس کے علاوہ صوفیانہ و درویشانہ حیات اور ریاضت و مجاہدہ کی اہمیت کو بیان کیا ہے:

نہ شریعت نہ طریقت نہ حقیقت نہ مجاز
کون کافر مجھے کہتا ہے مسلمان ہے یہ

....

یہ کیا ہے کہ مجھ پر مرا عقدہ نہیں کھلتا
ہر چند کے خود عقدہ و خود کشا ہوں

....

اے مصحفی شانیں ہیں مری جلوہ گری میں
ہر رنگ میں میں مظہر آثارِ خدا ہوں

....

اک حرفِ کُن میں جس نے کون و مکاں بنایا
اے جانِ خلق تجکو جانِ جہاں بنایا

....

ہستی کو مری ہستی عالم نہ سمجھنا
ہوں ہست مگر ہستی عالم سے جدا ہوں

راہ سلوک کی مختلف کیفیات کا تذکرہ بھی ان کے متصوفانہ ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔ان کے یہاں سالک کی

خاموشی، بے چینی، خود بینی، لذت وقرب کا ذوق وشوق کے ساتھ ساتھ وصل و دیدار میں ''دل'' کی کیفیت اور فراقِ یار میں اسی دل کی کیا حالت ہوتی ہے اس کا اظہار ہوتا ہے:

شب فِراق میں میں آہ و نالہ کیا کرتا
زبان کو درد و دل اپنا حوالہ کیا کرتا

....

نیرنگ حسن سے جو تری متصل ہوا
آئینہ ہزار نما اپنا دل ہوا

....

آئینہ وہ دیکھتا ہے عکس آئینہ اُسی
حال کھلتا یہیں سے ناظرو منظور کا

مصحفی نے ولی کا رنگ تغزل کو اپناتے ہوئے عشق کی مختلف النوع کیفیات اور عشق مجاز سے حقیقت تک رسائی وغیرہ کو بیان کیا ہے۔ وہ صوفی تو نہیں تھے مگر ان کے مزاج میں صوفیانہ فکر و نظر تھی جس کی وجہ سے ان کے فن میں متصوفانہ عادات واطوار کی بھرپور نمائیندگی ملتی ہے۔ انہی اوصاف کے باوصف ان کے یہاں 'وحدت الشہود' کا نظریہ اور میلان محسوس کیا جاسکتا ہے۔

قصہ عشق ہے وہ طول و طویل
جس کا انجام ہے نہ کچھ آغاز

....

کس سے کہیں آہ کیا ہوتا ہے عشق
کچھ نہ پوچھو بدبلا ہوتا ہے عشق

....

منظور کب تھا کعبہ و بتخانہ دیکھنا
دونوں جگہ تھا جلوۂ جانا نہ دیکھنا

☆

شیخ امام بخش ناسخ:

ناسخ کے سالِ ولادت سے متعلق کافی اختلافات ہیں۔اسی طرح سال وفات بھی مختلف فی مسلہ ہے کیونکہ تذکروں میں ناسخ کی عمر ۶۴۔۶۵ سال بھی آئی ہے اور سو سال کا ذکر بھی ملتا ہے۔جناب کاظم علی خاں نے ناسخ کی پیدائش اور وفات کا ذکر اُن کے ہم عصر شعراء کے ساتھ کیا ہے۔ولادت 7 رمحرم 1186ھ مطابق جمعہ 10 راپریل 1772ء، وفات 24 رجمادی الاولیٰ 1254ھ مطابق شنبہ 16 راگست 1838ء بتایا ہے۔(42) ناسخ کے خاندن اور والد کے حالات سے متعلق تمام تذکرے خاموش ہیں لیکن محمد حسین آزاد نے بتایا ہے کہ "خاندان کے باب میں فقط اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ (ناسخ) خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے تھے۔اور بعض اشخاص کہتے ہیں کہ کسی دولت مند لاولد نے متبنیٰ لیا تھا اصلی والد عالم غربت میں مغرب سے مشرق کی طرف چلے گئے۔(43) شیخ امام بخش ناسخ لکھنو میں محلہ ٹکسال میں رہتے تھے، ایک شخص حاجی وارث علی شاہ سے ابتدائی کتابیں پڑھیں اور بعد ازاں علمائے فرنگی محل سے درسی کتابیں پڑھ کر تحصیل علم کی۔(44)

اُردو غزل میں صوفیانہ اثرات ابتداء سے ہی محسوس کئے جاسکتے ہیں اور اسی لطیف اثرات کا ثمرہ ہے کہ اُردو غزل کو سنوارنے اور سجانے اور اس کے ارتقاء میں صوفی اساس معاشرہ کا اہم رول رہا ہے۔ناسخ نے جس دور میں شاعری کی ابتداء کی اس وقت لکھنو میں جرأتؔ، مصحفیؔ، انشاءؔ اور میرؔ کی آواز گونج رہی تھی اور میر حسن اور سوداؔ کی حیات کا چراغ گل ہو چکا تھا۔لکھنو میں نئی تہذیب کی آمد آمد تھی۔ہر طرف گل وبلبل کی شاعری کا چرچہ تھا۔اس طرح شاعری میں خارجیت کے علاوہ معاملہ بندی اور صنائع کا دور دورہ بھی تھا۔لکھنو کے زوال آمادہ معاشرہ میں ناسخ نے درویشانہ زندگی کو اپنا شعار بنایا۔ان کے مزاج میں خلق و مروت اور حسن واخلاق نمایاں تھے۔محمد حسین آزاد نے انہیں خوش اخلاق لکھا ہے مگر اپنی دنیا میں مگن رہنے کی وجہ سے لوگ انہیں تنگ مزاج سمجھا کرتے۔ناسخ کا یہ شعر ان کے مزاج کی غمازی کرتا نظر آتا ہے:

میں گو کہ حُسن سے ظاہر میں مثل ماہ نہیں
ہزار شکر کہ باطن مرا سیاہ نہیں

ناسخ لکھنوی تہذیب کے پروردہ رہنے کے باوجود ان کے مزاج میں نہ صرف درویشانہ وصف تھا بلکہ اس وصف کو ان کے کلام میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔اس ماحول سے انہوں نے تصوف کے اثرات کو اپنے فکر ونظر کی مناسبت سے قبول کیا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے فارسی کی روایت سے خواجہ حافظ اور اردو شاعری میں درد کے اثرات کو قبول کیا ہے جس کی وجہ

سے ان کا کلام رنگ تصوف سے معمور نظر آتا ہے۔ رشید حسن خاں اسی روایت کا ذکر کرتے ہیں:

''اُردو غزل کی وہ روایت جو ایک مدت سے اپنا اثر ڈال رہی تھی جو زبان کے ریشے ریشے میں بس گئی تھی اور جس روایت کے زیر سایہ ناسخ نے آنکھ کھولی تھی، اس کا کچھ اثر تو نمایاں ہونا ہی تھا'' (45)

مزید اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

''ان کے یہاں اگر کچھ سادہ و صاف شعر مل جاتے ہیں یا کہیں ناسخی رنگ کے بجائے کوئی اور رنگ چمک گیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ناسخ نے کبھی میرؔ دردؔ اور سوداؔ کے انداز کو بھی اپنانے کی کوشش کی ہے'' (46)

درج ذیل اشعار سے بھی ناسخ کی اپنے اساتذہ سے محبت کا اندازہ ہوتا ہے:

مست ناسخ مجھے رکھتا ہے کلامِ حافظؔ
میرے ساغر میں بہ جز بادۂ شیراز نہیں

....

حاضر ہے قتل ہونے کو ناسخ بھی مثل دردؔ
گر نام عاشقی ترے نزدیک ننگ ہے

....

کون سی طرزِ سخن ہے جو اسے آتی نہیں
کیوں نہ ہو، شاگرد ہے ناسخ ہر اک استاد کا

ناسخ کے یہاں خدا کی وحدانیت و قربت اور رسول ﷺ کی رسالت و محبت اور وہ والہانہ عشق رسول ﷺ کا اظہار ان اشعار میں نمایاں ہوتا ہے:

منہ ان کا نہیں ہے شکر ورنہ
ہر بت کہتا کہ میں خدا ہوں

....

تلاش جس کی ہے دن رات تجھ کو اے غافل
چھپا ہوا ہے تیرے ہی تن کے پردے میں

....

وہی عاشق ہے جو عالم کو مرقع سمجھے
ہر طرف پیش نظر یار کی تصویر رہے

....

روح ناسخ ہے اُسی کی روحِ اُقدس پر نثار
بار ہا جس کیلئے روح القدس نازل ہوا

....

سب ہوئے پیدا برائے مصطفی
جاں و دل سے ہیں فدائے مصطفیؐ

تصوف میں حیرت، فنا، خودی اور بے خودی وغیرہ جیسی اصطلاحات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ ناسخ نے دیگر شعراء کی طرح ان اصطلاحات کو کہیں یار کی جلوہ گری کو حیرت سے دیکھتے ہیں تو کہیں اپنے محبوب سے قربت کے لیے فنا کی منزل سے گزرنا چاہتے ہیں تو کہیں اپنی خودی کو مٹا کے حق کی تلاش کرتے ہیں تو کہیں بے خودی کے عالم میں سکر کی کیفیت کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔غرض ان کے یہاں تصوف کے مختلف موضوعات کی مرقع کشی ملتی ہے شعر ملاحظہ ہوں:

عالم حیرت ہوا عالم، دکھا اپنا جمال
منتظر آئینہ خانہ ہے تری تمثال کا

....

بحر فنا میں ضد ہے تعین سے یک دگر
پانی جو موج میں ہے، وہی ہے حباب میں

....

بجھ گیا میرا چراغ داغ، وصل یار میں
نورِ مہہ ، نزدیکی خورشید سے زائل ہوگیا

....

کب سے ناسخ کی جستجو تھی مجھے
آج وہ خانماں خراب ملا

....

کس کی ہم جستجو کو نکلے تھے
نہیں پاتے کہیں سراغ اپنا

....

بے خودی میں یہ کون یادآیا
خود بہ خود دل ہے بے قراراپنا

....

ہے عجب رنگ کی وحشت ترے دیوانے میں
جس میں نہ آبادی میں لگتا ہے نہ ویرانے میں

اردو شاعری میں اکثر شعراء نے عشقلکو مجاز سے حقیقت کی طرف جست لگانے کی بات کہی ہے۔اس کے علاوہ عشق اور سوزعشق کوراہ سلوک اور معرفت میں اس کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ ناسخ کے یہاں بھی ان کیفیات کا بیان دلچسپ انداز میں ملتا ہے:

یک بہ یک عشق سے کیوں کر ہو مرادل خالی
کہ بدن، جان سے ہوتا ہے بہ مشکل خالی

......

جیتے ہیں سوزِ عشق سے مانندِ شمع ہم
رتبہ ملا ہے آگ کو آبِ حیات کا

......

بتوں کے پردے میں ہم دیکھتے ہیں نور خدا
کہ صاف دیکھنے کی اے کلیم،تاب نہیں

......

طالبِ حق ہے اگر ، مت سالکوں کا ساتھ چھوڑ
مل گیا دریا میں، جو کچھ مل گیا سیلاب میں

......

سودائے عشق غیر کہاں ہے برنگ گل
اپنے ہی حسن پر میاں گریباں دریدۂ ہوں

اردو شعر وادب میں ناسخ کا نام اصلاح زبان کے لیے یاد رکھا جاتا ہے۔اگرچہ ان کے یہاں دبستان لکھنؤ کی شعری خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں تاہم ان کے دیوان میں متصوفانہ رنگ کے حامل اشعار بھی مل جاتے ہیں۔یہ اساتذۂ شعراء اور ان کے ہم عصر آتش کا اثر کہیے کہ ناسخ نے رنگ تصوف کو بھی اپنے کلام کا حصہ بنایا۔ ☆

بہادر شاہ ظفرؔ:

تاریخی،سماجی اور ادبی اعتبار سے بہادر شاہ ظفرؔ کا دور نمایاں حیثیت کا حامل رہا ہے۔مابعد میرؔ یہ عہد ادبی وشعری لحاظ سے زرین دور کہلاتا ہے۔اس عہد میں غالبؔ،مومنؔ اور ذوقؔ جیسے اساتذۂ سخن نے سانس لی ہے جن کے دم سے اردو شاعری کو رفعت حاصل ہوئی۔اکبر شاہ ثانی کے فرزند اور مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر جن کا پیدائشی نام ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ تخلص ظفر کی ولادت 14/اکتوبر 1775ء کو دہلی اور وفات 7/نومبر 1862ء رنگون میں ہوئی۔بہادر شاہ ظفرؔ کی تعلیم وتربیت ایک شاہ زادہ کی طرح پورے آب وتاب کے ساتھ ہوئی اور انہوں نے مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل کی۔وہ لڑکپن ہی سے منکسر المزاج اور رقیق القلب تھے۔شاہانہ عیش وعشرت کے باوجود سادہ مزاجی ان کی شخصیت کا طرۂ امتیاز تھی۔اس ضمن میں اسلم پرویز رقم طراز ہیں:

''باوجود عظمت وشوکت وجلال وجبروت خداداد جملہ علم وفضل وعجز وانکساری وکسرِ نفسی وحلم وترحم وحسن خلق سے آراستہ وپیراستہ تھے۔عجز وانکساری مزاج

اقدس امتزاج میں اس درجہ تھا کہ خود کو ادنا بندگانِ بارگاہِ احدیت کے برابر
متصور رفرماتے تھے‘‘(47)

ظفر کی سادہ لوحی اور منکسر المزاجی ان کے درج ذیل اشعار سے بھی لگائی جاسکتی ہے:

صوفیوں میں ہوں نہ رندوں میں نہ مے خواروں میں ہوں
اے بتو بندہ خدا کا ہوں گنہ گاروں میں ہوں

......

حاضر ہے دل و جاں کہ ظفرؔ یار کے آگے
کچھ دل کی حقیقت ہے نہ کچھ جاں کی حقیقت

بہادر شاہ ظفر کو صوفیہ اور اولیاء سے حد درجے محبت اور عقیدت تھی۔لہٰذا انہیں مشائخ چشت میں مرید و خلافت حاصل رہی۔ آپ کے مرشدِ گرامی حضرت غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب نبیرۂ مولانا فخر الدین تھے۔اپنے پیر سے وابستگی ظفر کے اس شعر سے بھی ہو جاتی ہے:

مرید قطب ِدیں ہوں، خاک پائے فخرِ دیں ہوں میں
اگرچہ شاہ ہوں ان کا غلام کمتریں ہوں میں

بہادر شاہ بزرگان دین کے مزارات پر حاضری دینے پر فخر محسوس کرتے۔دہلی کے مختلف صوفیہ کے مزارات پر اکثر

حاضر ہوتے شاہ کو حضرت معین الدین چشتی علیہ ورحمتہ کی بارگاہ میں بھی حاضری دینے کی سعادت حاصل ہو چکی ہے۔ان کی بزرگان دین سے عقیدت ہی تھی اور ان بزرگوں کی دعائیں کہ عوام میں وہ بے حد مقبول تھے اور رعایا انہیں عقیدت اور محبت سے پیش آتی ان سے بیعت کرتے ہوئے دعائیں بھی طلب کرتیں۔ اس سلسلہ میں سید ضمیر حسن دہلوی لکھتے ہیں:

’’ظفرؔ خود بھی بیعت کرواتے تھے،لال قلعے میں روحانیت کے باقاعدہ درس ہونے لگے تھے اور ظفرؔ خود رموز و نکات بیان فرماتے تھے،اپنے کلام میں انہوں نے جگہ جگہ تحصیل معرفت کا اشتیاق ظاہر کیا ہے۔آگے لکھتے ہیں وہ

بے تاب نظر آتے ہیں کہ کوئی صاحب نظر اُن کی دست گیری کرے اور وہ دولتِ عرفان حاصل کرسکیں۔ البتہ متصوفیانہ کلام کا بیش تر جز انہوں نے باکمال صوفی کی حیثیت سے نہیں محض ارادت مند کی حیثیت سے کیا ہے۔ ان کا تصوف تمام تر مستعار تھا تاہم بعض نظریات ان کے دل کو لگ گئے تھے انہی میں سے ایک انسان کی اہمیت بلکہ عظمت کا اعتراف ہے''(48)

بہادر شاہ ظفرؔ نے شاعری کی ابتداء میں شاہ نصیر اور ذوق کو اپنا شعری رہبر و رہنما بنایا۔ ابتداء میں شاہ نصیر کے رنگِ سخن کو اپنایا اور اس کے بعد ذوقؔ کو اپنا استادِ سخن بنایا اور وہ ذوق کے رنگ کے نہ صرف مداح تھے بلکہ ان سے بے حد متاثر بھی تھے۔ وہ کہتے ہیں:

تیرا مذاقِ شعر ظفرؔ جانتا ہے کون
استاد ذوق تھا ترے واقف مذاق سے

ان کے علاوہ غالب، سے بھی مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ لیکن غالبؔ کے فلسفیانہ مزاج کے اثرات ان کے یہاں محسوس نہیں کئے جاسکتے۔ اس بابت اسلم پرویز کہتے ہیں:

'' ذوقؔ اور غالبؔ جیسے استادانِ فن سے مشورۂ سخن ان تمام چیزوں نے مل کر یقینا ظفرؔ کے مذاقِ سخن کو نکھارا ہے لیکن یہ بات واضح کردی جائے کہ جہاں تک طرزِ سخن کا تعلق ہے، وہ ظفرؔ کا اپنا تھا جس میں ان کی شاعرانہ انفرادیت پوری طرح جھلکتی تھی''(49)

ظفرؔ کے چار دیوان جوان کی حین حیات میں شائع ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی دو نثری تصانیف ''تالیفات ابوظفری'' (1811ء اور ''خیابانِ تصوف'' 1813ء میں مکمل ہوئی۔ انکے فکر و فن میں پختگی، اثر انگیزی، دلبستگی اور شیفتگی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ کلامِ ظفر سے ان کی درویش صفتی، بے ریائی، بے باکی و حق گوئی، عدل و منصفی انسان دوستی، ادب نوازی، خوش خلقی،، موسیقیت نوازی، جدت پسندی، رنگین بیانی، پرگوئی، بے بسی اور مظلومی وغیرہ نمایاں ہوتی ہیں۔ ظفر بیک وقتؔ بادشاہ، صوفی، اہل زبان، اور دردمند انسان تھے۔ ان کے کلام پر ان کی شخصیت کے یہ تمام پہلو واضح ہوتے ہیں۔

ظفرؔ نے اپنے کلام میں انسان کے مقام و مرتبہ کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان کی عظمت و رفعت اُن کے

یہاں اہمیت کی حامل نظر آتی ہے وہ ''عظمتِ انسانی'' کے پہلوؤں سے بھی اپنی شعری کائنات سجائی ہے:

خود پرستی بُت پرستی سے نہیں کم اے ظفرؔ
جس نے چھوڑی خود پرستی بُت پرستی چھوڑ دی

....

قدرتِ حق کا تماشاہ ہے ظفرؔ جیسے بشر
ایسا دنیا میں تو کوئی ہے ہی نہیں

....

عالمِ صورت میں تو میں صورتِ آدم میں ہوں
عالمِ معنی میں لیکن اور ہی عالم میں ہوں

....

گرچہ کچھ بھی نہیں ہوں میں لیکن
اس پہ بھی کچھ نہ پوچھو کیا کچھ ہوں

....

حال نہیں کچھ کھلتا میرا کون ہوں کیا ہوں کیسا ہوں
مست ہوں یا ہشیار میں ہوں ناداں ہوں یا دانا ہوں

....

ظفرؔ ہے خاک کا پتلا یہ انساں
پر اسی میں بولتا کیا جانے کیا ہے

....

کچھ بھی نہیں اور سب کچھ ہوں گر دیکھو چشم حقیقت سے
میں ہوں ظفرؔ مسجود ملائک گرچہ خاک کا پتلا ہوں

ظفرؔ کے کلام میں کائنات کے ہر شئے میں وجود حقیقی کی جلوہ گری ہے تو کہیں دیدار عشق کے لئے دل کا مقام اور اس

سے آشنائی تو کہیں قلب کی اضطرابی کیفیت، اور معرفت کے نور سے بصارت و بصیرت بھی۔، اس کے علاوہ قرب کی کیفیت سے محو کا عالم عشق کی نیرنگیاں، سرمستیاں اور فنا و بقا کے رمز کی کیفیات کا اظہار جگہ جگہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔جس کے لیے انہوں نے مقام دل، عشق، انوارِ معرفت، قربیت اور ''محویت، عشق'' محاسبہ، ''حقیقت و مجاز'' دیدار عشق، فنا و بقا وغیرہ جیسے اصطلاحات کے ذریعے بیان کیا ہی:

ہر شئے میں ہے تو، جلوہ نما واحد و شاہد
اللہ ترا جلوہ ہے کیا واحد و شاہد

....

دیر و کعبے میں ڈھونڈتا کیا ہے
دیکھ دل میں کہ بس یہیں کچھ ہے

....

پسِ پردہ سُن کر تری صدا ترا شوقِ دید جو بڑھ گیا
مجھے اضطرابِ کمال تھا یہی وجد تھا، یہی حال تھا

....

بیچ میں پردہ دوئی کا تھا جو حائل اُٹھ گیا
ایسا کچھ دیکھا کہ دنیا سے مرادل اُٹھ گیا

....

جو تماشا دیکھ کر محو تماشا ہم ہوئے
کیا تماشا ہے وہی ہیں ہم تماشا ڈھونڈتے

....

مزہ رکھتا ہے زخم خنجر عشق
کبھی اے بوالہوس کھایا تو ہوتا

....

فنا ہے ساتھ تو پھر زندگی سے کیا حاصل
فنا سے پہلے فنا ہو کہ ہو بقا حاصل

....

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر، تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

....

کفر سے ایماں ملا اس ملک ہستی میں ہمیں
حق پرستی ہاتھ آئی بُت پرستی میں ہمیں

....

حق پرستی کا جنہیں دعویٰ تھا اپنے اے ظفرؔ
عشق کے ہاتھوں میں ہیں وہ بُت پرستی میں خراب

....

محو حیرت ہوں صورتِ تصویر
کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا

ظفر ایکؔ صاحبِ دل اور صاحب بصیرت شاعر ہیں اور اس لیے دل کے مقام سے آشنائی حاصل کی ہے۔انہوں نے دل کو نورِ الٰہی کے دیدارِ سے مصفیٰ کیا۔اس دیدار کے شوق کے لئے ان کے قلب کی اضطراری کیفیت نے ان کو وجد اور حال کا سرور پیدا کیا۔اس طرح معرفت کے نور سے بصارت،لذت عشق،قرب ومحو کی کیفیات کا والہانہ اظہار کرتے ہیں۔اس کے علاوہ محاسبہ، ہمہ اوستی کا نظریہ فنا،بقا،مجاز،حقیقت،حیرت و استعجاب وغیرہ کے اظہار سے ان کی شخصیت کے ساتھ ساتھ فکرو فن میں بھی صوفیانہ اقدار واقرار کی غمازی ہوتی ہے۔☆

خواجہ حیدر علی آتشؔ:

دبستان لکھنو کے شعر و ادب میں آتشؔ بحیثیت غزل گو اہمیت کے حامل نظر آتے ہیں اگر چہ ان کی شاعری دبستان لکھنو کی خصوصیات رکھتی ہے تاہم صوفیانہ افکار ونظریات بھی ان کے اشعار کا خاصہ ہیں۔ان کی شاعری ہی نہیں بلکہ ان کی

حیات کے مطالعہ سے ناقدین نے ان کی شخصیت میں صبر، رضا، خوداری، قناعت اور توکل وغیرہ جیسی صفات کی نشاندہی کی ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری بھی ان خصوصات سے متصف ہوتی رہی۔ آتش کے اجداد بغداد سے ترک سکونت کر کے دہلی پہنچے ۔ ان کا نسبی سلسلہ خواجہ ابو عبید اللہ اسرار تک پہنچتا ہے جن کا تعلق سلسلہ نقشبندیہ سے رہا ہے۔ اس طرح آتش کے والد خواجہ علی بخش، نواب شجاوع الدولہ کے دور حکومت میں فیض آباد منتقل ہوئے جہاں آتش کی ولادت 1192ھ مطابق 1878ء ہوئی۔ پیدائشی نام خواجہ حیدر علی اور آتش کے نام سے شعری دنیا میں معروف رہے۔ کم سنی میں والد کے سایہ سے محروم ہوئے اور ان کی تعلیم وتربیت صحیح سمت میں نہ ہوسکی۔ مطالعہ کے ذوق وشوق کی وجہ سے انہوں نے چند ابتدائی درسی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ عربی و فارسی زبانیں سیکھیں اور شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ ان کا کلام اردو کے علاوہ فارسی میں بھی ملتا ہے۔ مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرتے رہے مگر ان کا غالب میلان غزل گوئی کی طرف رہا۔ غزل کے علاوہ رباعی، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ بھی لکھا۔ آتش کے مزاج اور شخصیت کو محمد حسین آزاد کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ”آتش نے نہ امیروں کے درباروں میں جا کر غزلیں سنائیں، نہ ان کی تعریفوں میں قصیدے کہے۔ ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں جس پر کچھ چھپر سایہ کئے تھے، بوریا بچھا رہتا تھا، اس پر ایک لنگ باندھے صبر وقناعت کے ساتھ بیٹھے رہے اور عمر چندروزہ کو اس طرح گزار دیا، جیسے کوئی بے نیاز و بے پرواہ فقیر تکئے میں بیٹھا ہوتا ہے“۔(50)

آتش کی شخصیت اور شاعری میں مصحفی اور سید محمد سوز کا اہم رول رہا ہے۔ سوز کا تعلق صوفیانہ گھرانے سے تھا اور ان کا سلسلہ قطب عالم گجراتی سے تھا۔ اس کے علاوہ مصحفی سے بھی مشورۂ سخن کیا کرتے۔ مصحفی خود بھی صوفیانہ مزاج رکھتے تھے اور ان کی شاعری بھی اس خصوصیت کی غمازی کرتی ہے۔ دبستان لکھنو کے شاعروں میں صوفیانہ افکار صرف اور صرف مصحفی کی وجہ سے فروغ پاتے رہے اور اس روایت کو آگے بڑھانے میں آتش نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ بقول آعظمی :

> ”مصحفی کی شاگردی کے علاوہ آتش کا تصوف کی طرف اس لئے بھی میلان ہوا کہ ان کے خاندان میں درویشی کئی سو برس سے چلی آرہی تھی اور وراثت کے طور پر ان کی شخصیت کا ایک جز بن چکی تھی“۔(51)

آتش کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت انسان دوستی ہے۔ ان کا عہد ایک زوال آمادہ عہد تھا ہر طرف معاشرہ انحطاط اور

اخلاقی زوال کی طرف رواں دواں تھا اس کے باوجود اس زمانے میں کہیں کہیں احترام آدمیت کے نشان باقی تھے ایسے میں آتش کی شخصیت اور شاعری نے احترام آدمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صوفیانہ مزاج کی روایت کو باقی رکھنے کی سعی کرتے رہے۔

گنج پنہاں ہیں تصرف میں بنی آدم کے
کان سے لعل یہ دریا سے گہر لیتا ہے

....

ظہورِ آدم خاکی سے یہ ہم کو یقیں آیا
تماشا انجمن کا دیکھنے خلوت نشیں آیا

....

سمجھے آتش نہ کوئی آدمِ خاکی کو حقیر
نہیں اسرار سے یہ خاک کا پتلا خالی

....

جسمِ خاکی کے تلے جسم مثالی بھی ہے
اک قبا اور بھی ہم زیرِ قبا رکھتے ہیں

....

دیدہ ٔ عارف سے جب دیکھا تو یہ روشن ہوا
مظہر نورِ الٰہی حسنِ مشت ِخاک تھا

صوفیہ کرام نے انسان کی عظمت، احترام آدمیت کا جو درس دیا ہے اس کی روشنی سے سارا ہندوستان روشن ومنور رہا ہے۔صوفیہ کے اس رویے کو شاعروں نے بھی اپنایا اور اس خصوصیت سے پر اشعار بھی پیش کئے۔اور یہ روایت عہد بہ عہد تقویت پاتی رہی اور دبستان لکھنو بھی اس روش کو اپنایا بالخصوص مصحفی، اور آتش کی شاعری احترام آدمیت اور انسانی عظیمت کی آئینہ دار رہی ہے۔اس ضمن میں آلِ احمد سرور لکھتے ہیں:

''اُردو شاعری کی روایت اور ہندوستانی تہذیب کے مزاج سے زیادہ، یعنی

آتش اپنے دور کے نمائندے ہوتے ہوئے بھی انسان دوستی کی اس صالح روایت کے علمبردار ہیں جو ولی سے ہماری غزل میں اپنی بہار دکھاتی ہے اور جس کیلئے تصوف ایک سہارا اور رفیق ہے''۔(52)

آتش نے اپنی غزل گوئی کو عوامی جذبات و احساسات کا حامل بناتے ہوئے وسیع المشربی، قلندرانہ صفتی اور متصوفانہ جہتی سے متصف کرتے ہوئے لکھنو میں ایک صحت مند روایت کو پران چڑھایا ہے اور صوفیانہ ماحول کو بنانے کی بھی سعی کی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

کفر و اسلام سے آزاد ہوں بے قید ہوں میں
مجھ سے کافر ہی نہ جھگڑے نہ تو دیندار الجھے

....

نہ جلائے نہ تو گاڑے کوئی ہم کو آتش
مردہ اپنا نہ پڑے کافر و دیندار کے ہاتھ

....

کفر و اسلام کی کچھ قید نہیں اے آتش
شیخ ہو یا کہ برہمن ہو پر انسان ہووے

آتش نے ایک عارف کی مختلف کیفیات اور اس قلب پر وارد ہونے والے جذبات و احساسات کو شعری اظہار بنایا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے معرفت کی مشکلات، ذات قدوس کی تجلیات، مشاہدات اور مجاہدات کے علاوہ اور راہ سلوک کے مصائب و آلام وغیرہ کو بھی غزل کا حصہ بناتے ہوئے اپنی صوفیانہ مزاج کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے:

معرفت میں تیری ذاتِ پاک کے
اُڑتے ہیں ہوش و حواس ادراک کے

....

نافہمی اپنی پردہ ہے دیدار کیلئے
ورنہ کوئی نقاب نہیں یار کیلئے

....

پردۂ غفلت اُٹھا پیش نظر یار ہے
دیر و حرم میں نہ جاؤ ڈھونڈھنے موجود کو

....

سر شمع سا کٹا یئے پر دم نہ ماریے
منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریے

....

خیال ِ تن پرستی چھوڑ فکر حق پرستی کر
نشاں رہتا نہیں ہے نام رہ جاتا ہے

....

صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے نغمہ ساز کا
شبہ ہوجاتا ہے پردے سے تری آواز کا

....

نظر آیا تماشائے جہاں جب بند کیں آنکھیں
صفائے قلب سے پہلو میں ہم نے جام ِ جم پایا

آتشؔ نے مراقبہ سے صفائے قلبی پیدا کرتے ہوئے ''دیدارِ الٰہی'' کی تمنا اور شوق کا اظہار کیا ہے اور صوفیہ کے نزدیک یہ تمام ایسی کیفیات ہیں جن کے ذریعے بندہ طریقت، اور سلوک و معرفت کے توسط سے حقیقت تک رسائی حاصل کرتا ہے۔جس کا اظہار جابجا آتشؔ کی غزلیہ شاعری میں ملتا ہے۔شعر ملاحظہ ہوں:

تشنۂ دیدار مجھ سا دوسرا کوئی نہیں
سب سے پہلے مجھ کو ہنگامہ محشر اٹھا

....

رہتی ہیں آنکھیں بند تصور میں یار کے

تارِ نگہ سے اپنے بندھا ہے خیالِ دوست

....

صفائے قلب کو حاصل کیا میں نے مقدر سے
یہ آئینہ مرے ہاتھ آگیا بخت ِ سکندر سے

سالک اپنے ذکر سے ذاکر اور مذکور کے درمیان حائل پردے ہٹا دیتا ہے، خواہشات نفسانی کو فنا کرتے ہوئے اپنے نفس کو مارتا ہے۔خدا سے تعلق کچھ اس طرح قائم کرتا ہے کہ وہ اپنی مکمل ذات کو یاد الہٰی میں محو رکھتا ہے۔ایسی کیفیات یعنی نفس، فنا وغیرہ کا اظہار آتش کے یہاں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے:

ہمارے حلق میں دن رات ذکر ذات اقدس ہے
فضانے کی ہے یہ تسبیح خاک ِ پاک سے پیدا

......

ثابت قدم فقر کو ہے نفس کشی شرط
بے دیو کو مارے کوئی رستم نہیں ہوتا

......

فنا کے بعد کھلا دل کو عشق کا پردہ
تمام ہو کے ہوئے ہم کمال سے واقف

آتش کی حیات اور شخصیت کا پرتو ان کی شاعری میں محسوس کیا جاسکتا۔آتش نے اپنی زندگی میں 'توکل ،قناعت ،فقر وغیرہ کو اپنی زندگی کا حصہ بنایا تھا چنانچہ انہوں نے ان کیفیات کو غزلیہ شاعری کے حوالے سے پیش کرتے ہوئے شخصیت اور فن میں مطابقت پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔آتش اپنے تمام معاملات کو خداوندے قدوس کے سپرد کرتے ہیں اور قناعت پسند ہو کر فقر اور عجز و انکسار کی منزلوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔صوفیہ کی تعلیمات میں توکل، قناعت اور فقر کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔سالک ان منزلوں سے گزر کر بادشاہی حاصل کرتا ہے۔ان کیفیات کا رمز آتش کے کلام میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

نیتِ اہل توکل ہے کرم نے بھر دی

سیر نعمت سے دو عالم کے ہے مہمان تیرا

.....

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ
قناعت بھی بہار بے خزاں ہے

.....

بادشاہی سے فقیری کا ہے پایہ بالا
بوریا چھوڑ کر کے کیا تخت سلیماں مانگو

.....

مقسوم کا جو ہے سو،وہ پہنچے گا آپ سے
پھیلائے نہ ہاتھ ، نہ دامن پسارئے

.....

جو قناعت کے مزے سے آشنا ہوجائیگا
بھیک کا کاسہ اُسے دست دعا ہوجائیگا

.....

کسی کو ملک دیا ہے کسی کو مال دیا
فقیر ہوں مجھے اللہ نے ہے حال دیا

آتش کی شاعری اُن کے شخصی مشاہدات کی عکاسی کرتی ہے۔اُن کے یہاں قلندرانہ بے نیازی کا اظہار ملتا ہے۔ چنانچہ تصوف کے مختلف النوع مسائل کا اظہار کیا ہے۔اسی لیے دبستان لکھنو کی شاعری میں صفوفیانہ اور عارفانہ روایت کو استحکام دینے میں ان کا نام اور کام اہمیت کے حامل قرار دیا جاسکتا ہے۔غرض آتش ایک بھر پور زندگی کو صبر وقناعت، راضی بہ رضا میں رہتے ہوئے 13/جنوری 1847ء کو انتقال کیا۔☆

شیخ محمد ابراہیم ذوق:

نام شیخ محمد ابراہیم اور ذوق تخلص، 1788 میں قصبہ شاہ پور تحصیل بڈھانہ ضلع مظفرنگر یو پی میں شیخ محمد رمضان کے

یہاں تولد ہوئے۔ ان کے والد تلاش روزگار کیلئے دہلی منتقل ہوئے تو ذوق بھی ان کے ہمراہ آئے۔ ذوق کی ابتدائی تعلیم گھر پر مکمل ہوئی۔ آگے تعلیم وتربیت کے لیے حافظ غلام رسول شوق کے مکتب میں داخل ہوئے۔ ذوق کو ابتدائی وضروری علوم کی تکمیل کے بعد بھی مطالعہ کو جاری رکھا اور ہر وقت مطالعے میں غرق رہتے۔ بقول تنویر احمد علوی :

> ''ذوق شروع ہی سے بہت ذہین اور تحصیل علمی کے شوقین تھے انہوں نے صرف شعر گوئی میں کمال حاصل کرنے اور شہرت پا جانے کو کافی نہیں سمجھا اپنے ماحول کے علمی اثرات کو بھی قبول کیا اور اپنی معلومات میں اضافے کیلئے وہ برابر مطالعہ کرتے اور سیر کتب سے دلچسپی لیتے رہے''۔(53)

ذوقؔ نے غلام رسول کے علاوہ اصلاحِ سخن کے لیے شاہ نصیر کے آگے زانوے ادب طے کیا۔ شاہ نصیر اپنے زمانے معروف استادِ سخن رہے ہیں جن کی شہرت دور دور تک تھی۔ لہذا شاہ نصیر کی استادانہ شہرت اور شاعرانہ مقبولیت نے ذوق کو متاثر کیا اور وہ ان کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ انہوں نے شاہ نصیر سے صناعی شعری اور زبان وشعر کی باریکیاں اور اہم نکات پر عبور حاصل کیا کہ زبان دانی اور علمِ عروض کا ماہر استادِ سخن بنا دیا۔ ذوقؔ کے مقبولیت کے کئی اسباب ہیں جن کا ذکر سیدہ جعفر نے اس طرح کیا ہے:

> ''غزل گوکی حیثیت سے ذوقؔ کی تفہیم وتحسین، اس عہد کے ادبی تصورات اور شعری رویئوں کے تناظر میں ہماری صحیح رہبری کر سکتی ہے۔ شاہ نصیر کی شاگردی، علوم متداولہ پر دسترس، محاورات پر عبور، زبان وعروض کی استادانہ مہارت، شاہی دربار میں رسائی، اپنے بعض ہمعصروں سے مسابقت میں کامیابی اور زورطبع نے ذوق کی مقبولیت اور ان کے تشخص کو استحکام عطا کیا تھا''۔(54)

محمد حسین آزادؔ، داغؔ دہلوی، شجاع الدین انورؔ، حافظ ویرانؔ، مذاق بدایونی اور شاہ ظفر وغیرہ قابل ذکر شاگردان ہیں۔ جنہوں نے ذوق کی علمی وشعری صلاحیتوں سے فیض اٹھایا ہے اور وہ خود بھی اپنے زمانے کے معروف علمی اور ادبی شخصیات میں شمار ہونے لگے۔ ذوقؔ کی وفات 1854ء کو عارضہ بخار میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ہوئی:

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

…………

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

ذوقؔ بنیادی طور پر زبان و بیان کے شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔مگر ان کی شاعری میں تصوف کی نیرنگیاں بھی واضح طور پر نظر آتی ہیں اور ان کا مزاج بھی متصوفانہ رہا اس کے علاوہ ماحول کے اثرات نے بھی ان کے کلام کو صوفیانہ و عارفانہ رنگ کا حامل بنا دیا۔ذوقؔ کی شخصیت اور مزاج میں مذہبی رنگ نمایاں رہا۔اسلام کے اصولوں پر سختی کے ساتھ پابندی کرتے۔اسلامی فرائض کے علاوہ وظائف ،نوافل اور شب بیدار عبادات میں مشغول رہا کرتے۔محمد حسین آزاد نے ’’آب حیات میں ان کی شب بیداری کا ذکر کیا ہے اور اپنے استاد کی شان میں کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔اس کے باوجود ذوق کے یہاں مذہبیت کا رنگ کچھ گہرا ہی تھا اور اسی وجہ سے ان کا کلام بھی صوفیانہ اور مذہبی رنگ کا حامل ہوگیا۔بہر کیف ذوقؔ کے مزاج میں متصوفانہ رنگ شامل تھا جس کا عکس اُن کے اشعار سے بھی واضح ہوجاتا ہے۔چند شعر ملاحظہ ہوں:

بنایا آدمی کو ذوقؔ ایک جزو ضعیف
اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کیلئے

…………

اُس باغِ سخن میں ذوقؔ اپنا جی بہلتا ہے
جہاں بو عشق کی آتی ہے کچھ گل ہائے مضموں سے

…………

اے ذوقؔ کہیں نہ آپ کو صوفی بتایئے
معلوم ہے حقیقت ِ ہو، حق ، جناب کی

…………

دانہ خرمن ہے ہمیں، قطرہ ہے دریا ہم کو
آئے ہے جز میں نظر کل کا تماشا ہم کو

…………

اُس در پہ شوقِ سجدہ سے فرشِ زمیں ہوں میں
مانندِ سایہ سر سے قدم تک جبیں ہوں میں

دوسرے شعراء کی طرح ذوقؔ نے بھی اپنے ہم عصروں اور پیش رووں کی طرح انسانی مقام اور اس کی عظمت کے قائل نظر آتے ہیں۔ انسان کے مرتبہ و مقام کو مختلف رنگ میں پیش کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

آپ آئینہ ہستی میں ہے تو اپنا حریف
ورنہ یاں کون تھا جو تیرے مقابل ہوتا

....

عنقا کی طرح خلق سے عزلت گزیں ہوں میں
ہوں اس طرح جہاں میں گویا نہیں ہوں میں

....

جو کچھ ہے دنیا میں، وہ انسان کیلئے ہے
آراستہ یہ گھر اسی مہماں کیلئے ہے

....

میں وہ نہیں کہ تمام ہوکہیں اور کہیں ہوں میں
میں ہوں تمہارا سایہ، جہاں تم وہیں ہوں میں

....

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا، یہ اُس کی فروتنی ہے
وگرنہ قندیل عرش میں بھی اس کے جلوے کی روشنی ہے

ذوقؔ نے انسان کے ''دل'' صفائے قلب، دیدار، اور دیدار کی خواہش کو پر کیف انداز میں کہیں تشبیہ تو کہیں استعارہ اور کنایہ میں پیش کیا ہے۔ وہ دل کو آئینہ سے تشبیہ دیتے ہیں اور اس آئینہ میں آئینہ گر کا مشاہدہ کرتے نظر آتے ہیں۔ کہتے ہیں:

جہاں کے آئینوں سے دل کا آئینہ ہے جدا
اس آئینے میں ہم آئینہ گر کو دیکھتے ہیں

....

ہو رازِ دل نہ یار سے پوشیدہ یار کا
پردہ نہ درمیاں ہو جو دل کے غبار کا

....

آتا ہے دم آنکھوں میں دم ِ حسرتِ دیدار
پر لب پہ کبھی حرف ِ تمنا نہیں آتا

....

دل وہ کیا جس کو نہیں تیری تمنا ے وصال
چشم و ہ کیا جس کو تیری دید کی حسرت نہیں

ِ تصوف کی راہ کا مسافر عشقیہ کیفیات اور سرمستیوں میں سرشار رہتا ہے۔چونکہ عشق میں آرام طلبی نہیں بلکہ دشوار گزار گھاٹیوں کو عبور کرنا اور مختلف امتحانات سے گزرنے کا نام ہے۔ایک عاشق بامراد یعنی عاشق صادق ان تمام چیزوں سے بہ آسانی گزر جاتا ہے۔سلوک میں حق کی تلاش اہم ہوتی ہے اور یہ تلاش ذوق وجستجو پر دلالت کرتی ہے اور سالک کو منزل مقصود تک بھی پہنچاتی ہے۔ذوقؔ نے عشق،اور سلوک وغیرہ کیفیات کو شعری جامہ پہنایا ہے۔شعر ملاحظہ فرمائیں:

جسے کہتے ہیں بحر عشق ، اُس کے دو کنارے ہیں
ازل نام اس کنارے کا ابد نام اُس کنارے کا

....

فروغِ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لئے
یہی چراغ ہے اس تیرہ کاک داں کیلئے

....

اُٹھاتا عشق کی کیوں اے دل ِ ناداں جوکھوں ہے
ابھی تو حال جو کھوں ہیں، پھر آگے جان جو کھوں ہے

....

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈا ، نہ پایا
اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا

....

کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈا
پھر آخر دل ہی میں دیکھا ، بغل ہی میں سے تو نکلا

ذوقؔ نے اپنی شاعری میں مرشد کی اہمیت اور خدمت کو بھی بیان کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ تصوف کی راہ میں ایک کامل مرشد ہی طریقت اور حقیقت کی تعلیم دیتا ہے۔قرب الہہ، وجود، سانس کی آمدو شد میں ذکر واذکار، وجود کی سیر، جس میں نفس سے جہاد اور پھر اس راہ میں اپنے آپ کو فنا فی اللہ اور فنا فی الشیخ کے تصورات وغیرہ کی راہوں کو ایک پیر کامل ہی صحیح سمت عطا کرتا ہے اور طالبان حق اس راہ پر چل کر اپنی منزل پالیتا ہے۔راضی بہ رضا اور صبر وقناعت کی راہ سلوک میں اہمیت کی حامل ہے اس طرح کے اشعار بھی ذوق کے دیوان میں مل جاتے ہیں:

رہا وہ خدمت مرشد کی قید میں برسوں
کہ حق پرست ہو وہ پہلے جو ہو پیر پرست

....

دیکھا کہیں نہ اُس کو جو دیکھا تو اپنے پاس
میں دور دور جوں نگہ دور بیں گیا

....

غافل جو دم کی آمد وشد سے نہ ہو وے تو
ہردم ہے تج کو سیرِ وجود و عدم نصیب

....

نفس کی آمد و شد ہے نماز اہل حیات

جو یہ فضا ہو تو اسے غافلو قضا سمجھو

....

ہمیشہ جنگ رہی بعد صلح کل کے بھی
کہ نفس دشمن سرکش ہے اس کو دیجئے شکست

....

کشتی سوار عمر ہوں بحر فنا میں ذوقؔ!
جس دم بہا کے لے گیا طوفان بہہ گیا

....

نہ شکایت ہے کرم کی ، نہ ستم کی خواہش
دیکھ تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

غرض ذوقؔ کی مذہب اور تصوف سے دلچسپی، بزرگوں کی صحبت اور اور اس دور کے ماحول نے ان سے اس طرح کی شاعری کروائی ہے جس میں رنگ تصوف اور مذہب پر مبنی فکر ونظر نمایاں طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ مختصراً یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ذوق کے فکر وفن میں صوفیانہ مزاج اور صوفیانہ مطالعہ کا اہم دخل ہے۔☆

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ:

مرزا غالبؔ اردو شاعری کے اہم ترین شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ انیسویں صدی کی ایسی شخصیتوں میں سے ہیں جن کی وسیع المشربی اور فراخ دلی مشہور ہے۔ اگر چہ اُن کی حیات تنگ دستی اور مصائب وآلام میں گذری تا ہم اس حالت میں بھی انہوں نے صبر و رضا کا دامن نہیں چھوڑا اور زندگی کو زندہ دلی، شگفتہ مزاجی اور ظریف الطبعی سے گزاری۔ مرزا غالبؔ کو دہلی کے ایک بزرگ کالے شاہ صاحب سے بیعت حاصل تھی، محمد حسین آزادؔ کے بقول وہ مولانا فخر الدین کے خاندان میں مرید بھی تھے۔(55) مرزا غالبؔ نے اردو کے ساتھ سا

تھ فارسی زبان میں بھی اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ فارسی نثر ونظم میں، پنج آہنگ، مہر نیمروز، کلیات نظم فارسی، دعائے صبح وغیرہ اور اُردو میں دیوان اُردو، عود ہندی، مکاتیب غالبؔ اور قادر نامہ وغیرہ قابل ذکر ہیں، غالب کی ولادتؔ 1797ء کو آگرہ اور انتقال 1869ء میں دہلی میں ہوا۔ غالب کے تخیل وتفکر میں بلندی و وسعت تھی، وہ فلسفی شاعر تو نہیں تھے مگر ان کی شاعری میں

حکیمانہ ندرت اور فلسفیانہ حقیقت کی عکاسی ملتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ اُن کی فکر، فلسفہ، تصوف، روشن ضمیری اور فکروفن کی کرشمہ سازی سے عبارت ہے۔ بقول ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم:

''غالب کی ایک امتیازی خصوصیت جس نے اس کو اہل علم میں ہر دلعزیز بنایا، اس کا حکیمانہ اندازِ فکر ہے، وہ فلسفی نہیں لیکن فلسفیانہ شاعر ہے، اس کے اکثر اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فلسفہ وتصوف کے مسائل سے پوری طرح آگاہ ہے، وہ نہ فلسفی ہے اور نہ صوفی لیکن فلسفیانہ اور صوفیانہ افکار سے لذت حاصل کرتا اور دوسروں کو حسن بیان سے لذت بخشتا ہے''۔(56)

غالبؔ فارسی کے معروف صوفی شاعر بیدل سے متاثر رہے اس کے علاوہ ان کے دوستانہ مراسم اس عہد کے جید علما اور مفتیان سے بھی تھے۔ جن میں مولانا فضل حق خیر آبادی کا نام نامی اہمیت کا حامل ہے جن کی صحبت بافیض سے مستفید ہوئے۔ غالب کا جو شعری انتخاب ہے اس کی تدوین میں مولانا کا اہم رول رہا ہے۔ اس کے علاوہ وحدت الوجود اور مذہبی فکر و آہنگ غالب میں مولانا کی ہی مرہون منت کہا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں یوسف سلیم چشتی رقم طراز ہیں:

''غالبؔ کو خاتم الحکماء فرید الدہر وحید العصر مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی مرحوم کی صحبت میسر آگئی جو بلاشبہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے منطقی، فلسفی اور متکلم تھے، عربی ادب میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے اور فلسفہ وحدت الوجود کے مسلم الثبوت امام تھے''(57)

غالبؔ کی پسند، انفرادیت، بلاغت، فکر کی بلندی وغیرہ کا خود غالب کو احساس تھا۔ چنانچہ انہوں اپنی انفرادیت کو درج ذیل شعر میں بیان کرنے کی سعی کی ہے:

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

....

گنجینہ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

....

گر خامشی سے فائدہ اخفا سے حال ہے
خوش ہوں کے میری بات سمجھنی محال ہے

....

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالبؔ، صریرِ خامہ، نوائے سروش ہے

غالبؔ نے کہیں صحبتوں سے تو کہیں اپنی روایت سے فائدہ اٹھایا ہے۔علماء اور بزرگوں کی صحبتوں کی وجہ سے غالبؔ کی شخصیت اور شاعری میں میں صوفیانہ افکار ونظریات جلوہ گر ہوئے اور اُن کی نظر حقیقت شناسی اور حقیقت بینی کی نمائندہ قرار دی گئی۔، وہ کائنات میں موجود خدا کے مظاہر، رموز وغیرہ کو محسوس کرتے ہیں۔وہ اپنے کلام کو گنجینہ معنیٰ کا طلسم بھی قرار دیتے ہیں۔ان کی فکری بلندی اور اچھوتے مضامین ان کے کلام کا خاص حصہ ہوتے ہیں۔ان کے کلام میں تہہ داری اور وسعت نظری ہوتی ہے جس کی وجہ سے قاری ان مطالب تک پہنچ نہیں پاتا۔غالبؔ کے صوفیانہ کلام اور اس کی وسعت کا اندازہ نیاز فتح پوری نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''مسائل تصوف بیان کرنے پر آجاتے ہیں تو پھر ان کی بلندی کی کوئی انتہا نہیں رہتی، اس کا کلام فلسفۂ حیات اور مسائل حکمت وتصوف سے بھرا پڑا ہے اور اس سلسلہ میں اس نے اتنی لطیف اتنی بلند، اس قدر اچھوتی باتیں کہی ہیں کہ اُردو میں غالبؔ کے سوا کہیں اور نہیں ملتیں''۔(58)

غالبؔ کی شخصیت ہمہ گیر اور ہمہ پہلو لیے ہوئے ہے۔وہ کبھی بادہ وجام اور مئے کشی کی بات کرتے ہیں تو کبھی شرابِ طہورہ کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔غالبؔ کی ہمہ رنگی شخصیت اور فکری وفنی خوبیوں پر سید محمد مصطفی صابری کہتے ہیں:

''غالب کے کلام میں فلسفہ، حکمت، تصوف، سوز وساز، دل نشینی، دعوت، فکر، بلندی، فصاحت، بلاغت، گہرائی، گیرائی، ندرتِ بیان، آفریدگار کے وجود کی شدت احساس، خالق کی وہبی عنایتوں اور بیکراں بخششوں کے بیان کا سلیقہ، منعم کی فیاضی پر اعتماد، سب کچھ ملے گا غالبؔ کی شخصیت ہمہ گیر تھی،

شاعروں کی محفل میں مسندِ صدارت پر نظر آتے ہیں،صوفیوں کی صحبت میں
شاہدو مشہود کے راز بیان کرتے ہیں مذہب کے حقائق اشعار میں پیش کرنے
کا اُن کو بڑا ملکہ ہے''۔(59)

غالبؔ کا میلانِ طبع اور صوفیانہ رجحان ''وحدت الوجود'' تھا، اُن کی شاعری ہی نہیں بلکہ نثر میں اس نظریہ کی وضاحت جگہ جگہ ملتی ہے۔غالبؔ نے اپنے ایک خط بنام علاؤالدین احمد خاں میں اپنے عقیدہ کو بیان کیا ہے۔اس اقتباس کو پروفیسر سلیم چشتی نے دیوانِ غالبؔ کی شرح کے مقدمہ میں درج کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب اور ممکن میں مشترک جانتے ہیں میں موحد
خالص اور مومنِ کامل ہوں، زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں
لاموجود الا اللہ اور لاموثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں''۔(60)

غالبؔ نے اس نظریۂ ہمہ اوست یعنی ''وحدت الوجود'' کو اپنے کئی اشعار میں مختلف پیرائے میں پیش کیا ہے۔غالبؔ کے یہاں ''وحدت الوجود'' بمعنی خدا کی وحدانیت نہیں بلکہ پوری ہستی اور ساری حقیقت ایک ہے، جب ظاہر و باطن اور اول و آخر خدا ہی خدا ہے تو ذات وصفات اور عین وظاہر، جوہر و اعراض سب ایک ہے ان ہی تصورات کی غمازی غالبؔ کے ان اشعار میں ملاحظہ ہوں:

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

....

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی توکوئی شے نہیں ہے

....

اصل شہود و شاہدو مشہود ایک ہے
حیراں ہو پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

....

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

....

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ وموج و حباب میں

....

کچھ نہ کی اپنے جنون نارسانے، ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشید عالم تاب تھا

....

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرہ بے پر تو خورشید نہیں

....

از مہر تابہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کوشش جہت سے قابل ہے آئینہ

....

وہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگرحسن نہ ہوتا خودبیں

....

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

(61)

وحدت الوجود کے تحت غالبؔ کے یہاں کہیں حیرت و استفہام تو کہیں مؤحد کی توضیح وتشریح تو کہیں انسان کی ہستی کو

فریب خیال کرتے ہیں۔اس کے علاوہ وحدت الوجود کے مختلف تصورات جیسے وحدت میں کثرت،وجود مطلق، ذات مطلق ،شاہد مطلق،وغیرہ غالبؔ کے کلام میں مل جاتی ہیں۔وحدت الوجود کی مختلف کیفیات کا اظہار ملاحظہ فرمائیں:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

....

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

....

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

....

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کردیا کافران اصنامِ خیالی نے مجھے

....

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

....

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں سب شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

....

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ''ہے'' پر ہمیں منظور نہیں

غالبؔ نے ان اشعار میں ''توحید فعلی''، ''وحدت در کثرت''، موحد، (بلا تفریق مذہب) خدا تعین وتعینات سے پاک، بغیر مادے کے وساطت سے اس کا ظہور، خدائے مطلق کی ذات غیب الغیب اور اس کی ذات کو واجب الوجود، اس کی کثرت آرائی وغیرہ جیسے وجودی تصورات کو بحسن وخوبی اس طرح پیش کیا ہے کہ گویا ایک صوفی ان نکات کو بیان کر رہا ہو۔ یہی غالب کی انفرادیت ہے۔

وحدت الوجود کے بعد جس نکتے کو غالب بیان کرتے ہیں وہ انسان اور اس کی عظمت ہے۔ اس طرح ان کے اس نکات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ وجود اور شہود دونوں کو اپنے کلام کا حصہ بنایا ہے۔ غالبؔ نے وحدت الشہود کے تحت گو ناگوں انسانی حقائق کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں:

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

....

ہے آدمی بجا سے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

....

باوجود یک جہاں ہنگامہ، پیدائی نہیں
ہیں چراغاں شبستانِ دل پروانہ ہم

....

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

....

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوارِ خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

....

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں ، پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

....

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

غالبؔ کی شاعری میں فکر کی بلندی، فن کی پختگی اور زبان کی ساخت کا جمالیاتی احساس قاری کو ایک نئی دنیا کی سیر کرواتا ہے۔اس کے صوفیانہ نکات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ تصورات گویا ان کے اس شعر کی عملی تفسیر معلوم ہوتے ہیں:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں بادہ و ساغر کہے بغیر

غالبؔ کے پاس استفہامیہ کیفیت بھی ہے، یعنی ان کے یہاں یقین و گمان دونوں کیفیات کی جلوہ گری ملتی ہے۔غرض غالبؔ صوفی شاعر تو نہیں ہیں مگر صوفیانہ افکار و نظریات ان کی نہ صرف شخصیت میں داخل ہیں بلکہ ان کی شاعری بھی ان کیفیات و تصورات کی آئینہ داری کرتی ہے۔ڈاکٹر افضل الدین جنیدی کے قول کے مطابق غالب نے تصوف و فلسفہ کے ایسے ایسے باریک نکات بیان کئے ہیں جس کا تصور ہی محال نظر آتا ہے۔غرض غالب کی شاعری صوفیانہ و عارفانہ تصورات سے روشن ہے۔☆

امیر مینائی:

امیر احمد مینائی مابعد غالبؔ ایک اہم صوفی شاعر ہیں جن کی حیات اور شخصیت میں صوفی ازم کی خصوصیات دیکھی جاسکتی ہیں۔ان کا گھرانہ صوفیانہ ماحول سے متصف تھا ان کے والد مولوی شاہ کرم محمد مینائی خدا رسیدہ انسان تھے۔امیر کی ولادت 16 شعبان 1242ھ مطابق 1826ء بروز دوشنبہ صبح ساڑھے دس بجے ہوئی (62) اور وصال 19 جمادی الاُخریٰ 1318ھ روز یکشنبہ مطابق 1901ء کو ہوا۔(63) درگاہ یوسفینؒ نامپلی حیدرآباد میں مدفون ہیں (64)۔امیر کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔عربی و فارسی کے ابتدائی اسباق اپنے والد سے حاصل کئے۔والد کی تربیت اور ماحول کے اثرات اور ذاتی دلچسپی کی وجہ سے انہیں بچپن ہی سے تصوف سے دلچسپی پیدا ہوئی۔چنانچہ وہ مطالعہ میں مصروف رہا کرتے تھے۔حضرت مینائی تمام دن علمی و ادبی مشاغل میں مصروف رہتے اور رات کے آخری پہر اپنے جدامجد حضرت مخدوم شاہ مینا کے آستانہ پر حاضر ہو کر

فیوض و برکات سے سرفراز ہوتے اور تہجد اور فجر کی نمازوں کے بعد وظائف اور تلاوت میں مشغول ہو جاتے۔ امیرؔ ایک پاک باز، نیک نفاست پسند شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا رکھ رکھاؤ، نشست و برخواست، اطوار و عادات میں پاکیزگی، شرافت، اور اخلاقیات کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ ان کی شخصی عادات و اطوار کے پاکیزہ اوصاف ان کے کلام میں بھی راہ پانے لگے۔ امیرؔ مینائی کی مزاج و شخصیت سے متعلق ابومحمد سحر رقم طراز ہیں:

> ''حق شناسی، راست گوئی، وضع داری، صلح جوئی، خلق و مروّت، عجز و انکساری، علم دوستی اور دین داری وغیرہ ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بزرگوں کی عزت، ہمعصروں کی قدر، احباب کی دلدہی، اعزاء تلامذہ کی سرپرستی و حوصلہ افزائی وغیرہ ان کا سرمایۂ حیات تھی۔'' (65)

امیر مینائی کی تصانیف میں ایک لغت جس کا نام ''امیر اللغات'' ہے اس کے علاوہ مرأۃ الغیب، صنم خانۂ عشق، گوہرِ انتخاب، جوہرِ انتخاب اور انتخابِ یادگار، ان کے شعری مجموعے ہیں۔ (66) امیرؔ مینائی اپنے عہد کے استادِ سخن کہلائے اس کے علاوہ غزلیہ شاعری میں ان کا پایہ بلند تھا۔ مختلف اصنافِ سخن میں شاعری کی لیکن غزل گوئی میں انہیں امتیاز حاصل رہا۔ آپ کی شاعری کا غالب حصہ تصوف و سلوک اور معرفت میں ڈوبا ہوا ہے۔ آپ کی شاعری میں تصوف کا رجحان مینائی خاندان (جس کا سلسلہ کئی واسطوں سے حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین تک ملتا ہے)، تعلیم و تربیت اور ماحول نے انہیں اس طرح کی شاعری کی طرف راغب کیا۔ آپ نے حضرت امیر شاہ مینا صابری رامپوری قدس سرہ سے بیعت و خلافت کی نعمت سے سرفرازی حاصل کی۔ پیر طریقت کی پاکیزہ نظر نے بھی ان کے مزاج و شاعری میں عارفانہ عناصر داخل کئے۔ تصوف و معرفت امیر مینائی کی حیات میں عملی طور پر دخیل تھا۔ اس لئے ان کی شاعری کا بیشتر حصہ تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ چونکہ وہ فکر و عمل کے شاعر تھے اس لیے کلام میں عشق حقیقی کی جلوہ گری نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ مینائی کی غزلیہ شاعری میں شوکت الفاظ، الفاظ کا در و بست، نادر تشبیہات، استعارات، محاورات، اخلاقیات و حکمت، تصوف و معرفت، روزمرہ، معاملہ بندی اور نزاکت و لطافت جیسے فکری و فنی خصوصیات ملتے ہیں۔ امیرؔ کے صوفیانہ فکر و نظر سے مزین چند شعر ملاحظہ فرمائیں جن کے مطالعہ سے ان کے رنگ سخن کا اندازہ ہو جاتا ہے:

خلوت میں تھا تو شاہدِ معنی تھا میں امیر
خلوت سے انجمن میں جو آیا سخن ہوا

....

جمال یار کو کہتے ہو تم کہ ہاں دیکھا
کلیم ہوش میں آؤ ابھی کہاں دیکھا

....

ملنے نہ ملنے سے ہمیں کیا کام سے ہے کام
جب تک کہ دم میں دم ہے تیری جستجو کریں

....

جب تک کہ دل ہے چاہئے ہمکو تری تلاش
جب تک چلے زبان تری گفتگو کریں

....

دریائے معرفت سے جو دل آشناء ہوا
ترک ِ خودی سفینہ اہل فنا ہو

....

غافل نزول ہی تو کمال عروج ہے
خاک فنا ہی منزل آب بقاہوئی

....

فی الحقیقت غوطۂ بحر فنا ہے لاالہ
ہے ابھرنا اس بھنور سے ذکر الااللہ کا

حق کا دیدار،شوقِ دیداراور اشتیاقِ کی جستجو معرفت کے راز،مقام فنا اور کیفیاتِ فنا و بقا،وغیرہ کے رمز کو مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں۔امیر چونکہ مکمل صوفیانہ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ان کی صوفیانہ فکر پر سید غلام سمنانی لکھتے ہیں:

''امیرؔ نے تصوف کو اپنے اوپر طاری نہیں کیا بلکہ وہ اُنہیں بطور ورثہ حاصل ہوا تھا تو

انہیں فطری سمجھنا چاہئے۔ان کے کلام میں ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے جن میں بندہ و خالق کے رشتے، دنیاو مافیہا کی حقیقت، رازِ کن فیکون کی پردہ کشائی، موت وحیات کے عقدہ کا حال، خدا کی وحدانیت اور معرفت نفس کے مسائل سے بحث کی گئی ہے“

(67)

امیرؔ نے ۓدل کے مقام، اہمیت، ماہیت اور وسعت کو اپنے کلام میں پیش کرتے ہیں۔اس کے علاوہ قرب یعنی اللہ تبارک تعالی بندہ کے شہ رگ سے قریب ہے، اور جلوۂ ذات و کائنات اور وحدت الوجود کے فلسفہ کو بھی اپنے کلام میں بحسن و خوبی بیان کیا ہے:

کیا حقیقت دو جہاں کی وسعتِ دل کے حضور
لامکاں اک مختصر گوشہ ہے اس تعمیر کا

......

بیگانہ ہو کے سارے جہاں سے جدا ہوا
اے عالم آشنا جو ترا آشنا ہوا

......

مجھ میں رہے وہ پر میں نہ سمجھا کہاں رہے
قالب میں رہ کے روح کی صورت نہاں رہے

......

آنکھوں میں نور تیرا دل میں سرور تیرا
دروازے سے ہے گھر تک سارا ظہور تیرا

......

جو چشم غور سے آئینہ توحید کو دیکھا
تو سب کچھ تو ہی ٹھہر اہم نہ کچھ اے خود نما ٹھہرے

انسان کی عظمت و رفعت کا امیرؔ نے کئی جگہ اظہار کیا ہے ۔اس سلسلہ میں ان کا خیال ہے کہ انسان کی ذات کا عرفان

باری تعالی ہی کے عرفان کا ذریعہ ہے۔مزید وہ حضرت علی کرم اللہ وجہ کے اس قول ''من عرف نفسہ فقد عرف ربہ'' یعنی جس نے خودکو پہچانا اس نے خدا کو پہچانا کو شعری پیرا ہن عطا کرتے ہیں۔غرض امیر کے یہاں مقامِ حیرت کا تصور،معرفت کی ابتدا و انتہا، خودی و بےخودی کے رموز اور سکر کی کیفیات کو واضح انداز میں پیش کرتے ہوئے صوفیانہ اور عارفانہ فکر کی نمائندگی کی ہے۔شعر ملاحظہ فرمائیں:

میں آئینہ ہوں تیرا تو آئینہ ہے میرا
تجھ میں ظہور میرا مجھ میں ظہور تیرا

......

حق شناسی کی حقیقت کو اُن ہی جانا
اے امیرؔ اپنی حقیقت کو جو پہنچان گئے

......

نقطے کی سیر دائرہ معرفت میں دیکھ
تھی ابتداء جہاں سے وہیں انتہاء ہوئی

......

ہر طرف اپنی ہی صورت نظر آتی ہے ہمیں
آئینہ خانہ میں حیران سے ہم دیکھتے ہیں

......

خودی سے بے خودی میں آ جو شوقِ حق پرستی ہے
جسے تو نیستی سمجھتا ہے اے غافل وہ ہستی ہے

......

مدہوش عشق ہوکر جابزم معرفت میں
پردہ بیچ میں ہو غافل شعور تیرا

......

پردے میں تم ہو اس پہ یہ عالم ہے حسن کا
پردے سے باہر آؤ تو کیا جانے کیا کرو

امیرؔ مینائی کا خاندانی سلسلہ صوفیانہ کردار و اخلاق سے متصف تھا۔اس کے علاوہ ان کا معاصرانہ ماحول نے بھی ان کی اس فکر میں معاون و مددگار رہا۔چنانچہ ان کی شاعری میں بھی ان کی فکر اور عمل شامل ہو کر ان کے کلام کو بھی صوفیانہ اور معرفت انگیز بنا دیا اور ان کی شعری فکر میں صوفیانہ مضامین کی ایک کہکشاں سجی ہوئی ہے۔غرض ان کے کلام میں عشق حقیقی کے رنگ نمایاں طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔☆

داغؔ دہلوی:

ناظم یار جنگ دبیر الدولہ نواب فصیح الملک نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی ۱۲/ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۲۵/مئی ۱۸۳۱ء بروز چہارشنبہ بوقت ۲ بجے دن محلہ چاندنی چوک دہلی میں پیدا ہوئے۔(68) داغؔ جناب نواب شمس الدین خاں رئیس لوہار کے فرزند تھے۔داغ کے بچپن ہی میں اُن کے والد کا انتقال ہوگیا۔داغؔ کی والدہ چھوٹی بیگم سے ولی عہد بہادر شاہ نے بعد میں نکاح کرلیا۔تو داغؔ کی پرورش تعلیم و تربیت قلعہ شاہی میں ہوئی۔(69) داغؔ کی زندگی کا زیادہ حصہ حسن و عشق کی رنگ ریلیوں میں گزرا، داغؔ بچپن سے جوانی تک روساء نوابوں اور بادشاہ کے لطف و کرم سے فیضیاب ہوتے رہے اور انہی کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھے۔(70) داغ کے اساتذہ میں مرزا زین العابدین عارفؔ، مرزا فخر اور ذوقؔ ہیں۔اُستاد ذوق نے ہی انہیں داغؔ کا تخلص دیا۔(71)۔داغؔ کی پیدائش ذی الحجہ میں ہوئی اور اُن کی خواہش تھی کہ انتقال بھی اسی حج کے مہینہ میں ہو تو قسام ازل نے ان کی تمنا پوری فرمائی۔اس طرح 9/ذی الحجہ 1322ھ کی شام بعد مغرب یہ گنجینۂ سخن دنیا سے سب کو داغِ مفارقت دے گیا۔(72)۔داغؔ کی شعری تصانیف میں گلزارِ داغؔ، آفتاب داغؔ، یادگارِ داغؔ، اور ضمیمہ یادگارِ داغؔ'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

داغؔ سے متعلق تذکرہ میں آتا ہے کہ وہ حنفی المذہب تھے۔وہ نہ صرف رسول اکرم ﷺ سے بلکہ آل رسول ﷺ، صحابہ کرام علیھم الرضوان، اور صوفیہ سے بھی انہیں حد درجہ محبت و عقیدت تھی۔درج ذیل اشعار سے ان کی اس عقیدت و محبت کا اظہار ہوتا ہے :

رتبے سے میرے قیصر و سنجر کو ربتہ کیا
میں ہوں غلام شاہِ عراق و حجاز کا

....

یہ داغؔ ہے صحابہ عظام کا مطیع

یہ داغؔ جاں نثار ہے آلِ رسول ﷺ کا

داغؔ دہلوی کا بچپن قلعہ معلّٰی کی پر شکوہ ماحول میں گزرا۔اس کے باوجود ان کے مزاج میں شان وشوکت کے علاوہ سادگی بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔مزاج میں منصفی کے خصوصیات تھےعفوو درگزر ان کے مزاج کا حصہ تھا۔ان کا ایک شعر ان کے اس مزاج کی نمائندگی کرر ہا ہے۔وہ کہتے ہیں:

یہ کام ہیں آساں انساں کو مشکل ہے

دنیا میں بھلا ہونا دنیا کا بھلا کرنا

داغؔ کا نہ صرف مزاج بلکہ اُن کی زبان بھی بڑی دلکش اور پُراثر تھی،جس کی وجہ سے اُنہوں نے شعری فن میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہادئے۔داغؔ اپنے دور کے سب سے زیادہ معروف اور پسندیدہ شخصیت کے مالک تھے۔ان کے شاگرد پورے برِصغیر ہندو پاک میں پھیلے ہوئے تھے اس طرح ان کے قارئین کا حلقہ بھی وسیع تھا۔داغؔ بنیادی طور پر عشق مجازی کے شاعر ہیں مگر اس کے باوجود ان کا پختہ عقیدہ اور شفاف مزاج اور ہم عصروں کے اثرات (بالخصوص امیر مینائی) بھی قبول کئے۔اس لیے ان کے یہاں عشق مجازی کے ساتھ ساتھ عشق حقیقی کی جلوہ نمائی بھی دیکھی جاسکتی ہے۔بقول ڈاکٹر سید محمد علی زیدی:

''داغؔ نے امیرؔ کے بھی کچھ اثرات قبول کئے ہیں جسے عام طور سے امیرؔ اور داغؔ کے تمام تذکرہ نویسوں نے نظر انداز کردیا ہے۔یہ اثر ہے داغؔ کے کلام میں کہیں کہیں صوفیانہ رنگ کی جھلک دکھائی دیتی ہے''۔(73)

اسی مناسبت سے داغؔ کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن میں صوفیانہ فکر نظر آتی ہے:

کہی زندگی بھر کی سب واردات

مری روح پیغام بر ہوگئی

....

صفت حسن کرے کوئی کسی پردے میں

ہے گرچہ سب کی آنکھ ترے حسن کی طرف

....

جہاں تیرے جلوے سے معمور نکلا
پڑی آنکھ جس پر کوہِ طور نکلا

....

حقیقت میں ہے ماسوا چیز ہی کیا
ادھر تو، اُدھر تو، یہاں تو وہاں تو

....

ہر ایک بے نمود کی اس سے نمود ہے
موجود ہے وہی جو عدیم الوجود ہے

....

جزو میں کل کو دیکھتے ہیں
کون سا ذرہ آفتاب نہیں

....

بظاہر ہے دوئی پر اصل میں وحدت ہی وحدت ہے
نہ جانا ایک تو نے ہائے غافل دو کو دوجانا

....

ترا جلوہ ٹھہرا ہے مقصود عالم
کہ ساری خدائی کا حاصل یہی ہے

....

جلوۂ یار سامنے ہے مگر
شوق کی بے خودی نہیں جاتی

داغ کے یہاں بھی اپنے فکر ونظر اور شعور کے اعتبار سے متصوفانہ خیالات جیسے حسنِ حقیقی کی جلوہ گری، وحدت الوجود کا تصور، وجود حقیقی کا مشاہدہ اور دیدار کی کیفیات کا ذکر فصاحت و بلاغت کے روپ میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ان کے کلام کا مطالعہ زبان کی چاشنی کے ساتھ ساتھ متصوفانہ فکر کی غمازی کرتا ہے۔ چند اور مثالیں داغ کے کلام سے درج کی جاتی ہیں جن کے مطالعہ سے ان کے عشقیہ رویے، آرزو، اور منزل کے علاوہ مقام دل، عظمت انسانی اور دیگر صوفیانہ موضوعات کو اپنے کلام میں برتا ہے:

مزے عشق کے کچھ وہی جانتے ہیں
کہ جو موت کو زندگی جانتے ہیں

....

عشق آخر کو مسلط ہوگیا
دل میرا ہارا نہ ہائے ذوق ِشوق

....

منزل عشق درکنار رہی
چاہئے پہلے راہ بر کی تلاش

....

دل کے سوا نہ کعبے میں ہے نہ دیر میں
گر ہے تو بس یہیں ہے نہیں تو کہیں نہیں

....

ہو صفائی اگر تو کیا ممکن
دل کی دل کو خبر نہ ہوجائے

....

فرشتے بھی دیکھیں تو کھل جائیں آنکھیں
بشر کو وہ جلوے دکھائے گئے ہیں

داغ کے فکروفن میں حسن وعشق کی مجازی کیفیات، رنگ حقیقی اور تصوف کا رنگ اختیار کرتے ہیں۔صوفی شعراء نے لکھا ہے کہ شاعر مجاز سے گزرتے ہوئے ہی حقیقت کی طرف جست لگاتا ہے۔لہذا اس بات سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ داغ نے بھی مجاز سے حقیقت کا سفر طے کیا ہے اور اس میں ان کے ماحول اور مزاج کی پاکیزگی کا بھی دخل ہے۔غرض ان کے یہاں متصوفانہ رنگ وآہنگ کے اثرات بھی نمایاں ہوتے ہیں۔☆

اکبر الہ آبادی:

اصل نام سید اکبر حسین رضوی ولد تفضل حسین رضوی، 16 نومبر 1846ء کو موضع بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ والد بڑے دین دار آدمی تھے اور عربی و فارسی زبانوں میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔اکبر نے ابتدائی تعلیم والد کے ذریعے حاصل کی۔مختاری کا امتحان 1866ء میں کامیاب کر کے نائب تحصیلدار مقرر ہوئے۔ہائی کورٹ میں منصف کے عہدے پر 1881ء میں فائز ہوئے اور سیشن جج کی حیثیت سے 1894ء کو تقرر عمل میں آیا۔مگر صحت کی خرابی کی بنا پر قبل از وقت 1903ء کو پنشن لے لی۔بعد ازاں علم و ادب کے میدان میں کارہائے نمایاں ادا کرتے ہوئے 2 دسمبر 1921ء کو انتقال کر گئے۔

اکبر کے متعلق محققین اور ناقدین کا خیال ہے کہ ان کے مزاج میں عجز و انکسار، ظاہر و باطن میں یکسانیت اور طبعاً نہایت خلیق اور حساس بھی تھے۔گھر کا ماحول مذہبی تھا چونکہ ان کے والد گرامی ایک صوفی منش آدمی تھے اور والدۂ ماجدہ پارسا اور مذہبی قسم کی خاتون تھیں۔اسی وجہ سے ان کے مزاج میں مذہبی رنگ اور محبت وراثت کے طور پر پائی تھی۔ان کے لڑکپن میں ان کے گھر پر مجلس سماع اور دیگر مذہبی محفلیں سجائی جاتیں۔اس کے اثرات اکبر کے فکر پر بھی وارد ہوئے۔چنانچہ سادگی، خودداری، صداقت، ہمدردی، مہمان نوازی، وغیرہ جیسی صفات نے انہیں ایک صوفیانہ خیالات کا حامل بنایا۔انہوں نے بچپن ہی سے شاعری شروع کی اور اپنے ماحول کے مطابق انہوں نے غزل کو اپنا محور و مرکز بنایا۔

اکبر الہ آبادی کی شاعری ابتداء ہی سے عشق کے رمز سے آشنا رہی۔ان کا عشق خیالی نہیں تھا بلکہ ان کے دلی جذبات واحساسات کا حامل تھا۔اس ابتدائی عہد میں بھی ان کے اشعار میں کہیں کہیں متصوفانہ رنگ جھلکتا تھا۔اکبر کے یہاں مزاح کے ساتھ ساتھ انسانی مسائل کی نمائندگی ملتی ہے وہ قوم وملت کو خواب غفلت سے جگانا چاہتے ہیں اور ان کو ایمان کی روشنی سے ان کے عقیدہ اور فکر کو پاکیزہ بنانے کے بھی قائل نظر آتے ہیں۔اس کے علاوہ زندگی کی حقیقت اور تصوف کے امتزاج سے نئی فکر دینے کی سعی کرتے ہیں۔اکبر الہ آبادی کے صوفیانہ رنگ میں تقویٰ، تزکیہ باطن، بلند اخلاق اور اعمال وغیرہ کی پاکیز

گی نمایاں اور مترشح ہوتی ہے۔اس کے علاوہ انسانی زندگی کی گوں نا گوں مسائل اور مراحل کا تذکرہ صوفی آمیز لب ولہجہ میں بیان کیا ہے۔شعر ملاحظہ فرمائیں:

طلب ہے حق کی تو مل آکے ہم سے مستوں سے
نہیں ہے میکدہ خالی خدا پرستوں سے

....

تصوف ہی زبان سے دل میں حق کا نام لایا ہے
یہی مسلک ہے جس میں فلسفہ اسلام لایا ہے

....

تصوف کے بیاں کو ہوش نے روح آشنا پایا
معانی کچھ نہ سمجھا پر قیامت کا مزا پایا

....

رہ معرفت میں جو رکھا قدم
خودی بھی بس اب نقشِ پا ہوگئی

....

جوگذر گیا خودی سے تو وہ ملے گا اسی سے
نہ ہوا اے رب ارنی نہ صدائے لن ترانی

....

ان ہی کے مطلب کی کہہ رہاہوں زباں میری ہے بات ان کی
ان ہی کی محفل سنوارتا ہوں ، چراغ میرا ہے رات ان کی

اکبرالہ آبادی کا کلام صوفیانہ خیالات کی عکاسی کرتا ہے۔ان کے یہاں توحید ومعرفت،عرفان و وحدت،شریعت و طریقت وغیرہ کے رموز اپنے اشعار میں یوں پیش کرتے ہیں: بقول عشرت رحمانی :

''حضرت اکبرالہ آبادی کی شاعری فلسفہ،حکمت،تصوف کے رموز ونکات کا

خزینہ ہے"۔(74)

اسی مناسبت سے کچھ شعر درج کئے جاتے ہیں:

سالک کو دم تیغ ہے قطعِ رہِ توحید
دو ہوگیا اک آن میں چوکا جو ذرا بھی

....

عارف جو ہیں رہیں گے وہ اللہ ہی کے ساتھ
اللہ ہی ہے ان کی تسلی کے واسطے

....

معرفت خالق کی عالم میں بہت دشوار ہے
شہرِ تن میں جبکہ خود اپنا پتا ملتا نہیں

....

شریعت کا ساغر طریقت کی مل ہے
کہیں کُل میں جزو ہے کہیں جزو میں کُل ہے

....

آرزوئے شربت دیدار رہنے دیجئے
لن ترانی خود شراب ِ معرفت ہے اے کلیم

راہ سلوک میں سالک پر وارد ہونے والے احساسات جیسے "خودی"، "بیخودی"، حقیقت، طلب، حیرت، التجا، ترک دنیا، صفائے قلب، توکل، فقر اور وجود و شہود وغیرہ کیفیات کو اپنے کلام میں کچھ اس طرح پرویا ہے:

خودی و بیخودی دونوں ہیں عکس ِ صورت جاناں
اُسی کو جلوہ گر پاتے ہیں جس عالم میں جاتے ہیں

....

عالمِ فطرت پہ ہے میری نظر بھی اے حکیم

فرق یہ ہے تجھ کو عقل آئی مجھے حال آگیا

....

انہیں کی آنکھ سے ممکن ہے انکا دیکھنا اے دل
بنوں حیرت آئینہ نہ کیونکر بزمِ جاناں میں

....

سالک راہِ محبت کو خرد سے کیاکام
وہ تو چاہے گا کہ خود ہوش بھی ہمراہ نہ ہو

....

ایک عالم منتظر ہے بس الٹے اب نقاب
کیجئے برپا قیامت لن ترانی ہوچکی

....

ترکِ دنیا سے ہوئی جمعیت خاطر نصیب
حال مرا گوکہ ظاہر میں پریشاں ہوگیا

....

باطن سے ہوں نظارگیِ جلوۂ جاناں
آئینہ معنی ہے صفائی مرے دل کی

....

ہوئے مطلوب جسے زادہ راہ منزل فقر
گرہِ صبر میں وہ نقد توکل باندھے

....

یہ دعویٰ ہے مرا اس پر مرے دل کی گواہی ہے
ہوا جوکچھ جو ہوتا ہے جو ہوگا سب خدا ہی ہے

....

ہم نے مخلوق میں خالق کی تجلی پائی
دیکھ لی آئینہ میں آئینہ گر کی صورت

صوفی مشاہدۂ حق کی گفتگو کرتا ہے چونکہ ایک صوفی کی آنکھ صرف حقیقت کا مشاہدہ کرتی ہے اور سالک مشاہدہ میں جب حد سے گزرتا ہے تو محوِ حیرت ہوجاتا ہے کہ اور دنیا و مافیا کی لذتوں سے بے نیاز ہوکر عالم حیرت کی لذتوں سے سرفرازی حاصل کرتا ہے۔اکبؔر ان لطیف صوفیانہ اور عارفانہ تصورات کو اپنے کلام میں بیان کرتے ہیں۔اکبؔر الہ آبادی کے یہاں راہ سلوک میں عشق کی اہمیت، انفرادیت، مراحل، مسائل، منازل وغیرہ کو ہی اپنا مدعا بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ دین و ایمان میں جلا عشق سے ہی حاصل ہوتی ہے اور عشق ہی ایک ایسی کیفیت ہے جس سے منزل مقصود کا حصول ممکن ہے۔عشق کی راہ میں شوق و ذوق ایک عاشق بامراد کو رہبر بناتی ہے اور عشق کی منزل تک عقل کی رسائی نہیں ہوتی ہے۔

ہے عشق میں ہر لحظہ ترقی مرے دل کی
ہر داغ بڑھاتا ہے تجلی مرے دل کی

....

اُنہیں ہے عقل جو محتاجِ غیر ہردم
مجھے ہیں عشق کہ جو خود ہے مدعا میرا

....

پوچھتے کیا ہوا صولِ مذہب رندانِ عشق
یار کا ارشاد ان کا دین و ایماں ہوگیا

....

منزلِ عشق و توکل منزل اعزاز ہے
شاہ سب بستے ہیں ہاں کوئی گدا ملتا نہیں

....

فیضِ باطن سے مددلے عشق کا ہوجا مرید

اہل ظاہر کے ملائے تو خدا ملتا نہیں

....

یہ عشق ہی ہے کہ منزل ہے جس کی الااللہ
خرد نے صرف رہ لاالہ پائی ہے

....

چشم خرد سے عار تھی حسن جنوں پسند کو
عقل نے آنکھ بند کی اس نے حجاب اٹھا دیا

....

ضرورت کم ہے راہِ عشق میں خضر ہدایت کی
بہ قدرِ شوق سالک خود کشش محمل میں ہوتی ہے

اکبؔر ظریفانہ شاعر ہونے کے باوجود علم وعرفان اور تصوف کے کئی اہم نکات کو اپنے کلام میں بیان کیا ہے۔اکبر کے یہاں روایتی تصوف کے بجائے ٹھوس اور عملی متصوفانہ خیالات کو پیش کرنے کی سعی کرتے ہیں اور ان کے ان صوفیانہ شعری بیانات میں وارفتگی اور والہانہ عقیدت کے ساتھ ساتھ بصارت وبصیرت اور گہرائی وگیرائی بھی نمایاں ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان کا کلام فکری وفنی اعتبار سے نہ صرف ظریفانہ بلکہ متصوفانہ احساسات وجذبات کی آئینہ داری کرتا ہے۔صغرا مہدی کے اس قول سے میں اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ:

> ''اکبؔر نے تصوف کے عام مروجہ مسائل کو رسمی طور پر اپنے شعروں میں نہیں پیش کیا ہے بلکہ ان کے بیان میں گہرائی اور گیرائی ہے۔خاص اور والہانہ پن ہے۔انہوں نے بچپن سے اپنے گھر میں تصوف کا چرچا سنا تھا بڑے ہو کر اس کا مطالعہ کیا تھا۔اُس پر غور کیا تھا''۔(75)☆

مولانا امام احمد رضا خان بریلی علیہ الرحمہ:

امام احمد رضا خان بریلوی علیہ رحمہ کی شخصیت ہمہ جہت اور ہمہ پہلو رہی ہے۔مولانا کو مفکرِ اسلام، جید عالم دین، اور صوفئی باصفا کی حیثیت حاصل رہی ہے۔مگر شاعر کی حیثیت سے امام موصوف کو ناقدین نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی حالانکہ یہ

مسلمہ حقیقت ہے کہ نعت نگاری میں تا حال ان جیسا شاعر دور دور تک نظر نہیں آتا۔امام احمد رضا کی شاعری میں عشقِ رسول ﷺ کے ساتھ ساتھ انسانی علوم کا گویا ایک سمندر ٹھاٹیں مارتا نظر آتا ہے۔تاریخ،فکر وفلسفہ،نفسیات ومنطق،سیاسیات وسماجیات،معاشیات وتجارت،ادبیات،اور سائنس جیسے علوم وفنون کی کہکشاں سجی معلوم ہوتی ہے۔ایک ماہرِ فن کی طرح انہوں نے قوسِ قزح کے ہر رنگ کو خوبصوتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔وہ ایک وسیع المطالعہ،گہرے مشاہدہ اور طویل مجاہدہ کے حامل قلم کار اور ایک عالم باعمل کے منصب پر فائز تھے اور آج بھی ان کا علمی وروحانی فیض جاری ہے۔

امام احمد رضا خانؒ 14 رجون 1856ء کو بریلی کی سرزمین پر تولد ہوئے۔امام موصوف بچپن ہی سے ذہانت اور فطانت کے مالک تھے۔ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد 21 سال کی عمر میں اپنے والد نقی علی خان کے ساتھ شاہ آل رسول مارہروی سے بیعت کیا اور تمام سلاسل کی اجازت وخلافت اور سند حدیث حاصل کی۔حضرتِ رضا بریلوی نے اپنی زندگی عشقِ رسول ﷺ اور دینِ رسول ﷺ کی تبلیغ واشاعت میں گزار دی۔/28 اکٹوبر 1921ء کو اس عالم آب وگل سے رخصت ہوئے

۔

تصوف کے رموز ومعارف،حقائق واسرار،اشغال واذکار اور صوفیہ کرام کے اخلاق وکردار کا تذکرہ امام احمد رضا کی تصانیف میں ملتا ہے۔ان کی کوئی ایک ہزار تصنیفات وتالیفات کا ذکر کیا جاتا ہے۔آپ ایک کثیر العلوم مصنف کا درجہ رکھتے ہیں۔جن کی مختلف علوم وفنون میں کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔علم سلوک،علم اخلاق،علم اذکار اور علم تصوف وغیرہ کے علاوہ آپ ایک ایسا کارنامہ ہے جسے مولانا نے تنہا اس کام کی تدوین فرمائی ہے۔جس کو فقہ کا انسائیکلو پیڈیا کہا جاسکتا ہے۔''فتاوی رضویہ'' جس کی 12 جلدیں جو ہزار ہا صفحات پر مشتمل ہیں۔اس کے علاوہ کنز الایمان جو قرآن مجید والفرقان حمید کا ترجمہ ہے جس کی انفرادیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ان علوم وفنون کے علاوہ آپ بحیثیت شاعر بھی اہمیت رکھتے ہیں مگر آپ کے مذہبی و علمی کارنامے کی وجہ سے آپ کے شعری کارناموں کو ناقدین نے نظر انداز کیا ہے۔آپ نے عربی،فارسی اور اردو میں شاعری کی ہے۔آپ کی شاعری کا محور ومرکز عشق رسول ﷺ رہا ہے۔مولانا کا شعری مجموعہ ''حدائقِ بخشش'' ان کے تبحرِ علمی کا ایک مرقع ہے۔جس میں شامل کلام آج بھی برِصغیر ہندو پاک کے چپہ چپہ میں گونج رہا ہے۔بالخصوص ''مصطفی جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' پوری دنیا میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا اردو سلام ہے اور اس سلام کی ادبی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔جس میں فکر وفن پورے شباب پر نظر آتا ہے۔مولانا کے دیگر نُعوت اور مناقب کے مطالعہ کے بعد یہ احساس جاگزیں ہوجاتا ہے کہ امام نعت گویاں کے فکر وفن میں زبردست تخلیقی اپج موجود ہے۔اگر وہ مکمل طور پر صرف ادب وشعر کی طرف توجہ دیے

ہوتے تو یقیناً اردو شعر وادب میں ایک انقلاب بر پا ہوسکتا تھا۔غرض ’حدائق بخش‘ رضا بریلوی کا ایک ایسا خزینہ ہے جس کے ہر شعر میں علم وعرفان، اسرار ومعارف اور عشق ومحبت کی خوشبوؤں سے معطر اور عشق رسول سے سرشاری جلوہ گر ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمایئے:

دل میں روشن ہے شمعِ عشقِ حضور
کاش جوشِ ہوس ہوا نہ کرے

....

جا ن ہے عشق ِ مصطفیٰ روزِ فزوں کرے خدا
جس کو ہو درد کا مزہ نازِ دوا اُ ٹھائے کیوں

....

لحد میں عشق رخ شہ کا داغ لیکے چلے
اندھیری رات سی تھی چراغ لیکے چلے

....

اے عشق تیرے صدقے جلنے سے چُھٹے سستے
جو آگ بجھا دیگی وہ آگ لگائی ہے

....

جلی جلی بو سے اس کی پیدا ہے سوزِشِ عشق چشم والا
کبابِ آہو میں بھی نہ پایا مزہ جو دل کے کباب میں ہے

رضا بریلوی کا دل عشقِ رسول ﷺ کی سرشاری میں مستغرق نظر آتا ہے۔آپ نے نعتیہ کلام میں عشق کی ایسی گرمی دکھلائی ہے کہ اس طرح محبت اور عشق کی حرارت عالم اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ میں قال قال ہی نظر آتی ہے۔اس کے علاوہ امام موصوفؒ عشق رسول ﷺ کو جہنم سے نجات کا راستہ قرار دیتے ہیں۔ان کے قلب و سینے میں جب عشق مصطفیٰ ﷺ کا جذبہ وادرد ہوتا ہے تو وہ جذبہ کمال کو پہنچتا ہے۔عشق کی کیفیات اور تصورات کو پاکیزگی اور احساس جمال کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔صوفیہ کے یہاں تصوف کا دوسرا نام عشق رسول ﷺ ہی قرار پاتا ہے اور عشق رسول ﷺ ہی تصوف کی

اساس اور بنیاد ہے۔ چونکہ مصطفی جان رحمت ﷺ کی ذات کامل، مقدس اور تمام عالم کے لیے منارۂ نور ہے جس کی روشنی سے سارا عالم منور ہے۔ اس کے علاوہ صوفیہ نے سلاسل کی بزرگی، اطاعت، سلوک، طریقت، حقیقت وغیرہ کے تعلق کو اسی ذات اقدس ﷺ سے وابستگی کو کہتے ہیں۔ غرض امام احمد رضا کے یہاں نعتیہ شاعری کے تقدس کے ساتھ ساتھ حقیقی تصوف و معرفت کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ شعر دیکھئے:

خدا کی رضا چاہتے ہیں دو عالم
خدا چاہتا ہے رضائے محمد ﷺ

....

ہم عہد باندھے ہیں وصل ابد کا
رضائے خدا اور رضائے محمد ﷺ

....

ایمان ہے قالِ مصطفائی ﷺ
قرآن ہے حالِ مصطفائی ﷺ

امام احمد رضا فاضل بریلوی کی تمام تر شاعری میں مرکزی نکتہ رسی حضور اکرم ﷺ کی مبارک ذات کو محیط رہی ہے۔ اور اسی محبوب ﷺ کی رفعت و شان بیان کرنے کو شعری معراج متصور کرتے ہیں۔ ان کا یہ وصف خاص ہے کہ انہوں نے اپنے کلام میں تصوف کے مختلف اسرار و رموز کو آقائے دو جہاں ﷺ کی ذات سے وابستہ کرتے ہوئے آپ ﷺ کے عشق میں ایسے محو ہوجاتے ہیں کہ ان کی شاعری نہ صرف آمد ہی آمد کی کیفیت سے دوچار ہوتی ہے بلکہ اس ذات مبارک ﷺ سے بے پناہ عقیدت کا اظہار کے کئی نادر مثالیں بھی آشکار ہوجاتی ہیں۔ بدرالدین احمد قادری نے آپ کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ''حدائقِ بخشش'' کے مضامین کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''آپ کے نعتیہ دیوان حدائق بخشش حمد و نعت، دُعا و التجا، سلام و منقبت، عشق اور محبت، حقیقت و معرفت، معجزات و کرامات، شرح آیات و احادیث وغیرہ مضامین کا ایک ایسا بحر زخار ہے جس کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ کرنا اہل بصیرت حضرات ہی کا کام ہے۔''(76)

کلام رضا کا مطالعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ آپ نے رسول اکرم ﷺ کے عشق کو محور و مرکز بناتے ہوئے اس دور میں شاعری کو معراج عطا کی ہے جس دور میں گل و بلبل کے قصے اور عشق مجازی کی باتیں اردو شاعری میں عام تھیں۔ پاکیزہ و صوفیانہ جذبات اور جمالیاتی احساسات ان کا مقصود ہے۔ چنانچہ سید شمیم اشرف رقم طراز ہیں:

''خالص، پاکیزہ اور بے لوث عشق تصوف کا سنگ بنیاد ہے۔ اسی عشق اور شیوہ تسلیم و رضا کی تکمیل کیلئے تاجدار کونین کیلئے غار حراء کو مکتب ایمان و آگہی بنایا گیا۔ اور یہیں سے راہ باطن اور تصوف کے مقدس چشمے رواں دواں ہوئے۔ جس سے نابلدِ شریعت طریقت اور حقیقت کے لالہ و گل بالیدگی حاصل کرتے ہیں۔'' (77)

تصوف کی اپنی راہ و رسم مسلم ہے۔ صوفیہ کے یہاں اس کے مختلف ابعاد بھی ہیں۔ کسی نے اسے اخلاق کہا تو کسی نے ادب۔ یقیناً تصوف علم الادب بھی ہے اور علم الاخلاق بھی۔ تصوف، یعنی وقت، مقام، حال و قال کے آداب کا نام ہے۔ اسی کو اکابر صوفیہ کے یہاں ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ اس تناظر میں جب ہم آپ کی شخصیت اور شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ آپ کی زندگی اور کلام سراپا اخلاق اور آداب سے مزین ہے۔ آپ نے سرور کونین ﷺ کی نسبت ایسے آداب بجائے لائے ہیں جس کی تاریخ میں شاید ایسی مثال قال قال ہی نظر آتی ہیں۔ آپ نے نہ صرف عشق رسول ﷺ بلکہ نسبت رسول ﷺ کو بھی مقدم جانا۔ لہذا آل رسول ﷺ سے بھی اسی قدر ادب و احترام سے پیش آتے۔ بارگاہ رسول ﷺ، آلِ رسول ﷺ اور صوفیہ سے حد درجے آداب کی مثالیں اس بات کی نشان زد کرواتی ہیں کہ عشق کے آداب میں آپ کا کوئی ہمسر نہیں۔ آپ کی ذات میں صوفیانہ فکر و نظر کی بھی غمازی ہوتی ہے:

ارے یہ جلوہ گاہِ جاناں ہے
کچھ ادب بھی ہے پھڑکنے والے

....

آہستہ پاؤں رکھنا مدینہ کی راہ رضاؔ
دل فرشِ راہ ہیں نہ کوئی ٹوٹ جائے دل

....

حرم کی زمیں اور قدم رکھ کے چلنا

ارے سر کا موقع ہے او جانے والے

''بخدا دیوانہ باش با محمد ﷺ ہوشیار'' کے مصداق اعلی حضرت نے اپنے بیشتر اشعار میں آپ ﷺ کی محبت ،عقیدت ، شریعت ،طریقت ،معرفت ،حقیقت وغیرہ کو پیش نظر رکھا ہے اور ایک سچے عاشق صادق اور صوفی ء با صفا ہونے کا یقین بھی دلوایا ہے۔ آپ کا صوفیانہ میلان وحدت الوجود کی طرف مائل تھا۔ حضرت کا وحدت الوجود حضور ﷺ کی ذات کے وسیلے سے خدا تک پہنچتا نظر آتا ہے۔ چند شعر پیش ہیں:

محیط و مرکز میں فرق مشکل رہے نہ فاصل خطوطِ واصل
کمانیں حیرت سے سر جھکائے عجیب چکر میں دائرے تھے

....

ممکن میں یہ قدرت کہاں واجب میں عبدیت کہاں
حیراں ہوں یہ بھی ہے خطا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں

....

حق یہ کہ ہیں عبدِ الہ اور عالم امکاں کے شاہ
برزخ ہیں وہ سرِ خدا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں

....

وہی نور حق وہی ظل رب ہے اُنہی کا سب ہے اُنہی سے سب
نہیں اُن کے ملک میں آسماں کہ زمین نہیں کہ زماں نہیں

....

ہے اُنہی کے نور سے سب عیاں ہے انہیں کے جلوے میں سب نہاں
بنے صبح تابش نور سے ہے پیش مہر یہ جاں نہیں

....

وہی ہے اول وہی ہے آخر وہی ہے باطن وہی ہے ظاہر
اُسی کے جلوے اسی سے ملنے اُسی سے اُس کی طرف گئے تھے

رضا بریلوی کے کلام میں تصوف و معارف کے جلوے جا بجا نظر آتے ہیں۔ان کے اس معرفت میں عشق رسول ﷺ ایک غالب عنصر ہے جو امام احمد رضا کی زندگی اور بندگی کو ظاہر کرتا ہے۔بقول ڈاکٹر افضل الدین جنیدی:

'امام احمد رضا فاضل بریلوی کی تمام شاعری میں تصوف کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔یہاں طوالت کے پیش نظر چند اشعار کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔اختتام میں یہ پیغام، اعلیٰ حضرت کی شاعری اور ان کے فکر و شعور سے ہمیں یہ ملتا ہے جسے ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس لطیف پیرائے میں انہوں نے بیان کیا ہے اس انداز کا اظہار بغیر علوم معارف اور تصوف کے سمندر میں غوطہ زنی کے حاصل نہیں ہوتا۔تحقیق و تصنیف کا کام جتنا امام احمد رضا کے علوم کے مختلف پہلوؤں پر ہوا ہے اس کے باوصف تصوف کا پہلو ابھی تشنہ نظر آتا ہے۔امام احمد رضا کی شایانِ شان اُن کی صوفیانہ زندگی کی اگر عکاسی کی جائے تو سرمایائے رضویات کا یہ مخفی پہلو بھی روشن و تابناک ہو جائے گا۔"(78)

غرض صوفیانہ شاعری کے حوالے سے رضا بریلوی کی شاعری با اثر اور پر لطف احساسِ جمال پر دال ہے۔☆

علامہ اقبال:

علامہ اقبالؔ کے آباو اجداد کا تعلق کشمیری برہمن خاندان سے تھا۔بعدہ ان کے بزرگوں نے اسلام قبول کیا اور کشمیر سے ہجرت کرتے ہوئے سیالکوٹ میں مقیم ہوئے۔اقبالؔ کے والد شیخ نور محمد ایک صوفی منش آدمی تھے اور ان کی والدہ بھی خدا رسیدہ خاتون تھیں۔اقبالؔ پنجاب کے شہر سیالکوٹ 1877ء میں پیدا ہوئے۔اقبالؔ کے والدین نے ان کی پرورش کچھ اس طرح کی کہ اقبال ایک مذہب پرست اور عشق رسول ﷺ میں سرشار رہے۔اقبالؔ نے سیالکوٹ کے اسکاچ مشن کالج سے ایف۔اے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے 1897ء میں بی۔اے پاس کیا۔اقبالؔ اپنے تعلیمی سفر کو جاری رکھتے ہوئے 1899 میں لاہور سے ایم۔اے (فلسفہ) کی سند سے سرفرازی حاصل کی۔اس کالج میں آپ نے مسٹر آرنلڈ اور سر شیخ عبدالقادر سے درس لیتے ہوئے ان کی شخصیت اور فکر سے فیض اٹھایا۔1905 میں ولایت پہنچے اور کیمرج یونیورسٹی لندن میں

فلسفہ اور معاشیات میں ڈگریاں حاصل کیں اور تین سال تک مختلف موضوعات اسلامی پر خطبات اور لیکچرس بھی دئے۔اس دوران ان کی شہرت ومقبولیت علمی حلقوں میں پھیلنے لگی۔اس دور میں وہ بحیثیت شاعر بھی ایک حلقے کو متاثر کر رہے تھے۔ابتداء میں انہوں نے داغ سے اصلاح لی۔مگر بہت جلد اپنی منفرد راہ نکالی۔ان کی شاعری میں غالب کی شاعری کی فکر اور فلسفہ کا اثر دکھائی دیتا ہے۔اس کے علاوہ دیگر اساتذہ شعراء بالخصوص مولانا روم کی شاعری سے مستفیض ومستنیر معلوم ہوتے ہیں۔اور مولانا رومی سے اس حد تک عقیدت رکھتے ہیں کہ انہیں اقبال اپنا معنوی استاد کہتے ہیں۔علامہ اقبال اپنے زمانے ساتھ ساتھ آج تک بھی علمی وشعری اور مذہبی حلقوں کے پسندیدہ شاعر رہے ہیں۔ان کے کئی اشعار زبان زدخاص و عام ہیں اور روزمرہ اورضرب المثل بن چکے ہیں۔وہ شاعر ہیں یا فلسفی اس پر ہر دور میں ناقدین نے بحث کی ہے مگر ان کا پیغام اہم ہے اور یہ پیغام ہی قاری کا سرمایہ حیات ہے۔اقبال کے پیغام میں مختلف روحانی وعلمی شخصیات کی صفات کے اثرات بھی ملتے ہیں۔بقول مولوی محمد طاہر:

> ''اقبالؔ بے شبہ اس عصر کے واحد ''مصلح اور مجدد'' تھے وہ غزالی اور رازی بھی تھے۔عطار وسنائی بھی،سعدی و رومی بھی حالی واکبر بھی،اور میر و غالب بھی،تصوف وحکمت،عشق وموعظت اثر ورجائیت اور اصلاح ومجددیت کا یہ اجتماع دنیا ئے ادب کے اس ''خاتم الشعرا'' ہی کیلئے محفوظ رکھا گیا تھا''۔(79)

اقبالؔ کی فکر وشعور کو بالیدگی اور وسعت عطا کرنے میں قرآن مجید اور احادیث نبوی ﷺ کے علاوہ مولانا رومؒ، اور دیگر روحانی شخصیات بھی شامل ہیں۔وہ خود کو حضرت مولانا روم کا شاگردِ روحانی ومعنوی تسلیم کرتے ہوئے خود کو مریدِ ہندی اور مولانا کو پیرِ رومی کہتے ہیں۔اقبال کا خیال ہے کہ مولانا رومؒ نے قرآنی واسلامی تعلیمات ونظریات،جذبہ عشق رسول ﷺ اور تصوف وسلوک کے رموز وحقائق کو اپنی مثنوی میں بیان فرمایا ہے:

صحبت پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سربہ جیب ہوں ایک کلیم سر بکف

....

علاج آتشِ رومی کے سوز ہے ترا

تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

....

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن

اسی کے فیض سے میرے بسو میں ہے جیحوں

اقبالؔ اپنی ذات میں انجمن تھے۔اسی لئے وہ پوری بیسویں صدی کے حاوی شاعر رہے ہیں۔اقبالؔ ظاہر کے مقابلہ میں باطن میں ایک صوفی باصفا چھپا ہوا تھا۔ان کا قلب ونظر اور پیغام وکلام، راہِ سلوک ومعرفت پر چلنے والوں کے لیے راہنمائی کرتا ہے۔اقبال کی عظمت یقیناً مسلم تھی۔اس ضمن میں سید عبداللہ کہتے ہیں:

''اقبالؔ قدرت سے ایک دانائے راز، ایک مفکر اور ایک عارف کا مقدر لے کے آئے تھے جو منصب تفویض کیا گیا تھا۔اس میں خلوت گزینی، غور وفکر، مراقبہ وتفکر لازمی تھے۔فکر کے موتی، خلوت کی غواصی سے ہاتھ آتے ہیں۔ محض فکرِ شعر بھی اس کا متقاضی ہوتا ہے اور حکمت عرفان تو دل کے بحرِ عمیق میں غوطہ لگائے بغیر دشواری سے ہاتھ آتے ہیں''۔(80)

اقبال راہ سلوک وطریقت میں قادریہ سلسلے میں اپنے والد بزرگوار سے بیعت حاصل کی تھی۔مگر علامہ دیگر سلاسل کا بھی حد درجے احترام کرتے تھے۔اقبال کو تو حب پرستوں نے یہ مشہور کر دیا کہ وہ تصوف سے بیزار تھے۔مگر واقعہ یہ ہے کہ اقبالؔ ایسے تصوف سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے جو مومن کی فکر وعمل کو منجمد کرتا ہے۔ان کے دور تک مصنوعی صوفی اور تصوف نے قوم کے حرکت وعمل میں سست روی پیدا کر دی تھی۔توہم پرستی اور بداعتقادی مسلمانوں کے فکر وعمل میں گھر کر چکی تھی۔ایسے میں اقبالؔ ایک مصلح قوم بن کر اس طرح کی بدعات کارفرماتے۔تو حب پرستوں نے اس طرح کی باتوں سے اقبالؔ کو تصوف مخالف قرار دیا ہے جو سراسر غلط ہے۔اس ضمن میں تصدق حسین تاج نے لکھا ہے کہ:

''مسلمانوں پر ایک ایسا تصوف مسلط تھا جس نے حقائق سے آنکھیں بند کر لی تھیں جس نے عوام کی قوت عمل کو ضعیف کر دیا تھا، اور اُن کو ہر قسم کے توہم میں مبتلا کر رکھا تھا۔تصوف اپنے اس اعلیٰ مرتبہ سے جہاں وہ روحانی تعلیم کی ایک قوت رکھا تھا نیچے گر کر عوام کی جہالت اور زود اعتقادی سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بن گیا تھا،

اُس نے بتدریج اور غیر محسوس طریقہ پر مسلمانوں کی قوت ارادی کو کمزور اور اس قدر نرم کر دیا تھا کہ مسلمان اسلامی قانون کی سختی سے بچنے کی کوشش کرنے لگے تھے''(81)

اقبالؔ تصوف کے غلط تشریحات اور مفاہیم سے بیزار تھے ان کا خیال تھا کہ اس طرح کی توضیحات سے عوام صریح گمراہی میں مبتلا ہو سکتے ہیں وہ خالص عشق رسول ﷺ (وابستگان رسول ﷺ) اور اس راہ سے خدا تک پہنچنے کے قائل تھے۔ان کا تصوف اس حدیث کی آئینہ داری کرتا ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ''میں اپنی قوم کے بیچ دو چیزوں کو چھوڑے جا رہا ہوں اگر ان کو مضبوطی سے تھامے رہو تو گمراہ نہ ہونگے وہ دو چیزیں قرآنِ مجید اور آل رسول ﷺ، (دوسری روایت میں اولادرسول ﷺ کے ساتھ صحابہء کرام علیھم اجمعین کا بھی ذکر ملتا ہے(۔ اقبالؔ قوم مسلم کو اسلام کی اصل روح کی طرف مائل کرنا چاہتے تھے وہ دراصل باطن کی صفائی اور خودی کے استحکام کے قائل تھے۔اقبالؔ آخری دم تک قوم و ملت کو اسی روحِ ایمانی (تصوفِ حقیقی) کا پیغام دیتے رہے، اور اُن کا کلام اسی پیغام کی عکاسی کرتا ہے۔علامہ اقبال تقریباً 62 سال کی عمر میں 21 اپریل 1938ء میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

اقبالؔ کے اشعار الہامی و آمدی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔ان کی شاعری واردات و تاثراتِ اور قلب ونظر کی نمائندہ ہے۔اقبال کے کلام میں وجود حقیقی، وجدان، شوق اور صوفیانہ رموز بھی پیش ہوئے ہیں۔اقبال کا تصوف قرآنی تھا۔لہذا فلسفہء وحدت الوجود (حقیقی تصوف) کو اپنے اشعار میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہوں نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحبِ کشاف:

....

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال
مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

....

کہاں سے تونے اے اقبالؔ سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

....

رازِ حرم سے شاید باخبر ہے
ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ

....

مجموعہ اضداد ہے اقبالؔ نہیں ہے
دل دفترِ حکمت ہے طبیعت خفقانی

....

رندی سے بھی آگاہ شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوف کی تو منصور کا ثانی

اقبالؔ کے یہاں خودی کا تصور صوفیانہ مفاہیم کی تشریح کرتا ہے۔اس فلسفہ کو اقبال نے قرآن حکیم اور اقوال صحابہ سے اخذ کیا ہے۔اور یہ نظریہ انسان کی عظمت کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔چونکہ انسان اس کائنات کا ماحصل ہے اور یہ اسی کے لیے سجائی ہوئی بزم ہے اور یہ ایک راز ہے جس کو سمجھتے ہوئے عرفان خودی اور معرفت خدا تک رسائی ہوسکتی ہے۔خودی کی کیفیات کا اظہار درج ذیل میں دیکھا جاسکتا ہے:

خودی کا سرِنہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الہ الااللہ

....

ہے جہاں کی زندگی وابستہ زور خودی
جتنی محکم ہے خودی، اتنی ہی محکم زندگی

....

بے ذوقِ نمود زندگی موت
تعمیرِ خودی میں ہے خدائی

....

خودی میں گم ہو خدائی تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لئے اب صلاح کار کی راہ

....

بے ذوق نمود زندگی موت
تعمیر خودی میں ہے خدائی

....

خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبرئیل
اگر ہو عشق سے محکم تو صور اسرافیل

....

خودی کے زور سے دنیا پہ چھاجا
مقام رنگ و بو کا راز پاجا

....

خودی کیا ہے راز داروں حیات
خودی کیا ہے بیداری کائنات

....

وجود کیا ہے فقط جو ہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود تیرا

....

خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا
وہی ہے مملکت صبح و شام سے آگاہ

....

قوموں کیلئے موت ہے مرکز سے جدائی

ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے خدائی

تصورِ خودی اقبالؔ کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔انسان اگر اپنی ذات کو جاننا گویا خدا کی معرفت تک پہنچنا ہے۔اس نکتہ کو صوفیہ کرام نے سمجھنے اور سمجھانے کی سعی جمیل کی ہے۔دراصل یہ صوفیانہ فقرہ تمام سلاسل کے باوائے آدم اور بابُ العلم حضرت علی کرم اللہ وجہ کا ہے جنھوں نے کہا تھا کہ ''من عرف نفسه فقد عرف ربه'' جس نے خود کو پہچانا اُس نے خدا کو پہچانا۔۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اس نکتے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''خودی کی ماہیت کو جاننا عرفان نفس بھی ہے اور عرفان رب بھی، اور اس عرفان میں یہ واضح ہوجاتا ہے کہ زور خودی سے حیات عالم وابستہ ہے، اور ہر انفرادی نفس کی استواری اس کی زندگی کی ضامن ہے۔ جو قطرہ شبنم بنتا ہے وہ ٹپک کرنا پیدا ہوجاتا ہے۔لیکن جو قطرہ صدر نشین ہو کر اپنی خودی کو مستحکم کر لیتا ہے وہ گوہر بن جاتا ہے''۔(82)

بیان کیا جا چکا ہے کہ اقبالؔ نے پیر رومی سے بہت کچھ اخذ و استفادہ کیا ہے۔اقبالؔ فلسفہ ''عشق'' میں مختلف مفاہیم بیان کئے ہیں۔عشق میں رومی کے ہم نوا نظر آتے ہیں۔اقبال عشق کو دین کا حاصل قرار دیتے ہیں اور قرآن میں بھی مومن کی ایک صفت محبت کا ذکر آچکا ہے۔ان کے یہاں بھی عشق کو اسلام اور ایمان کی اصل کہا ہے۔ان کا عشق مومن کو ایک قوت عطا کرتا ہے کہ وہ تسخیر کائنات کی دعوتِ فکر پر بھی دلالت کرتا ہے۔اقبالؔ نے عشق کے مفاہیم میں بڑی گہرائی و گیرائی پیدا کی ہے۔جس کی وسعت کا اندازہ لگانا مشکل ہے چند شعر دیکھیے:

اے دردِ عشق! ہے گہرِ آبدار تو
نا محرموں میں دیکھ نہ ہو آشکار تو

....

ہے ازل کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقلِ انسانی ہے فانی زندہ جاوید عشق

....

ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش

آہ وہ کامل تجلی مدعا رکھتا ہوں میں

....

زندگی الفت کی درد انجامیوں سے ہرمری
عشق کو آزاد دستور ِ وفا رکھتا ہوں میں

....

بے قطر کو د پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب ِ بام ابھی

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

....

عشق دمِ جبرائیل ، عشق دل مصطفی
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

....

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارحیات
عشق سے نور ِ حیات عشق سے نارحیات

....

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق
معرکئہ وجود میں بدرو حنین بھی ہے عشق

علامہ اقبالؔ بلا شبہ نہ صرف فارسی کے عظیم شاعر تھے بلکہ اردو نظم میں بھی ید طولی رکھتے تھے۔ اقبالؔ عوام وخواص دونوں میں مقبول رہے۔ اقبالؔ کے یہاں فکر وفلسفہ، حکمت و مذہب وتصوف ومعرفت، اورسیاست وقانون وغیرہ کی نزاکتوں سے کما حقہ واقفیت رکھتے تھے، اقبال اردو شاعری کے پہلے ایسے شاعر ہیں جن کو مختلف خطابات عطا ہوئے ہیں جن میں''

سر''، ''علامہ''، ''شاعر ملت''، ''شاعر مشرق''، ''شاعر فلسفی''، ''حکیم الامت''، ''ترجمانِ حقیقت'' اور ''خضرِ عصر'' وغیرہ شامل ہیں۔ غرض اقبالؔ کی شاعری ہمہ وصف خصوصیات کی حامل ہے اور وہ یقیناً تلمیذ الرحمن کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے بقول:

> ''اقبالؔ شاعر بھی ہے اور مفکر بھی، وہ حکیم بھی ہے اور کلیم بھی، وہ خودی کا پیغامبر بھی ہے اور بے خودی کا رمز شناس بھی، وہ تہذیب و تمدن کا نقاد بھی ہے اور محی الملت والدین بھی۔ وہ توقیر آدم کا مبلغ بھی ہے اور تحقیر انسان سے دردمند بھی۔ اس کے کلام میں فکر و ذکر ہم آغوش ہیں، اور خبر و نظر آئینہ یکدگر، ایسے ہمہ گیر دل و دماغ کے مالک اور صاحبِ عرفان و وجدان کے افکار اور تاثرات کا تجزیہ اور اس پر تنقید کوئی آسان کام نہیں۔ اس نے زیادہ تر شعر ہی کو ذریعہ اظہار بنایا کیونکہ فطرت نے اس کو اسی حیثیت سے تلمیذ الرحمن بنایا تھا''(83)☆

حسرت موہانیؔ:

بیسویں صدی کی ابتداء میں علامہ اقبالؔ کے بعد شعری دنیا بالخصوص غزل کو نئی بلندیوں تک لے جانے میں فانیؔ، اصغرؔ، جگرؔ اور حسرتؔ کا نام اہمیت رکھتا ہے۔ اردو غزل کے عناصر اربع میں ایک حسرتؔ نے اردو غزل کو عشق کے ذائقے سے سرشار کیا۔ مولانا کی زندگی کا مثلث صحافت، مذہب اور غزل کہی جاتی ہیں۔ حسرتؔ نے آزادئی ہند کی تحریک میں اپنا گرانقدر رول ادا کیا۔ اصل نام سید فضل الحسن حسرتؔ 1878ء کو اودھ کے ایک قصبے موہان میں سید اظہر حسین کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ حضرت امام علی موسی رضا تک پہنچتا ہے۔ موہان علمی اعتبار سے یونان کے مماثل قرار دیا جاتا ہے اسی مناسبت سے انہوں نے حسرت کو لائقہ بنایا اور علمی، ادبی مذہبی اور سیاسی دنیا میں حسرتؔ موہانی کہلائے۔ حسرتؔ اپنے وطن اور مٹی سے اس قدر لگاؤ رکھتے تھے کہ لوگ ان کے اصل نام سے کم ہی واقف تھے۔ بقول حسرت:

جب سے عشق نے کہا حسرتؔ مجھے
کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

حسرتؔ کی ابتدائی تعلیم موہان ہی میں ہوئی۔ اسکولی تعلیم کے علاوہ عربی اور فارسی مولانا ظہور الاسلام اور مولوی حبیب الدین سے پڑھیں۔ حسرت موہانی کو خانوادۂ چشت میں بیعت و خلافت حاصل تھی۔ ان کے مرشدِ گرامی شاہ عبدالوہاب فرنگی

محل تھے۔مرشد کی نگاہ حق نے مرید کو عشق کے مراتب طے کرنے میں مدد دی چنانچہ حسرتؔ موہانی نے اپنی شاعری کا محور و مرکز ''عشق'' کو بنایا۔حسرتؔ خود کہتے ہیں:

درویشی و انقلاب مسلک ہے میرا
صوفی مومن ہوں اشتراکی مُسلم

....

کیا چیز تھی وہ مرشد وہاب کی نگاہ
حسرتؔ کو جس نے عارفِ کامل بنادیا

حسرتؔ کا میلان طبع مذہبی تھا وہ،صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے،انہوں نے اپنی زندگی میں گیارہ حج اور بارہ مرتبہ مدینہ طیبہ کی زیارت سے سرفراز ہوئے۔ان کے مزاج میں درویشانہ اور قلندرانہ صفت موجود تھی سادگی ان کا شعار رہی۔سیاست اور سیاسی لوگوں سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔وہ اصولوں کے آدمی تھے ان کا باطن اور ظاہر میں یکسانیت پائی جاتی ہے، 13 رمئی 1951ء کو انتقال ہوا۔حسرتؔ خلق و مروت ،اعلیٰ اخلاق و کردار کے مالک تھے،ظاہر ہے ایسی صفات سے متصف شاعر جب شعری دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اُس کی فکر و نظر اور فن میں بھی اخلاقی فکر و نظر کا ہی اظہار ہوتا ہے۔حسرتؔ کی شاعری میں اخلاقی مضامین بدرجہ اتم ملتے ہیں۔حسرتؔ موہانی خود صوفیانہ اور عارفانہ کلام کی توصیف بیان کرتے ہوئے شاعری کو وجدان اور کیفیت سے تعبیر کرتے ہیں۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''شاعری کا تعلق وجدان اور کیفیت روحانی سے ہے اس لئے اسے کسی کاغذی نقشے میں مقید نہیں کیا جاسکتا۔آ گے کہتے ہیں کہ جب تک کسی خاص رنگ میں کم از کم پانچ غزلیں موجود نہ ہوں تب تک وہ رنگ کسی شاعر سے منسوب کرنا مناسب نہیں ہے۔ پانچ چھ مکمل عارفانہ غزلیں کہنے کے بعد شاعر کا کلام عارفانہ کہا جاسکتا ہے''(84)

حسرت موہانی کی شاعری بھی عارفانہ مضامین سے مزین ہے بقول خود اُن کی کئی ایک غزلیں اور اشعار عارفانہ رنگ لئے ہوئے ہیں۔اور یہ صوفیانہ رنگ مختلف انداز میں مترشح ہوتا ہے۔ان کے کلام سے مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

سب رازِ حق افشا کیا حسرتؔ یہ تو نے کیا کے
ہم کو نہ کیوں سمجھا کیا، ناقدرداں عاشقی

....

مرا ایمان عجب کیا ہے جو ایمان تصوف ہے
تصوف جانِ مذہب عاشقی جانِ تصوف ہے

....

گناہ اپنا نہیں ثابت خطا کے پھر بھی ہیں قائل
ادب کا ہے یہی شیوہ یہی شان ِتصوف ہے

....

ادب ایک دوسرا نام عشق ِ روح پرور کا
جو دام عشق ہے جو زیر خامان ِ تصوف ہے

....

تعلق ''حسن و حق'' میں بھی ہے العشق ہو اللہ کا
یہی تو اصل دیں و رمز پنہاں تصوف ہے

حسرتؔ کے یہاں عشق ومحبت کی جلوہ گری بدرجہء اتم پائی جاتی ہے۔حسرتؔ کے کلام میں داستانِ عشق ومحبت حقیقی و مجازی دونوں طرح کے رنگ میں نمایاں نظر آتی ہیں۔محبت نام ہے کسی کی جانب کھینچے چلے جانے کا یعنی جس طرح مقناطیس کی کشش لوہے کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔اسی طرح کسی میں حسن وخوبی کو دیکھ کر طبیعت کا اس جانب مائل ہوجانا اور دل میں اس کا خیال،تمنا،، بے چینی،طلب وغیرہ کا پیدا ہونا اور اس کی محبت کی سرشاری میں اپنے آپ کو فنا کرنا جو عشق کا اعلی درجہ بھی کہلاتا ہے۔اس درجے پر پہنچ کر بھی عاشق بقا حاصل کرتا ہے عشق ومحبت کی حیثیت عالم گیر ہے اور محبت جب اعلی مراتب کو پہنچتی ہے تو عشق کا درجہ پالیتی ہے۔حسرتؔ کے یہاں عشق ومحبت اور الفت کی گلکاریاں جگہ جگہ محسوس ہوتی ہیں۔حسرتؔ کہتے ہیں:

فنا ہو کے راہ ِ محبت میں حسرتؔ
سزوارِ خلد بقا ہوگئے ہم

....

ہوگیا راہ ِ عشق میں جو شہید

وہ فنا ہوکے بھی فنا نہ ہوا

....

عاشق کو ہوئی فنائے فانی
پیغام حیات جاودانی

....

آہِ دل و عشاق نوا ساز نہیں ہے
اس نغمۂ جاں سوز میں آواز نہیں ہے

....

مذہب عاشقی میں ہے اے عقل
بے خودی انتہائے دانائی

....

روشن جمال یار سے دنیائے عشق ہے
گویا شراب حسن بہ مینائے عشق ہے

....

ارباب ہوش جتنے ہیں بیمارِ عقل ہیں
ان کیلئے ضرور مداوائے عشق ہے

مذکورہ بالا اشعار ایک عاشق کے دل کی آواز ہے جس میں کہیں سوز وساز کی باتیں ہورہی ہیں تو کہیں دل کی بے قراری اور عشاق کے دل کی آہ جو جاں سوز ہے اور عشق کے مقام، کیفیت اور دیگر متصوفانہ مدارج کے بیانات کو بحسن وخوبی حسرت نے اپنے شعری اظہار میں نمایاں کیا ہے۔حسن وعشق کو حسرت نے پردہ، وصل، نغمہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ارضی اور سمائی نور، نور بالا، نور جلوہ اور ترانہ، روح وغیرہ سے تشبیہ دیتے ہوئے حسن وعشق کے مدارج بیان کئے ہیں:

پردۂ حسن و عشق میں ہے وہی
الغرض نورِ ارضی و نور سما

....

پھر نہ کیوں وصلِ حسن و عشق
نور بالائے نور جلوۂ نما

....

نغمہ قلب ہے ستائشِ عشق
صفت حسن ہے ترانۂ روح

کسی بھی کام میں خلوص جب تک شامل نہ ہوگا وہ کام معراج تک نہیں پہنچ سکتا اور اسطرح قبولیت کے امکانات بھی موہوم نظر آتے ہیں۔حسرتؔ نے عبادات و اخلاص کے مقام و مرتبہ کو بھی اجاگر کرنے کے لیے اخلاص کو اولیت دیتے ہیں اور صوفیہ کے یہاں اس کی اہمیت بھی مسلم رہی ہے۔عبادات اور اخلاص کی کیفیات کو کس خوبی سے بیان کیا ہے ملاحظہ ہو:

زہد و تقویٰ ریاضت و ذلت
بن گئے جبکہ دست و پائے خلوص

....

توبہ و علم و حمد و شکر ہیں باب
شہر ہے شہر پر قضائے خلو ص

....

اور حقیقت میں ان سب کے سوا
عشق ہے اصل مدعائے خلوص

تسلیم و رضا کی اہمیت صوفیہ کے یہاں کافی اہمیت کی حامل رہی ہے۔خدائے برتر اور رسول اکرم ﷺ کی ہر بات پر بہ رضا و رغبت راضی ہونا اور حق کے آگے سرخم کرنا اور حق کے لیے فنا ہوجانا ہی گویا تسلیم و رضا ہے۔چنانچہ حسرت نے ان کیفیتوں کو اپنی شاعری میں اس طرح بیان کیا ہے۔شعر ملاحظہ ہوں:

پیرَوِ مسلکِ تسلیم و رضا ہوتے ہیں
ہم تری راہِ محبت میں فنا ہوتے ہیں

....

شکر جفا بھی اہل رضا نے کیا ادا
ان سے یہی نہیں کہ شکایت نہ ہوسکی

....

مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لئے دعا نہ کریں

....

تیری جفا بھی ہے وفا منظور اربابِ صفا
یعنی بفتوائے رضا جائز نہیں شکوا ترا

....

سخت ہے عشق میں مقام رضا
ہم سے بھی طے یہ مرحلہ نہ ہو

''سکر'' اور ''بےخودی'' ایک کیفیت کا نام ہے۔جس میں راہ سلوک پر چلنے والا تجلیاتِ الٰہی میں ایسا گم رہتا ہے کہ اسے کسی چیز کی خبر نہیں رہتی اور اس میں مزید سالک کو اپنے وجود تک کا احساس جاتا رہتا ہے اور سالک ان کیفیات میں محو رہتا ہے۔اور مزید جب اس پر صوفیانہ کیفیت کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ مقام حیرت کی مختلف النوع کیفیات میں ڈوب کر عشق کے مقام و مرتبہ کو جاننے کی سعی جمیل کرتا ہے۔حسرتؔ کہتے ہیں:

اب نہ کچھ عیش کی خواہش ہے نہ غم کی پروا
جذبۂ عشق نے آخر مجھے مجذوب کیا

....

بیخودی میں اب نہیں کچھ امتیاز وصل و ہجر
رات دن پیشِ نظر ہے جلوئے نکوئے دوست

....

اب نہ وہ شوق ہے نہ و حوش و فروش
بیخودی ہائے محبت کا نہ پوچھو حال کچھ

....

بیخبر ہردوجہاں ہوں تیرے سرشاروں میں ہوں
اب عشق کو درکار ہے اک عالم حیرت

....

کافی نہ ہوئی وسعت میدانِ تمنا
کچھ نہیں فلسفۂ عشق میں حیرت کے سوا

....

عالم بیخودی میں ہے مُسکن
مست ہوں ہوشیار حیرت ہوں

....

نگاہِ شوق کو شکوے بہت ہیں
تمہارے جلوۂ حیرت فزا کے

حسرتؔ نے ''وحدت الوجود'' وحدت الشہود'' ذکر سماع ،عظمت انسانی وغیرہ سے بھی حسرت کا کلام معمور نظر آتا ہے۔ان کے یہاں تصوف کے مختلف رنگ نظر آتے ہیں اوران میں ان کا سب سے محبوب ومقبول رنگ عشق ہے جس کے مختلف رنگا رنگ کیفیات کا اظہار ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔غرض حسرتؔ کے فکر اور فن میں صوفیانہ اور عارفانہ مزاج کی غمازی ہوتی ہے۔☆

شوکت علی خاں فانی بدایونی:

پیدائشی نام شوکت علی خان اور فانیؔ تخلص 13 ستمبر 1879 کو قصبہ اسلام نگر بدایون میں شجاعت علی خاں کے گھر تولد ہوئے۔ان کے والد محکمہ پولس میں تھانے دار تھے۔ابتدائی تعلیم اپنے قریبی مکتب سے حاصل کی۔پھر انگریزی اسکول میں داخل کرائے گئے جہاں سے تعلیمی سلسلہ شروع ہوا۔ 1901ء میں انہوں نے بریلی کالج سے بی اے اور 1908ء میں علی

گڑھ سے ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔شاعری کا ذوق ابتدائی عمر ہی سے تھا۔غزل ان کی محبوب تھی چنانچہ تمام عمر علم و ادب میں صرف کی۔ 1939ء میں مولوی عبدالحق کی کوشش سے فانیؔ کا کلام ''عرفانیاتِ فانیؔ'' کے نام سے شائع ہوا۔ 27 اگست 1941ء کو فانی اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ فانی کی حیات مسلسل حوادث کا شکار رہی۔ 1905ء میں والدہ ، 1917ء میں والد اور 1932 میں بیٹی کی بیماری اور انتقال نے انہیں یاسیت زدہ کر دیا۔اس کے علاوہ مالی تنگدستی نے اُن کی زندگی کو یاس والم کے حوالے کر دیا ان سانحات نے فانیؔ کو خاموش طبع، گوشہ نشین اور غمگین بنا دیا۔ غالباً اردو شعر و ادب میں میرؔ کے بعد فانی کو یاسیت زدہ شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ان کا کلام گویا ان کی داستان حیات معلوم ہوتی ہے جس میں غم و یاس، درد ،شکست احساس کی عکاسی کرتی ہے بقول مختار سبزواری:

> '' فانی کا غم ہی ان کی زندگی ہے ایک پرانا مقولہ ہے کہ احساس رکھنے والوں کے لیے زندگی ایک المیہ ہے۔وہ خواب زندگی کو غم سے تعبیر کرتے ہیں اور اس غم کی جستجو سے زندگی کا عرفان حاصل ہوتا ہے اور موت جو عام طور پر پر اسرار چیز ہے گوارا ہو جاتی ہے۔یہ نہ سمجھئے کہ فانی کے غم والم میں زندگی سے گریز ہے وہ زندگی کی بڑی سچی اور بے لاگ تصویر ہے۔ ''
>
> (85)

یاسیت، سنجیدگی ،حقیقتِ غم کے اظہار نے فانی میں صوفیانہ مزاج پیدا کر دیا تھا۔صوفیہ کرام عشق میں جن کیفیات سے گزرتے ہیں ان کیفیات مجازی نے ان کے کلام کو مجاز سے حقیقت کے سفر کی نشاندہی کروائی ہے۔ ہجر و فراق، شوق و ذوق، وغیرہ انسان کو روحانیت کی طرف لے جاتے ہیں۔لہذا فانی نے بھی اسی کے سہارے اپنے کلام میں متصوفانہ افکار و نظریات کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

بتایا راستہ عشقِ مجازی نے حقیقی کا
خدا کی شان رہزن بھی کبھی رہبر نکلتے ہیں

اس شعر کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آ رہی ہے کہ فانی نے بھی مجاز سے حقیقت کی طرف گامزن رہے ہیں۔اُن کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بڑی حد تک حقیقت کے ادراک کی طرف مائل رہے اور کئی ایک متصوفانہ مسائل کو بہ آسانی شعری پیراہن عطا کیا ہے۔ فانی کے صوفیانہ طرز پر جگر مرادآبادی، کہتے ہیں:

''۔حضرتِ فانیؔ کا بھی ایک بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے خاص رنگ میں بڑی سے بڑی حقیقت کو اس سادگی و پرکاری کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ بسا اوقات اہلِ نظر بھی اس سے گذر جاتے ہیں۔جذبات کی مصوری، تخیل کی بلندی، واقعات و واردات کی نزاکتوں کے ساتھ کامیاب طور پر وارداتِ حقیقی کا اظہار کامل طور پر کرتے ہیں۔''(86)

''تصوف کی روایت انہیں پیش رو اور ماحول سے ملی تھی۔ان کی شاعری غم و یاس کی شاعری ہے۔بہر کیف تصوف کے رموز انہیں زندگی کے نشیب و فراز اور غم کے حقیقی راز سے گزرنے پر آشکار ہوئے۔حیات کی ناکامیوں، محرومیوں، طبیعت کی لطافت، اور مذہبی رجحان نے فانیؔ اور ان کے کلام کو متصوفانہ بنایا۔متصوفانہ مسائل کو فانی نے ایک نئے انداز سے پیش کرنے کی سعی کی ہے اپنے معاصرین کی طرح انہوں نے بھی انسان کی حقیقت اور اس کی خودی کو متصوفانہ طرز میں پیش کیا ہے:

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ مست ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

....

نشانِ مہر ہے ہر ذرہ ظرف مہر نہیں
خدا کہاں نہ ملا اور کہیں خدا نہ ملا

....

بشر میں عکسِ موجودات ِ عالم ہم نے دیکھا ہے
وہ دریا ہے یہ قطرہ لیکن اس قطرہ میں دریا ہے

....

پہلوئے زوال ہوں معنی ِ کمال میں
میں ہو حد امتیاز جلوہ ٔ و جمال میں

فانی کے کلام میں متصوفانہ رنگ کے مختلف مسائل ملتے ہیں۔ان کے یہاں کہیں احترام آدمیت ہے تو کہیں احترام ذات بھی۔جبر و اختیار اور انسانی مجبوری اور خدا تعالی کی مختاری کا ذکر بھی ان کی شاعری میں موجود ہے۔اس کے علاوہ فنا،

عرفان، خودی، تسلیم ورضا، بےخودی وغیرہ کو فانی نے شعری پیراہن عطا کیا ہے۔شعر ملاحظہ ہوں:

میں بھی ایک پرتوِ ہستی ہوں مگر کیا کہیے
قطرہ دریا سہی، کس قطرے کو دریا کہیے

....

مرا وجود ہے ،میری نگاہِ خود شناس
وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا تو راز داں ہوتا

....

جلوہ ٔ اختیار سے نسبت ِ جبر ہے مجھے
شعلہ آرمیدہ ہوں وادی ِ برق ِ ناز میں

....

دنیا میں حال آمد ورفت ِ بشر نہ پوچھ
بے اختیار آکے رہا ، بے خبر گیا

....

جسم آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح
خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں

....

ترک ِ خودی ہے ہوش ِ عشق دردِ عشق ہے جو ش ِ عشق
خود نہ شناس و خود شناس جو ہے خدا شناس ہے

....

بیخودی مائیہ عرفان ِخود ی ہے یعنی
محرم جلوہ ٔ اسرار ہے نامحرم ِہوش

....

رازِ دل سے نہیں واقف دلِ ناداں میرا
تیرے عرفاں سے بھی دشوار ہے عرفاں میرا

....

کیفیت "ظہور فنا" کے سوا نہیں
ہستی کی اصطلاح میں دنیا کہیں جسے

....

قطرہ قطرہ ہی رہتا ہے دریا سے جدا رہ سکنے تک
جو تابِ جدائی لا نہ سکے وہ قطرہ فنا ہوجاتا ہے

.... "وحدت الوجود" کا تصور ہر زمانے میں مقدم رہا ہے اور ناقدین کا خیال ہے کہ یہ تصوف میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے یہاں وحدت الوجود کے مختلف جلوے کہیں اثبات حق تو کہیں نفی وجود کے تناظر میں ملتے ہیں اور وحدت در کثرت کا اظہار بھی ان کے یہاں موجود ہے۔ یعنی کثرت میں وحدت کی جلوہ نمائی جسے ہمہ از اوست بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

تعینات کی حد سے گذر رہی ہے نگاہ
بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا

......

اس کی ہستی سے جدا میرا وجود اللہ رے ہے
بلبلہ ہے عین دریا پھر دامن چیدہ ہے

......

مرا وجود ہے میری نگاہِ خود شناس
وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو راز داں ہوتا

......

کچھ نہ نہ وحدت ہے نہ کثرت نہ حقیقت نہ مجاز
یہ ترا عالمِ مستی وہ ترا عالمِ ہوش

......

کثرت میں دیکھتا جا تکرار حسن وحدت
مجبورِ یک نظر آ ممتازِ صد نظر جا

تسلیم ورضا، ایک سالک کے لیے اہمیت کے حامل ہوتا ہے اور اس پر جب دیدار و مشاہدہ کی نعمت سے سرفرازی حاصل ہوتی ہے تو سالک حیرت واستعجاب کی کیفیات سے دو چار ہو جاتا ہے۔ فانی نے موت وحیات کے تضاد سے، حیاتِ اسرار کے نہاں خانوں کو وا کرنے کی سعی کی ہے:

گم ہیں رہِ تسلیم میں طالب بھی طلب بھی
سجدہ ہی دریا رہے سجدہ ہی جبیں ہے

......

اے شوقِ طلب بڑھ کر مجنونِ ادا ہوجا
اے ہمتِ مردانہ راضی برضا ہوجا

......

جوہر آئینہ دل ہے وہ تصویر ہے تو
دل وہ آئینہ کہ تو دیکھ کے حیراں ہوجائے

......

حیرت نے مجھے تیرا آئینہ بنایا ہے
اب تو مجھے دیکھا کر اے جلوۂ جانانہ

......

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

......

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلہ قید حیات
مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

......

ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مرمر کے جئے جانے کا

فانیؔ نے تمنا، طلب، عشق، منزل عشق وغیرہ کو اپنے انداز سے پیش کیا ہے۔غرض فانیؔ کا متصوفانہ کلام انکی شکست و بخت اور غم و ہجر کی آواز ہے۔اسی غم میں گذرنے والے لمحات ان پر معرفت کے در کھول دئے اس طرح فانیؔ، مزاجاً صوفی نہ تھے مگران کا کلام متصوفانہ خیالات سے مزین رہا ہے۔جس کی واضح دلیل مذکورہ بالا اشعار ہیں۔☆

اصغرؔ گونڈوی:

صوفیانہ اور عارفانہ شاعری کے فروغ و استحکام میں اصغر گونڈوی کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔اصغر کا بیسویں صدی کے ابتداء میں ابھرنے والے شاعروں میں شمار ہوتا ہے جن کی صوفیانہ گھن گرج مسلم مانی جاتی ہے۔اصغرؔ کی نہ صرف فن میں صوفیانہ افکار ملتے ہیں بلکہ ان کی شخصیت اور حیات میں بھی صوفی ازم کی نشانیاں مل جاتی ہیں۔اصغر گونڈوی پاک باطن اور نیک سیرت انسان تھے۔آپ کے اخلاق اور کردار کے ضمن میں سلام سندیلوی ۔رشید احمد صدیقی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اصغر گونڈوی سب سے پہلے ایک شریف قابل قدر انسان، ایک بے ریا اور محبت کرنے والے دوست، ایک بلند پایہ مفکر و ادیب اور اس کے بعد خوش فکر شاعر تھے''۔آگے لکھتے ہیں'' وہ بڑے مخلص اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ان کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک اور جذب وکشش تھی جو دوسروں کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔تاہم ان کا رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ ان کے سامنے کسی کو اپنی حد سے تجاوز کرنے کی جرات نہ ہوتی''۔(87)

اصغرؔ گونڈوی کی جائے پیدائش کے سلسلہ میں محققین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔کسی نے ان کی جائے پیدائش کو گونڈہ کہا ہے تو کسی نے گورکھپور۔بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی گورکھپور کے ایک محلہ الہی باغ میں پیدا ہوئے۔ اصل نام اصغر حسین اور قلمی نام اصغر گونڈوی کے نام سے معروف ہوئے۔تاریخ ولادت ۱۸۸۴ء ہے۔ابتدائی تعلیم گونڈہ میں حاصل

کی اور وہ صرف آٹھویں جماعت کے بعد تعلیم ترک کر دی مگر ذوق و جستجو اور لگن سے اُردو، فارسی عربی اور انگریزی میں خاصی صلاحیت پیدا کر لی۔ ابتدائی زندگی میں مئے نوشی اور عشق بازی میں اپنے آپ کو ملوث رکھا بعد میں تائب ہو گئے۔ تقریباً ۱۹۱۳ء میں حضرت قاضی عبدالغنی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ (۱۰۳) مرشد کی صحبت کے اثرات نے اصغرؔ کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ بیعت کے بعد اُن کی تمام زندگی اسلامی طرز پر بسر ہونے لگی، صوم وصلوٰۃ کی پابندی اور وظائف میں مشغول رہنا ان کا معمول رہا۔

شاعری کا آغاز تو بہت پہلے کر چکے تھے ابتداء سے اُن کے اشعار میں بے ارادی طور پر تصوف کا رنگ نمایاں تھا لیکن ترکِ مئے نوشی کے بعد یہ رنگ عروج پر نظر آتا ہے۔ اصغرؔ مشاعروں میں شرکت سے اکثر اجتناب کیا کرتے تھے۔ وہ تنہائی کو بھی پسند کیا کرتے تھے۔ اصغر گونڈوی کا مطالعہ وسیع تھا اصغر کی متاثر کن شخصیت اور ان کے مطالعہ کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

> ''محی الدین ابن العربی کی فصوص الحکم کا انہوں نے مطالعہ کیا۔ انگریزی میں آسکر وائلڈ کا لٹریچر پڑھا، اردو نثر نگاروں میں مہدی افادی، سجاد انصاری، مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر کو پسند کرتے تھے۔ اور اردو شعراء میں وہ غالبؔ، مومنؔ، اقبالؔ، حسرتؔ، اور سہیلؔ کی طرف مائل تھے''۔ (88)

مذکورہ بالا بیان سے اصغر کے صوفیانہ مزاج کی غمازی ہوجاتی ہے۔ اصغرؔ راہ تصوف کی منزلوں کی طرف رواں دواں ہوئے اور صوفیانہ زندگی گزارنے کی سعی کرتے ہوئے تقدس، خلوص، عبادت اور صفائی قلب کی بنا پر انہوں نے شعری وادیٔ تصوف میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔ اصغر 29/ نومبر 1936ء کو انتقال فرما گئے۔ اور حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی کے احاطہ میں سپرد خاک کر دیئے گئے۔

اصغرؔ کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اُن کے یہاں صوفیانہ مضامین کی کثرت ہے اور اُن کے مزاج میں فکر و نظر کی گہرائی و گیرائی کے ساتھ ساتھ حقیقتوں کو وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ چنانچہ پروفیسر فضل الرحمن لکھتے ہیں:

> ''ان کی شاعری میں تفکر کا عنصر زیادہ ہے۔ انہوں نے محبت کے مضامین کے

علاوہ کائنات کی حقیقتوں پر نگاہ ڈالی ہے۔لکھنوطرز کے پس منظر میں ان کے
لہجہ میں ایک تھما ہوا جوش ہے جس میں ایک روحانی لے بھی ملتی ہے۔ان کے
تصوف میں پژمردہ گی وافسردگی کی جگہ رقص ووجد کی کیفیت پائی جاتی ہے
''۔ (89)

اصغرؔ کی شاعری میں تصوف کے عناصر کی وجہ سے بھی ان کا صوفیانہ قد اونچا ہوا ہے۔اس سلسلہ میں ڈاکٹر مسعود حسین لکھتے ہیں:

''اصغرؔ اصل میں فرش کے نہیں عرش کے شاعر ہیں۔اس رفعتِ مکانی کی وجہ
سے مجاز کی عشقیہ واردات بھی ایک بلند وارفع انداز میں پیش کی جاتی
ہے......یہ ارفع سطح محض اصغرؔ کے صوفیانہ مذاق کی بدولت ہے''۔(90)

اصغرؔ نے تصوف کے مختلف نظریات کو اپنی شعری مزاج کا حصہ بنایا۔ان کے یہاں ہمہ اوست کا نظریہ نظر آتا ہے مگر شہودی نظریات بھی ان کی فکر ونظر کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ان کا تعلق سلسلۂ چشتیہ سے رہا ہے۔ چنانچہ ان کے پاس فطری طور پر وحدت الوجود کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔انہوں نے اس کائنات میں صرف خدا کی ذات کا جلوہ دیکھا ہے اور باقی اشیاء کو باطل اور فریب قرار دیا ہے۔وحدت الوجود کے مسئلہ کو مختلف انداز سے اصغرؔ نے اپنے اشعار کے توسط سے پیش کیا ہے۔چند شعر ملاحظہ ہوں:

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے
پردے پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے

....

وہ ہر عیاں میں نہاں ہے وہ ہر نہاں میں عیاں
عجیب طرزِ حجاب و عجیب جلوہ گری

....

جب اصل اس مجاز و حقیقت کی ایک ہے پھر
کیوں پھرا رہے ہیں ادھر سے اُدھر مجھے

....

پردۂ حرماں میں آخر کون ہے اس کے سوا
اے خوشا روئے کہ نزدیکی بھی ہے دوری بھی ہے

....

ہر شئے میں تو ہی تو ہے یہ بعد ہے یہ حرمان ہے
صورت جو نہیں دیکھی یہ قربِ رگِ جاں ہے

....

جو شجرِ باغ میں ہے، وہ شجر طور ہے آج
پتے پتے میں جو دیکھا تو وہی نور ہے آج

....

پھر میں نظر آیا، نہ تماشا نظر آیا
جب تو نظر آیا مجھے، تنہا نظر آیا

.... صوفیہ کے یہاں وحدت الوجود کے علاوہ وحدت الشہود کی جلوہ فرمائی ملتی ہے ''وحدت الشہود'' میں سب کچھ اسی سے ہے کا معاملہ رہتا ہے یعنی یہ کائنات کے ذرے ذرے میں خدا کا وجود نمایاں ہے کا نظریہ بھی ''وحدت الوجود'' کی طرح اہمیت رکھتا ہے۔ وحدت الشہود سے منسلک اشعار ملاحظہ فرمایئے جس میں اصغر انفرادی شان کے مالک نظر آتے ہیں:

تو بہت سمجھا تو کہہ گزرا فریب رنگ و بو
یہ چمن لیکن اُسی کی جلوہ گاہِ ناز ہے

....

خیرہ کئے ہے چشم حقیقت شناس بھی
ہر ذرہ ایک مہرِ منور لئے ہوئے

....

کس طرح حسن دوست ہے بے پردہ آشکار
صدہا حجاب صورت و معنی لئے ہوئے

اصغرؔ کے یہاں تصوف کے ان دونظریات کے علاوہ ان کی شاعری میں عظمتِ انسانی، حقیقت انسانی، حسن وعشق ،خودی و بےخودی، وصل وہجر، قرب ورضا، مجاز وحقیقت اور فنا و بقا کے علاوہ ایسے بےشمار صوفیانہ اصطلاحات سے اپنی شعری کہکشاہ سجاتے ہوئے بیسویں صدی کے شعری منظرنامے میں صوفی شاعر کی حیثیت سے نمایاں نظر آتے ہیں اور ان کا طرزِ بھی انفرادیت کا حامل نظر آتا ہے :

ترا جمال ہے تیرا خیال ہے تو ہے
مجھے یہ فرصتِ کاوش کہا کہ کیا ہوں میں

....

حسن بن کر خود کو عالم آشکار کیجئے
پھر مجھے پردہ بناکر مجھ سے پردہ کیجئے

....

ہے عشق کہ محشر میں یوں مست خراماں ہے
دوزخ بہ گریباں ہے، فردوس بداماں ہے

....

بیٹھا ہے ایک خاک نشیں محوِ بے خودی
کچھ حُسن سے غرض ہے نہ پروائے عشق ہے

....

اب مجھے خود بھی نہیں ہوتا ہے کوئی امتیاز
مٹ گیا ہوں اس طرح اس نقشِ پا کے سامنے

....

نہ کچھ فنا کی خبر ہے، نہ ہے بقا معلوم

بس ایک بے خبری ہے، سو وہ بھی کیا معلوم

....

کیا دردِ ہجر اور یہ کیا لذت وصال
اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے

....

خستگی نے کردیا اس کو رگِ جاں سے قریب
جستجو کہے جاتی تھی منزل دور ہے

....

وہ بارگاہِ حسنِ ادب کا مقام ہے
جز درد و اشتیاق تقاضہ نہ چاہئے

....

موت کو ڈھونڈتا ہوں میں موت کا کچھ پتہ نہیں
تو سیرِ حیات تو ہی پس حیات ہے

....

مجاز کا بھی حقیقت سے ساز رہنے دے
یہ راز ہے تو اسے حسن ِ راق رہنے دے

اصغر گونڈوی کے اشعار میں تقریباً صوفیانہ مضامین پائے جاتے ہیں۔ اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ فکری اعتبار سے وہ تصوف اور علم عرفان سے کتنی قربت رکھتے ہیں۔غرض ان کے اشعار کے حوالے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان کا رنگ سخن صوفیانہ ہے اور اس طرح متنوع صوفیانہ موضوعات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ صوفیانہ شاعری کے عاشق صادق ہیں۔ اصغر نہ صرف فکری بلکہ اور فنی لحاظ سے بھی ایک اہم کلاسیکی شاعر ہیں جنہوں نے اپنی فکر و نظر اور فن کے ذریعے ایک نسل کو متاثر کیا ہے۔☆

جگر مرادآبادی:

جگرؔ مرادآبادی اپنے دور کے بے حد مقبول شاعر رہے جنہوں نے اردو غزل کو بلندی عطا کی۔جگر کا پیدائشی نام علی سکندر ہے۔علی سکندر المتخلص جگرؔ مولانا محمد صدیق کے گھر اپریل (1890ء) مرادآباد میں تولد ہوئے۔ایک اور روایت کے مطابق سنہ ولادت (1895ء) اور مقام بنارس بتایا جاتا ہے۔جگر کے والد ایک راسخ العقیدہ سنی تھے اور مذہبًا حنفی اور قادری سلسلہ سے ان کا تعلق بھی رہا چنانچہ آخری عمر تک جگر کا بھی عقیدہ وہی رہا جو ان کے والد کا تھا۔جگر کو وراثت میں شعری ذوق ملا ہے ان کے دادا پردادا بھی شاعر تھے۔جگرؔ نے ابتداء میں داغؔ سے مشورۂ سخن کیا۔اس کے علاوہ تسلیم لکھنوی سے بھی شعری فیض حاصل کیا۔لہذا ان اساتذہ سخن کی تربیت ہی تھی کہ ان کی شہرت ملک گیر رہی ہے اور مشاعروں کے وہ محبوب ومقبول شاعر رہے۔بلا کے مے نوش تھے مگر اصغر کی صحبت نے انہیں اس کوچے سے نکال کر متصوفانہ فکر کا حامل بنا دیا۔چنانچہ ان کا میلان مجاز سے حقیقت کی طرف ہو گیا۔ان کے مزاج میں بنیادی طور پر خوش خلقی، منکسر المزاجی، ملنساری اور وضعداری موجود تھی اس کے علاوہ خلوص ومروت، اخلاقیات کے لحاظ سے بھی وہ متصوف کے درجے پر تھے۔ان کے مزاج کے ضمن میں سلیمان ندوی کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''جگر مست ازل ہے اس کا دل سرشار الست ہے وہ محبت کا متوالا ہے، وہ عشق حقیقی کا جویا وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بت خانہ کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ کو اور صنم خانہ کے بادۂ کیف سے خود فراموش ہو کر بزم ساقئ کوثر تک پہنچنا چاہتا ہے'' (91)

جگرؔ مرادآبادی نے حضرت اصغرؔ کی صحبت بافیض کا تذکرہ اپنے اشعار کے ذریعے بھی کیا ہے۔اصغرؔ کے ساتھ ان کا روحانی رشتہ کے علاوہ حقیقی رشتہ بھی ہو گیا تھا، وہ ان کے ہم زلف بھی بنے۔اس کے بعد ہی وہ روحانی سفر کی طرف رواں دواں ہوئے اور آخری سانس تک اپنی شاعری اور شخصیت سے لوگوں کو فیض یاب کیا۔درج ذیل اشعار سے اصغر کے ساتھ ان کی محبت اور فیض یابی کی نشاندہی ہو جاتی ہے:

یوں تو ہونے کو جگرؔ اور بھی ہیں اہل کمال
خاص ہے حضرت اصغرؔ سے ارادت مجکو

....

نگاہ حضرت اصغر کی ہر ودیعت خاص

قرار بن کے جگر کے دل حزیں میں رہی

....

کیوں کر بہار شعر سے ٹپکے نہ اے جگرؔ
رنگِ کلامِ حضرت اصغرؔ نظر میں ہے

ان کے پیر طریقت (شاہ عبدالغنی منگلوری) اور حضرت اصغرؔ کی رفاقت اور صحبت صالح کے ضمن میں مہتاب انصاری لکھتے ہیں:

''ان کی روحانی اور معنوی بلندی میں حضرت اصغر گونڈوی کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ انہوں نے جگرؔ کو اپنے پیر حضرت شاہ عبدالغنی منگلوری سے بیعت کرایا تھا۔ اصغرؔ گونڈوی کی صحبت اور شاہ عبدالغنی منگلوری کی خدمت میں حاضری سے ان کی زندگی میں ایسا انقلاب آیا جس کے اثرات آخری تک قائم رہے۔ اصغرؔ گونڈوی کے فیض صحبت سے صوفیانہ خیالات ونظریات میں دلکشی و گیرائی و گہرائی آئی''(92)

جگرؔ کی شخصیت کو تصوف سے قریب کرنے میں اصغر کے علاوہ ان کے ابتدائی دنوں کی تربیت کا بھی حصہ رہا ہے یعنی یہ عنصر انہیں ورثہ میں ملا ہے چونکہ ان کے والد بھی اسی کوچے کے امین تھے۔ جگرؔ کی غزلیہ شاعری، اس بات کا اعلان نامہ تھی کہ ان کے یہاں صوفیانہ تغزل بدرجہ اتم موجود تھا اور تصوف کے مضامین کثرت سے ان کی غزلوں میں پائے جاتے ہیں۔ بعض ناقدین نے یہاں تک لکھا ہے کہ ان کے یہاں میر درؔد کی روایت ملتی ہے اور ان کی شاعری اور اس کے موضوعات میں ان سے قریب بھی معلوم ہوتے ہیں:

سمجھا گیا ہے اک جلوہ ٴ بیتاب کسی کا
جو راز کہ محجوب تھا فہم بشری کا

....

کوئی نہ یہاں عدم ، نہ ہستی
اول آخر جو کچھ ہے تو ہے

....

میں ترا عکس ہوں کہ تو میرا
اس سوال و جواب نے مارا

جگر کو حسن و عشق کا شاعر کہا جاتا ہے جنہوں نے اپنے بیشتر اشعار میں حسن و عشق کی جلوہ سامانیوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ موضوع ان کا محبوب و مرغوب موضوع ہے۔ کائنات کے ذرہ ذرہ میں اسی کی جلوہ گری ہے۔ لہذا اس جلوہ گری کے نمونے ان کی غزلیہ شاعری میں حسن و عشق کا پرستاری نظر آتی ہے۔ وہ نہ صرف کائناتی جلووں کو حسن اور زندگی کو عشق سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے یہاں حسن و عشق کا تصور محدود نہیں بلکہ وسعت اختیار کئے ہوئے ہے۔ درج ذیل اشعار اس بات کی دلالت کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں:

عشق کو بے نقاب ہونا تھا
آپ اپنا جواب ہونا تھا

....

وہ بھی اک مقام عشق ہے جہاں
ہر تمنا ، گناہ معلوم ہوتی ہے

....

کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

....

عشق کیا ہے پر تو حسن تمام
شوق کیا ہے حسن کا عکس شباب

عشق اور اس کے متعلقات جگر کے کلام کی اساس کہی جاتی ہے، ان کا یہی تصور جب معراج پر پہنچتا ہے تو مجاز سے جست لگاتے ہوئے حقیقت تک رسائی حاصل کرتا ہے اور قاری ان کے منفرد صوفیانہ تغزل میں محو ہو جاتا ہے :

صوفی نے جس کو شاہد مطلق سمجھ لیا

اک پرتو لطیف تھا حسن ِ مجاز کا

....

محبت اصل حقیقت ، محبت اصل مجاز
وہ کم نظر تھے، جو یگانہ ٔ مجاز رہے

....

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

....

عشق کا راز وہی سوختہ ساماں سمجھا
جس نے دامن کبھی سمجھا نہ گریباں سمجھا

....

مل گئی عشق میں ایذا طلبی سے راحت
غم ہے اب جاں میری، درد ہے اب دل میرا

جگرؔ نے تصوف کے مختلف نظریات کو اپنی شاعری کے حوالے سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ انہوں عرفان، معرفت، حقیقت وغیرہ کے علاوہ عظمت انسانی اور آدمیت کے تصورات کو کہیں ہمہ اوست تو کہیں ہمہ از اوست کے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری میں مختلف النوع صوفیانہ کیفیات بھی ملتے ہیں۔ بیسویں صدی کے شعری منظر نامے میں ایک اہم صوفی شاعر کہلائے جاسکتے ہیں درج ذیل کلام جگرؔ کی صوفیانہ فکر ونظر اور فن کی افہام وتفہیم میں معاون نظر آتے ہیں :

کبھی کبھی تو اسی ایک مشت ِ خاک کے گرد
طواف کرتے ہوئے ہفت آسمان گذرے

....

گھٹے اگر تو بس اک مشت ِ خاک ہے انسان

بڑھے تو وسعت کونین میں سما نہ سکے

....

اس انسان میں سب کچھ ہے پنہاں
مگر یہ معرفت دشوار بھی ہے

....

وہ حقیقت ہے خود میری ہستی
جس حقیقت کا پردہ دار ہوں میں

یہ محفل ہستی بھی کیا محفل ہستی ہے
جب کوئی اُٹھا پردہ میں خود ہی نظر آیا

اللہ رے کمال ِ خودی کی یہ وسعتیں
میرا ہی سامنا ہے جدھر دیکھتا ہوں مے ں

وہ ہمارے قریب ہوتے ہیں
جب ہمارا پتہ نہیں ہوتا

مجھی میں رہے ، مجھ سے مستور ہوکر
بہت پاس نکلے بہت دور ہوکر

کثرت میں بھی وحدت کا تماشا نظر آیا
جس رنگ میں دیکھا تجھے یکتا نظر آیا

دور ہے منزلِ عرفانِ خودی اور یہاں
بیخودی کا ہے عالم کہ خُدا یاد نہیں

غرض جگرؔ کی شاعری میں عشق کا سوز وساز، روحانی وعرفانی چمک، حقائق ومعارف کی دمک، اور تصوف کی ضوفشانی پوری آب وتاب کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

حوالے باب:

1 اردو غزل، مرتبہ: ڈاکٹر کامل قریشی، ص75
2 اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیہ کرام کا کام، مولوی عبدالحق، ص10
3 ایضاً، ایضاً، ص13
4 ایضاً، ایضاً، ص21
5 ایضاً، ایضاً، ص23
6 ایضاً، ایضاً، ص24
7 ایضاً، ایضاً، ص27
8 تاریخ ادب اردو، پروفیسر نورالحسن نقوی، ص21
9 ایضاً، ایضاً، ص21
10 کلاسیکی اردو شاعری کی تنقید، طارق سعید، ص43
11 تاریخ ادب اردو، پروفیسر نورالحسن نقوی، ص21
12 تاریخ ادب اردو (جلد اول)، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص623
13 ایضاً، ایضاً، ص627
14 ایضاً، ایضاً، ص628
15 ایضاً، ایضاً، ص629
16 ایضاً، ایضاً، ص638

17 کلاسیکی اردو شاعری کی تنقید، طارق سعید، ص43

18 تاریخ ادب اردو (جلد اول)، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص642

19 اردو شاعری اور تصوف (تاریخی و تنقیدی جائزہ)، ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی، ص669

20 انتخاب کلام آبرو، پروفیسر محمد اکرام ص13

21 ڈاکٹر سید اعجاز حسین، مختصر تاریخ ادب اردو، ص47

22 پروفیسر عبدالحق انتخاب کلام حاتم 17

23 تاریخ ادب اردو (جلد دوم)، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص648

24 ایضاً، ایضاً ، ص659

25 ایضاً، ایضاً ، ص659

26 ایضاً، ایضاً ، ص668

27 مرزا محمد رفیع سودا، قاضی افضال حسین، ص99

28 خواجہ میر درد اور اُن کا ذکر و فکر ، قدیر احمد، ص 32

29 ایضاً ایضاً ص 80

30 خواجہ میر دردؔ، قاضی جمال حسین، ص25

31 ایضاً ایضاً ص 24

32 خواجہ میر دردؔ اور اُن کا ذکر و فکر ، قدیر احمد، ص**206**

33 خواجہ میر دردؔ (تنقیدی و تحقیقی مطالعہ)، ثاقب صدیقی، انیس صدیقی، ص232

34 خواجہ میر دردؔ اور اُن کا ذکر و فکر ، قدیر احمد، ص**101**

35 لکھنو کی دبستانِ شاعری (جلد اول)، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ص176

36 تاریخ ادب اردو (جلد اول) , ڈاکٹر جمیل جالبی، ص212

37 میر تقی میرؔ، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص112

38 تاریخ ادب اُردو (جلد اول)، جمیل جالبی ص,579

39 آب حیات، محمد حسین آزاد، ص253
40 لکھنو کا شعر و ادب، سید عبدالباری، ص 232
41 دیوانِ مصحفی، اسیر لکھنوی و امیر مینائی، ص58
42 اردو غزل، ڈاکٹر کامل قریشی، ص120
43 آب حیات، محمد حسین آزاد، 281
44 اعجازِ ناسخ، ڈاکٹر احسن نشاط، ص27
45 انتخاب ناسخ، رشید حسن خاں، ص44
46 ایضاً ایضاً ص45
47 بہادر شاہ ظفر، اسلم پرویز، ص39
48 اردو غزل، ڈاکٹر کامل قریشی، ص179
49 بہادر شاہ ظفر، اسلم پرویز، ص285
50 آب حیات، محمد حسین آزاد، 316
51 مقدمہ کلامِ آتش، خلیل الرحمن اعظمی، ص123
52 ایضاً ایضاً ص16
53 ذوق دہلوی، تنویر احمد علوی، ص11
54 تاریخِ ادب اردو۔عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک (حصہ دوم)، سیدہ جعفر، ص 101
55 آبِ حیات، محمد حسین آزاد، ص 409
56 افکارِ غالب، خلیفہ عبدالحکیم، ص 24
57 شرح دیوان غالب، پروفیسر یوسف سلیم چشتی ص 157
58 رسالہ نگار نومبر 1956، مدیر نیاز فتح پوری ص 66
59 غالب اور تصوف، سید محمد مصطفی صابری ص 6
60 شرح دیوان غالب، پروفیسر یوسف سلیم چشتی ص162

61 اردو شاعری پر تصوف کے اثرات (ولی سے اقبال تک)، افضل الدین جنیدی، ص192

62 ایضاً ایضاً ص256

63 ایضاً ایضاً ص256

64 ایضاً ایضاً ص256

65 مطالعہ امیر ، ابو محمد سحر ص 115

66 اردو شاعری پر تصوف کے اثرات (ولی سے اقبال تک)، افضل الدین جنیدی، ص257

67 اُردو غزل, ڈاکٹر کامل قریشی ص 219

68 مطالعہ داغ ڈاکٹر سید محمد علی زیدی ص75

69 اردو شاعری پر تصوف کے اثرات (ولی سے اقبال تک)، افضل الدین جنیدی، ص261

70 مطالعہ داغ ڈاکٹر سید محمد علی زیدی ص 75

71 اردو شاعری پر تصوف کے اثرات (ولی سے اقبال تک)، افضل الدین جنیدی، ص261

72 ایضاً ایضاً ص262

73 مطالعہ داغ ڈاکٹر سید محمد علی زیدی ص 208

74 کلیاتِ اکبر سید اکبر حسین اکبر آبادی ص 19

75 اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ ڈاکٹر صغرا مہدی ص 181

76 سوانح اعلیٰ حضرت بدرالدین احمد قادری ص358

77 ماہنامہ المیزان (امام احمد رضا نمبر) سید محمد جیلانی محامدؔ ص478

78 اردو شاعری پر تصوف کے اثرات (ولی سے اقبال تک)، افضل الدین جنیدی، ص288

79 سیرت اقبال مولوی محمد ظاہر فاروقی ص139

80 تصوراتِ اقبال مولانا صلاح الدین احمد ص11

81 مضامین اقبال تصدق حسین تاج ص167

82 فکر اقبال ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ص 289

83 ایضاً ایضاً ص9

84 کلیاتِ حسرت موہانی مولانا حسرت موہانی ص 74

85 فانی بدایونی ،ساحل احمد ص (167 (اردو رائیٹرس گلڈ الہ آباد ۱۹۹۷ (دوم)

86 باقیاتِ فانی فانی بدایونی ص 63

87 تصوف اور اصغر گونڈوی ڈاکٹر سلام سندیلوی ص 418

88 ایضا! ایضاً ص 396

89 اُردو انسائیکلو پیڈیا (جلد اول) پروفیسر فضل الرحمن ص 68

90 اُردو زبان وادب ڈاکٹر مسعود حسین ص 120

91 جگر مرادآبادی نمبر , ڈاکٹر عزیز الرحمن 97

92 جگر مرادآبادی کی غزل گوئی,ڈاکٹر مہتاب انصاری 53

☆☆☆

باب پنجم

جنوبی ہند کے اہم صوفی شعراء

شمالی ہند کی طرح جنوبی ہندوستان میں اردو شاعری کے ابتدائی نقوش صوفیہ کرام کے یہاں دیکھے جا سکتے ہیں۔جنوبی ہندوستان میں تغلق دور حکومت سے ہی زبان و ادب کے پھیلنے اور پھولنے کے امکانات روشن ہوئے۔بہمنی سلطنت کے قیام اور استحکام کے بعد یہاں باضابطہ طور پر شعر و ادب کا چراغ روشن ہوا۔جیسا کہ رقم کیا جا چکا ہے کہ حضرت خواجہ گیسو دراز بندہ نواز کی دکن میں آمد اور گلبرگہ میں قیام کے بعد شعری چراغ روشن ہوا۔دکن کے اندر بہمنی دور میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے علاوہ اکبر حسینی، شیخ آذری، نظامی بیدری، ملا داؤدی، مشتاق، لطفی، محمود، فیروز اور اشرف وغیرہ اہمیت کے حامل رہے ہیں ۔جنھوں نے اردو شاعری کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد میں گولکنڈہ اور بیجاپور دکن کے بڑے ادبی مرکز بن گئے۔اس دور میں پورے دکن میں دکنی شاعری کا بول بالا رہا۔بیجاپور میں برہان الدین جانم،، مقیمی، ملک خوشنود، امین، رستمی، حسن شوقی،، داول، امین الدین علی اعلی، ہاشمی بیجاپوری اور نصرتی قابل ذکر ہیں۔اسی طرح مملکتِ گولکنڈہ کے اہم شعراء میں قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، ملا وجہی، غواصی، ابن نشاطی، میراں جی خدانما اور میراں یعقوب اہمیت رکھتے ہیں۔سقوط دکن کے بعد جسے دکنی شاعری کا آخری دور کہتے ہیں اس دور میں ولی دکنی، داؤد اورنگ آبادی، فراقی، قاضی محمود بحری، سیوا، مولانا باقر آگاہ ویلوری، شاہ کمال اور ولی ویلوری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

دکنی دور کے ادب مطالعہ اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ وہ تمام تر تحریریں چاہے وہ نظم میں ہو، یا نثر ان کی نوعیت مذہبی و صوفیانہ رہی ہے۔چار سو سال کے دکنی سلاطین کے دور میں بے شمار رسالے لکھے گئے جو زیادہ تر تصوف پر مبنی تھے۔گویا زبان کی ابتداء خیال و بیان کے لحاظ سے تصوف ہی کی سرپرستی میں ہوئی۔چنانچہ تاریخ ادب اردو میں جمیل جالبی فرماتے ہیں۔

''اگر ہم اس دور کے ادب کا جسے ہم نے آسانی کے لئے بہمنی دور کے نام

سے موسوم کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی جائزہ لیں تو یہاں ہمیں تین قسم کے موضوعات نظر آتے ہیں۔ ایک مقبول موضوع تو یہ ہے کہ کسی دلچسپ عجیب اور معروف قصے کو نظم کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے اور اس کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ پڑھنے یا سننے والے کو نصیحت حاصل ہو۔ قصے کا انجام ہمیشہ طربیہ ہوتا ہے۔ دوسرا موضوع یہ ہے کہ کسی مشہور مذہبی یا تاریخی واقعے کو داستانی دلچسپی کے ساتھ نظم کر دیا جاتا ہے۔ یہاں چونکہ مذہبی جذبات کو آسودہ کرنے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اس لئے ان روایات کو بھی شامل کرلیا جاتا ہے جو غیر مستند ہونے کے باوجود عوام میں رائج ہیں۔ مذہبی یا تاریخی نوعیت کے قصوں میں بھی زیادہ زور عجیب وغریب اور محیر العقول واقعات پر دیا جاتا ہے تیسرا مقبول موضوع تصوف واخلاق ہے جو قدیم دور میں سب سے اہم اور سنجیدہ موضوع رہا ہے‘‘۔(1)

دکنی زبان کی ترقی کا زمانہ ۱۴ویں صدی سے ۱۷ویں صدی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس زمانے کی شاعری میں گیت کی خصوصیات پائی جاتی ہیں جس میں معشوق کی عشوہ طرازی اور عاشق کی بے تکلفی بھی شامل ہوگئی ہے۔، جس سے ہندوی مزاج کی روایت اور اس کی اثریت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ عشق کا اظہار ہندی روایت کے مطابق عورت کی زبان میں کیا گیا ہے جس میں وہ تمام خصوصیات سامنے آتی ہیں جس سے ہندوستانی عورت کی مکمل تصویر نمایاں ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ دکنی شاعروں کے یہاں مضامین کا تنوع اور جذبات واحساسات کی رنگارنگی ملتی ہے۔ دکنی شعراء نے اپنی شاعری کے ذریعہ دکنی معاشرت رہن سہن طور طریق لباس زیوارت اور دکنی تہذیب وتمدن کے علاوہ عارفانہ اور صوفیانہ مسائل کی بہت ساری خصوصیات پیش کی ہیں۔ ان شعراء نے مختلف اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے جس میں غزل، مرثیہ، قصیدہ، اور مثنوی شامل ہیں۔ دکن میں دوسرے اصناف کے مقابلے میں مثنوی زیادہ لکھی گئی ہیں۔ دکن کی مثنویوں میں اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک بڑا وسیع میدان ملتا ہے۔ ان موضوعات میں مذہبی ،فلسفیانہ، عاشقانہ، بیانیہ، رزمیہ، اور بزمیہ خاص اہمیت کے حامل ہیں جن میں کچھ تراجم اور کچھ طبع زاد ہیں۔ دکن کے غزل گوشعراء میں قلی قطب شاہ، ملا وجہی، غواصی ،نصرتی ،شوقی وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔ دکن

کی غزلوں میں محبوب کا جو تصور ملتا ہے وہ ایرانی کم ہندوستانی زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کی غزلوں میں اخلاقی عناصر کی بھی کارفرمائی اور روحانیت اور اخلاقیات کی تعلیم بھی نظر آتی ہے۔

اس لحاظ سے جب ہم دکنی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو ان ادوار میں دکنی ادب اور دکنی شاعروں نے ایسے نمونے پیش کئے ہیں جن کی بنیاد پر آگے چل کر خود شمال والوں نے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ ماہر دکنیات عبدلقادر سروری دکنی عہد کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

> ''دکنی ادب کی ترقی کا زمانہ ۱۶ویں صدی اور ۱۷ویں صدی کا زمانہ ہے۔ ۱۷ویں صدی کا اختتام دکن کی علم دوست سلطنتوں بیجاپور اور گولکنڈہ کا بھی اختتام ہے۔ ۱۷ویں صدی کے اواخر میں یہ سلطنتیں دہلی کا جزو بن گئیں، مغل حکمران فارسی کی روایت میں پلے تھے اس لئے ہندی ریختہ دکنی یا اردو ان کے پاس ادبی اغراض کیلئے قابل اعتنا نہیں تھی۔ اس لئے ان کے زمانے میں دکنی ادب کی ترقی رک گئی۔ اور شاعر اور انشا پرداز شمال اور جنوب کے مختلف حصوں میں منتشر ہو گئے اور اپنے ساتھ اپنے ادبی ذوق کو بھی لیتے گئے۔ اس سے دکنی ادب کی سرحدیں وسیع ہو گئیں۔ اورنگ زیب کے بعد دکن میں کچھ عرصہ تک نراجیت سی رہی لیکن نظام الملک میر قمر الدین خان کے دکن پر تسلط کے بعد اس علاقے کو تہذیبی اور ادبی اعتبار ملا۔ پھر مرکزیت حاصل ہونے لگی۔ دور وسط کی آخری بساط اورنگ آباد میں بچھی جہاں دکن اس کے اطراف و اکناف اور شمالی ہند کے بہت سے اچھے اچھے شاعر اکھٹے ہو گئے تھے۔ لیکن اس نئے ماحول میں ادبی روایات نے بھی نیا موڑ پایا اور لسانی صورت حال تبدیل ہوگئی۔ چنانچہ اورنگ آباد کا ادب شمال اور جنوب کی بہترین روایات کا سنگم بن گیا، اس زمانے میں ولی اور سراج جیسے عظیم شاعر ابھرے''۔(2)

۱۶ ویں تا ۱۹ ویں صدی پر ایک نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ دہلی اور دکن کی زبان فارسی تھی۔ لیکن گھروں اور بازاروں میں جو زبان بولی جاتی تھی، دکنی تھی۔ غرض یہ کہ زبان بول چال کی تھی اور اس میں ادب بھی تخلیق ہورہا تھا۔ دکنی زبان کے ساتھ شمالی ہند کے مورخوں نے بے اعتنائی برتی، اس کا کھلا ثبوت قلی قطب شاہ جیسا شاعر بھی ان کی نظروں سے چھپا رہا۔ دکنی زبان گویا، ہمارے ماضی کا گراں مایہ ورثہ رہا ہے۔ آج دکنی حیدرآباد کے اطراف واکناف کے دیہاتوں، تلنگانہ اور رائل سیما کے علاوہ جنوبی کرناٹک کے اضلاع، گلبرگہ، رائچور، بیدر، اور بیجاپور کے دیہاتوں اور قصبوں میں بولی تو جاتی ہے مگر آج اس میں ادب بہت کم تخلیق ہورہا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر طیب انصاری اپنے ایک مضمون ''دکنی زبان، قلی سے ولی تک'' میں لکھتے ہیں۔

> ''ولیؔ نے دکنی زبان سے انحراف کیا وہ اردو شاعری کا باوا آدم تو بن گیا لیکن دکنی زبان کو اس سے شدید دھکا لگا۔ داؤدؔ اور سراجؔ نے زبان دکنی چھوڑی، ولی دہلوی نے اردو اختیار کیا۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ دکنی زبان معتوب ٹہری، دکنی زبان آج بھی اہل دکن کے لئے عزیز ہے، آج بھی دکنی شاعری اہل دکن کے دلوں کی دھڑکن ہے۔ دکنی زبان آج بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ بڑی سخت جاں ہے''۔(3)

اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہوا۔ آخر کار صوبعدار دکن نواب نظام الملک آصف جاہ اول نے 1724 میں خودمختاری کا اعلان کردیا۔ اور سلطنت آصفیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس طرح دکن میں آصفیہ حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ آصف جاہ ثانی نے 1770ء میں پایہ تخت اورنگ آباد کے بجائے حیدرآباد کو بنایا۔ اس کے بعد دکن میں دکنی شاعری کا زوال ہوا اور اس کی جگہ آہستہ آہستہ اردو زبان رائج ہوئی۔ سقوط بیجاپور سے لے کر ۱۹ ویں صدی کے نصف تک فارسی کے چلن کے سبب دکنی زبان کی اہمیت ختم ہوگئی۔ 1883ء میں سلطنت آصفیہ نے اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت دی تو دکن کے تمام اضلاع میں بھی اردو تعلیم کی تحریک چل پڑی۔ ان صوبوں میں اعلی عہدہ داروں کی آمد رہی جنہوں نے زبان وادب کی خدمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

آصف جاہی بادشاہوں نے اپنی مردم شناسی، تدبر اور فہم وفراست سے سیاسی مسائل کو حل کرتے ہوئے ملک میں امن وسکون قائم کیا۔ معاشی حالت کو سدھارا، زراعت، تجارت، صنعت وحرفت کے ساتھ ساتھ تعلیمی حالت کو بہتر بنا کر قدردانی

اور علمی سر پرستی کا ماحول پیدا کر دیا۔ اور چونکہ آصف جاہ ثانی کے دورِ حکومت میں حیدرآباد پایہ تخت بن گیا تھا۔ ہندوستان کے کونے کونے سے اہل کمال، علماء، اور شعراء آصف جاہی سر پرستی حاصل کرنے کیلئے حیدرآباد کا رخ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ عراق، خراسان، اور عرب کے مشائخ بھی ادھر کا رخ کیا کرتے۔ اور مولانا آزاد بلگرامی بھی انہی کے دور میں حیدرآباد آئے۔

شمالی ہندوستان سے نامور شعراء اور قابل قدر مشاہیر حیدرآباد کو اپنا مسکن بنایا۔ شمالی ہندوستان اور مختلف علاقوں سے آنے والی قابل شخصیتوں کے علم وفضل کا اثر دکن پر پڑنے لگا۔ دکنی زبان پر ولی کی اردو نے اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیا۔ اور حیدرآبادی شعراء نے رفتہ رفتہ اپنی قدیم دکنی زبان کو ترک کرتے ہوئے شمالی ہند کے شعراء کی پیروی کرنی شروع کر دی۔ اس طرح دکنی زبان میں لسانی تبدیلیاں پیدا ہونی شروع ہوئیں۔ سلطنت آصفیہ کا یہ دور اردو زبان وادب کیلئے ایک نیا دور بن گیا۔ آصف جاہی حکمرانوں کو زبان کی تہذیبی وسماجی اہمیت کا شدید احساس تھا۔ اسی لئے ان علم دوست اور علم پرور بادشاہوں نے تعلیمی اور اصلاحی تحریکوں کو آگے بڑھانے میں اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیں۔ مغلیہ حکمرانوں کے بعد آصف جاہی سلاطین نے علمی وادبی سر پرستی میں بڑی فراغ دلی اور فیاضی کا ثبوت دیا۔

میر محبوب علی خاں آصف جاہِ سادس آصفؔ تخلص فرماتے تھے۔ اور حضرت داغؔ جیسے بلند پایہ شاعر کی شاگردی کا شرف بھی انہیں حاصل تھا۔ میر محبوب علی خان نے اپنے آباواجداد کی طرح ارباب علم وفن کی سر پرستی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ داغؔ، جلیلؔ، اور امیر مینائیؔ جیسے باکمال شعراء آپ کے دربار سے وابستہ تھے۔ شمالی ہند کے نامور تخلیق کار طباطبائی، عبدالحلیم شررؔ، پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، شبلی نعمانی اور مولانا نذیر احمد نے آپ کی قدردانی کے زیر سایہ نظم ونثر میں تاریخ ساز کارنامے انجام دیئے۔ میر محبوب علی خان نے دکن کے علمی اداروں کی سر پرستی فرمائی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے اداروں اور انجمنوں کی سر پرستی قبول کرتے ہوئے انہیں مالی اعانت سے سرفراز فرمایا۔ آپ کے زمانے میں فارسی کے بجائے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ میر محبوب علی خان کے صاحبزادے نواب میر عثمان علی خان 1911 سلطنت پر متمکن ہوئے۔ یہ آصف جاہی دور کے آخری بادشاہ تھے۔ آصف جاہ سابع کہلائے۔ آپکے اس درخشاں دور میں حضور نظام اور اعلیٰ حضرت کے نام سے عوام میں مقبول ہوئے۔ 1948ء میں پولیس ایکشن کے بعد آپ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ آپ راج پر مکھ بھی بنائے گئے۔ سلاطین آصفیہ کے دس حکمرانوں نے دوسو (200) سال سے زائد حکومت کی۔ آصف جاہ اوّل کے حدود سلطنت میں تلنگانہ کے علاوہ کرناٹک، مہاراشٹرا اور تامل ناڈو کے کچھ علاقے بھی شامل تھے۔ ان کے بعد حدودِ آصفیہ میں کمی ہوتی گئی۔ آخر میں تلنگانہ کے نو اضلاع، مہاراشٹرا کے پانچ اضلاع، اور کرناٹک کے تین اضلاع پر مشتمل

آصف جاہی حکومت رہی۔ انتظام حکومت کے ساتھ ساتھ آصف جاہی اوّل نے اردو کی ترقی کیلئے خصوصی توجہ دی۔ آپ کی سرپرستی نے آصف جاہی دور کو علماء وفضلاء کا مرکز بنادیا۔ وہ خود بھی ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ ابتداء میں شاکرؔ اور بعد میں آصفؔ تخلص اختیار کیا۔ علوم وفنون کی ترقی کیلئے درسگاہوں کا قیام عمل میں آیا۔ طلباء کی امداد کیلئے کثیر رقم خرچ کی جانے لگی۔

سلطنت آصفیہ کے ہر ایک سربراہ نے ملکی، ذہنی، علمی اور اخلاقی تعمیر میں ساری توانائیوں کو صرف کر کے علم وثقافت کی شمع روشن کردیں۔ غرض یہ کہ سرزمین دکن مشرق وجنوب کے امتزاج کا پہلا مرکز بن گئی۔ داغ دہلوی، امیر مینائی، مولانا سید حیدر علی نظم طباطبائی، وحید الدین سلیم، ڈاکٹر عبدالحق، عظمت اللہ خان، شاد عظیم آبادی، فصاحت جنگ جلیلؔ، فانی بدایونی، مرزا فرحت اللہ بیگ، یگانہ چنگیزیؔ، شبلی نعمانیؔ، عبدالحلیم شررؔ، ہارون خان شروانی، رتن ناتھ سرشار، داغ دہلویؔ، امیر مینائیؔ، سید حسین بلگرامیؔ، مولوی ظفر علی خاں، جوش ملیح آبادیؔ، شاہد صدیقی جیسی عظیم شخصیتیں مملکت آصفیہ میں بیرون ملکوں سے آکر حیدرآباد میں علم وادب کے گرانقدر کارنامے انجام دیتے ہوئے یہاں علمی، وادبی ماحول پیدا کرنے میں زبردست خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ مقامی علماء، ادباء اور شعراء میں مولانا انوار اللہ فاروقی، امجدؔ حیدرآبادی، سکندر علی وجدؔ، مخدوم محی الدینؔ، مکیش، خورشید احمد جامیؔ، سید محی الدین قادری زورؔ، عبدالقادر سروریؔ، ڈاکٹر میر ولی الدین، ڈاکٹر یوسف حسین خان، ابراہیم جلیسؔ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

اس طرح بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنت کی روایت کو آصف جاہی سلاطین نے ایک خوشگوار تسلسل عطا کیا۔ ان روایات کا سیاسی، سماجی، علمی، ادبی اور مذہبی پس منظر واضح ہوگیا۔ یہی وہ قدیم پس منظر تھا جس میں حیدرآباد اور اس کے نواح کے علاوہ پورے جنوبی ہندوستان علاقے کے لوگ متاثر ہوئے۔ اس طرح اس علاقے میں زبان اور ادب کا ارتقاء عمل میں آیا۔ انیسویں صدی کے نصف کے بعد دکن میں ادبی شعروسخن کی ترویج وترقی ہوئی، اس دور میں کئی شاعر ایسے ملتے ہیں، جن کی اہمیت مسلم ہے۔ ۲۰ ویں صدی میں یہاں سے کئی بڑے نام ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ جنھوں نے صوفیانہ شاعری کے حوالے سے بھی معروف ہوئے اور وہ بذات خود صوفی منش شخصیت کے حامل بھی تھے۔

تصوف اور عارفانہ رنگ کی شاعری اردو کے شعراء کا بھی طرہ امیتاز رہا ہے تصوف میں سالار کی حیثیت خواجہ میر درد کو حاصل ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان سے پہلے بھی اس رنگ کے اشعار مل جاتے ہیں۔ لیکن دردؔ کے بعد بیشتر شعراء نے اس کو اعتبار بخشا۔ اور اپنی محرومیوں کی تلافی کے لئے اس کے دامن میں پناہ لی۔ جنوبی ہند کے شاعروں امجد حیدرآبادی، مولانا انوار اللہ فاروقی، جلیل مانک پوری، عطا کلیانوی، اسماعیل شریف ازل، مختار ہاشمی، سرور مرزائی، مغموم مدراسی، نامی کوہ سوار، صفی اورنگ

آبادی، اور دوسرے کئی شعراء کے یہاں اس رنگ کی شاعری کا عنصر نمایاں ہے۔

اردو شاعری میں ابتداء ہی سے تصوف کا رنگ غالب ہے۔ اس کی اہمیت اس قدر زیادہ ہوئی کہ یہ مثل مشہور ہوگئی ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است''۔ غزل میں چونکہ اختصار ہوتا ہے اس لئے تصوف کے عام تصورات ہی ملتے ہیں۔ تصوف کے ذریعہ جنوبی ہند کی شعراء نے وجود حقیقی کا مظاہر کائنات، وحیدت الشہود، صفائی قلب، خلوص نیت، ہوس اور عیش وعشرت سے دوری، صبر ورضا، وغیرہ موضوعات پیش کئے ہیں۔ اس طرح غزل امیں اخلاقیات کی تعلیم عام ہوگئی۔ تصوف کے ذریعہ اردو غزل میں اخلاقیات کے بے شمار مضامین شامل ہوئے۔ صوفی منش نے تو باطن پر زور دیا ہے۔ صفائی قلب، عاجزی وانکساری، صبر ورضا، ظاہر وباطن، رواداری، خلوص نیت وغیرہ تصوف کے بنیادی عناصر واجزاء ہیں جس کو شعری اظہار کیا گیا۔ ان خصوصیات اور عناصر درج ذیل جنوبی ہند کے شعراء کے یہاں دیکھے جا سکتے ہیں:

وہی ہے اول وہی ہے آخر وہی ہے باطن وہی ہے ظاہر
ہے ایک نکتہ کہ جس کا مطلب بیان ساری کتاب میں ہے
(شاہ خاموش)

میں خلوت ہی میں اپنی محویت میں آپ رہتا تھا
دو عالم ہوگیا ظاہر مری اک رونمائی میں
(صدیق سوداگر)

بانکا سردار کملی والا
آنکھیں آہو کمانِ ابرو
(شائقؔ)

عشاق کے دلوں کو پھنسانے کا دام ہے
ہر تار موئے زلفِ گرہ گیر ایک ایک
(انورؔ)

ملائک نے سجدہ کیا ہے صفیؔ

حقیقت میں انساں کیا چیز ہے
(صفیؔ)

کہاں تک واعظو یہ جھگڑے مزے اٹھانے دو بے خود کے
جو ہوش میں ہوں تو میں یہ سمجھوں حرام کیا حلال کیا ہے
(جلیلؔ)

فنا میں بقاء کی نظر آئی صورت
عجب جلوہ خوابوں میں ہم دیکھتے ہیں
(نامیؔ)

تم نہیں پاس پر تصور ہے
دور ہوکر بھی جدا نہ ہو
(ازلؔ)

موت وحیات کا ہے فقط رمز اس قدر
نکلی جہاں سے روح رکی پھر وہاں گئی
(قمرالدین انصاری)

اس عشق کی منزل میں کہاں عقل کی باتیں
فرزانہ ہے دیوانہ ذرا دیکھتے جاؤ
(حافظ عبدالرشید)

نگاہ شوق کو حیراں کرکے پھر چھپ جا
تجلی رخ زیبا دکھا ،نقاب اٹھا
(شوکت)

سر سبز ی تحصیل بقا بعد فنا ہے
پھیلتا نہیں جب تک نہ ملے خاک میں دانہ

(مختار)

مری نظروں میں خود عشق بھی حسن ہے
جب سے آئینہ ہے میرے پیش نظر

(سرور)

وجودِ کل سے حاصل نسبت کلی ہے ہر جز کو
زبان حال سے ہر قطرہ کہتا ہے دریا ہوں میں

(توفیق)

بہر کیف ان اشعار پر تصوف کے گہرے اثرات نمایاں ہیں اس کا محور و مرکز عشق حقیقی ہے اس ضمن میں پروفیسر نثار احمد فاروقی رقمطراز ہیں۔

''دوسرا پہلو ہے جسے عشق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسے متصوفانہ شاعری بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں ساری بحث نظریہ وجود سے متعلق ہوتی ہے۔ یہ کائنات کیا ہے؟ اس کا اور چھور کہاں ہے؟ وغیرہ اردو میں تصوف آمیز شعر، یوں تو کچھ نہ کچھ ہر شاعر کے دیوان میں مل جائیں گے''۔ (4)

جنوبی ہند کی صوفیانہ شاعری کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ، متصوف شعرا نے اپنی شاعری کا رشتہ ماضی سے منقطع نہیں کیا بلکہ ان تمام روایتی پیکروں، تشبیہات، استعارات اور تراکیب وغیرہ جو زمانہ قدیم سے استعمال ہوتے آرہے ہیں ان کو بڑی خوبی سے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ گل و بلبل زلف و رخسار، ناصح و چارہ گر، کفر و اسلام، دیر و کعبہ، مے و میکدہ وغیرہ کے استعارے اور تلمیحات کا استعمال فنکارانہ چابکدستی سے کیا اور اپنے آپ کو متصوف ہونے کا ثبوت دیا، ایسے بہت سے اشعار ہیں جن کو متصوف شاعری کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ آج بھی ایسے کئی شعراء مل جائیں گے۔ جن کے پاس روایت کی پاسداری اور متصوفانہ رنگ بحسن و خوبی پایا جاتا ہے۔ ان عارفانہ اور صوفیانہ اشعار میں ہر شعر اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے اور صوفیانہ فکر و نظر اور تعلیمات کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے۔

جلتے ہیں دونوں اف نہیں کرتے زبان سے
پروانہ برد بار ہے آتش وقار شمع

(چاق)

اگرچہ روشن ہے ماہِ رخشاں فلک منور زمین ہے نوراں
نظر میں تیرے نہ آوے کچھ بھی تو اپنی ہستی کے خواب میں ہے

(شاہ خاموش)

خدا کو یاد کرتا ہوں صنم کی آشنائی میں
شراب شوق پیتا ہوں میں اپنی پارسائی میں

(صدیق سوداگر)

نیستی میں ہوں نہ ہستی میں ہوں
بے نشانی ہے نشانی میری

(حسرت صدیقی)

دل خانہ خدا ہے تو پھر اس میں اسے صفی
حسرت نہو، امید نہ ہو، مدعا نہو

(صفیؔ)

بندے کی معیت میں مولا نظر آتا ہے
قطرے کی حقیقت میں دریا نظر آتا ہے

(امجدؔ)

مل گیا اعلیٰ سے جو ادنیٰ وہ اعلیٰ ہوگیا
شامل دریا ہو قطرہ تو دریا ہوگیا

(توفیقؔ)

زلف و رخسار کا ہر وقت جو رہتا ہے خیال
صبح عاشق نہیں رہتی ہے کبھی شام سے دور

(انورؔ)

محو ہوں اس قدر تصور میں
شک یہ ہوتا ہے میں ہو یا تو ہے
(جلیلؔ)

تھی مختصر سی بات بہت عشق ووصل کی
پر تیرے ہجر نے اسے افسانہ کردیا
(تاب)

برق سینا کبھی خاموش نہیں
چشم موسیٰ کو مگر ہوش نہیں
(مختار)

حسن یوسف ہوا ر سوا ہر سو
عشق نے خوب زلیخائی کی
(نیاز)

کب لکھتے ہیں وہ نامہ کب آتا ہے وہ قاصد
ہم راستہ تکتے ہیں کب آئے جواب آخر
(حافظ عبدالرشید)

ہر اہل ہوس مصر کے بازار میں شوکت
یوسف کا خریدار ہے معلوم نہیں کیوں
(شوکت)

جنوبی ہند کے متصوفانہ شاعری کے مطالعہ سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ صوفیانہ موضوعات ،روایتی لوازمات ،فصاحت وبلاغت وغیرہ اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ جنوبی ہند کے شعراء بھی اپنی فکر ونظر کے ذریعے اردو کے قاری کو متاثر کیا ہے اور عارفانہ شاعری کے حوالے سے قاری کی تربیت اور انہیں تصوف کی طرف رغبت دلانے کی سعی جمیل بھی کرتے رہے ہیں ۔غرض جنوبی ہند کے شعراء چاہے وہ حیدرآباد سے تعلق رکھتے ہوں کہ اورنگ آباد سے یا پھر ان کا تعلق مدراس سے ہو یا گلبرگہ

اور بیدر سے ان تمام علاقوں کے شاعروں نے جنوبی ہند کی صوفیانہ شاعری کو اعتبار بخشا ہے۔مگر مقامِ افسوس ہے کہ پچھلی ایک صدی میں یہاں کی شاعری اور شاعر کو وہ مقام نہیں مل سکا جس کے وہ مستحق ہیں۔بہرکیف جنوبی ہند کی کلاسیکی اور صوفیانہ اور عارفانہ شاعری اپنی تمام تر رعنائی،فکری اور فنی خوبیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے اور یہ بڑی شاعری کے مقابلے میں رکھی بھی جاسکتی ہے۔آگے سطور میں جنوبی ہند کے چند منتخب صوفی شاعروں کا جائزہ لیا جارہا ہے:

مولانامحمدانوار اللّٰہ فاروقی:

بانی جامعہ نظامیہ اپنے وقت کے جید عالم دین ،صوفی استاذ سلاطین دکن ،دینی وعلمی کتابوں کے مصنف اور شاعر و مدرس وغیرہ ان کے علمی وادبی مقام کو اجاگر کرتے ہیں۔آپ کی ابتدائی تعلیم والد گرامی قاضی محمد شجاع الدین فاروقی کے پاس ہوئی۔حفظ کی تکمیل مولانا حافظ امجد علی صاحب نے کروائی جس وقت آپ کی عمر مبارک گیارہ برس کی تھی۔مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے تفسیر،حدیث ،فقہ،ادب اور معقولات وغیرہ سے بھی لیس ہوئے اور کئی دیگر نامور اور صاحبِ علم جید علماء سے بھی علمی فیض حاصل کیا۔مولانا محمد انوار اللہ فاروقی کے علمی مقام کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالحمید اکبر لکھتے ہیں:

> ''نیک طینت علماء نے مولانا انوار اللہ کو زمانے کا ایک قابل ترین شخص بنا دیا۔اس قدر علمی استعداد کے باوجود، جہاں کہیں حصول علم کا کوئی موقع مل جاتا وہاں پورے طور پر استفادہ کرنے کی مولانا نے کوشش کی اور علوم قرآن ،حدیث ،فقہ اور تصوف کے اعتبار سے ہمہ گیر قابلیت کے امام اور جامع الکمال ہستی کے مالک بنے۔''(5)

مولانا محمد انوار اللہ نے علوم شریعت کے ساتھ ساتھ بیعت وطریقت اور خلافت اپنے والد سے حاصل کی ۔حج کی ادائی کے دوران اس دور کے علمی و روحانی شخصیت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے ملاقات ہوئی پھر اُن کے دستِ حق پرست پر بھی بیعت کیا اور روحانی مدارجِ سلوک طئے کئے۔مولانا انوار اللہ کی قدر ومنزلت اور کاملیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حاجی امداد اللہؒ نے اُن کو بلا طلب خلافت سے بھی سرفراز فرمایا۔اور دکن کے مریدوں کو تکمیلِ سلوک وحلِ مشکلات میں مولانا انوار اللہ سے مدد طلب کرنے کی ہدایت فرمائی۔مولانا انوار اللہ فاروقی کی شخصیت اور علمی کارنامے اس قدر

ہمہ گیر، ہمہ جہت ہیں جن کی وجہ سے دکن میں علم وعرفان کوفروغ حاصل ہوا۔ بقول شاہ محمد فصیح الدین نظامی:

''انوار احمدی ،مقاصد الاسلام ،حقیقت الفقہ ،انوار اللہ الودود ،انوار التجید ،مسئلۃ الربوا، خدا کی قدرت ،شمیم الانوار ،انوار الحق ،افادہ الفہام ،منتخبہ من الصحاح (قلمی) ،تلخیص فتوحات مکیہ(قلمی)، کتاب العقل ،الکلام المرفوع فیما یتعلق بالحدیث الموضوع جیسے شاہ کار آپ کے قلمِ فیض رقم کا نتیجہ ہیں جن کے سیکڑوں صفحات بلاشبہ اسلامی انسائیکلو پیڈیا کہے جاسکتے ہیں۔ جن میں تہذیب وتمدن ،عقائد واعمال ،تقدیر وتدبیر ،نبوت وولایت ،سلوک وتصوف ،جزاوسزا، جنت ودوزخ ،جبر وقدر ،وحدت الوجود ،وحدت الشہود ،معجزہ وکرامت ،تذکرہ وتاریخ ،شخصیات وفردیات ،فصاحت و بلاغت ،زبان وادب ،شعر وسخن اتباع صحابہ ،تقلید واجتہاد ،استنباط واستخراج ،اجماع وقیاس ،سائنس وٹکنالوجی ،فلسفہ وہیت ،حکمت وطبابت ،منطق وکلام ،عشق ومحبت ،بدعت وسنت ،تدوین وتحقیق ،علماء صوفیاء ،ذکر وفکر ،علم وحلم ،دارالاسلام ودارالحرب ،سودوربوا، امن وسلامتی ،اخوت ورواداری جیسے سینکڑوں موضوعات پر علم وفن کی ایک کہکشاں بکھیر دی ہے۔''(6)

مولانا محمد انوار اللہ کی تصنیفات وتالیفات میں علم وعرفان اور تصوف کے اہم موضوعات پر بحثیں ملتی ہیں۔ جس میں آپ نے قرآن وحدیث کی روشنی میں ان کا حل پیش کرتے ہیں۔ شاید اسی علمی روحانی تبحر علمی کے خاطر تشنگان علم وعرفان نے آپ کو ''عارف باللہ'' کے لقب سے یاد کیا۔ آپ ایک خاص محفل کا انعقاد کر کے حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی مشہور زمانہ تصنیف ''فتوحات مکیہ'' کے درس دیا کرتے تھے۔ جس میں ان کے خاص مریدین اور اہل علم ہی فیض یاب ہوتے۔ محی الدین ابن عربی کی کتاب کا درس اس بات کا شاہد ہے کہ آپ کا میلانِ طبع ''وحدت الوجود'' کی طرف تھا۔ لیکن وحدت الوجود کی صحیح تفہیم اور غلط فہمیوں اور شریعت سے انسیت رکھنے کی خاطر انہوں نے اس طرح کی محفلوں کا انعقاد کرتے ہوئے ''وحدت الوجود'' کی تفہیم وتعبیر کچھ اس طرح کی ہے کہ بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہو۔ مولانا انوار اللہ اپنے ایک رسالہ بنام ''انوار اللہ

الودود فی مسئلۃ وحدۃ الوجود' میں ارشاد فرماتے ہیں:

''وحدت وجود سے اسکو کوئی نفع نہ ہوگا کیونکہ باوجود وحدتِ وجود کے دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ آگ برابر جلاتی ہے اور اس سے درد و مصیبت ہوتی ہے۔ اسی طرح قیامت میں بھی عذابِ الیم ہوگا اگر وحدت وجود کا مقتضیٰ یہ ہوتا کہ کسی کو اذیت اور ضرر نہ ہوتو دنیا میں بھی اذیت نہ ہوتی اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وحدت الوجود کا اثر قیامت ہی میں ہوگا کیونکہ وجود دنیا و آخرت میں ایک ہی ہے۔ مقتضائے ذاتی اسی کا بدل نہیں ہوسکتا ہاں یہ بات اور ہے کہ کثرتِ عبادت سے کنت سمعہ وبصرہ کے مقام تک پہنچ جائے لیکن وحدت الوجود سے کوئی تعلق نہیں وہ کثرتِ عبادت کا ثمرہ ہے۔''(7)

مولانا انوار اللہ خود صوفی بزرگ ہونے کی وجہ سے فطری طور پر صوفیانہ خیالات ان کے فکر و عمل میں شامل تھے ۔انہوں نے تصوف کے رموز کو نثر کے ساتھ ساتھ نظم میں بھی بیان کیا ہے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''شمیم الانوار'' شائع ہو چکا ہے۔ جس میں قصیدہ، مثنوی، غزلیں اور نعوت شامل ہیں۔ شعری مجموعے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالحمید اکبر یوں رقمطراز ہیں:

''اس مجموعے میں فارسی کی چوبیس (24) نعتیہ غزلیں، ایک قصیدۂ نعتیہ (37) اشعار پر مشتمل ہے۔ ایک مثنوی جس کے اشعار کی تعداد (28) ہے اور اردو کی (10) غزلیں شامل ہیں جن میں مولانا نے تصوف و اخلاق کے موضوعات کو شعری لوازمات کیساتھ پیش کیا ہے۔''(8)

اس کائنات میں مصورِ حقیقی خداوند قدوس ہی کی جلوہ نمائی ہے۔ اس عالم آب و گل میں فیضان اُسی وجود کا ہے۔ تمام اشیاء اپنے وجود سے پہلے عدم میں تھیں اور انہی کا ظہور ہوتا گیا جس کو اصطلاحِ تصوف میں ''اعیانِ ثابتہ'' کہا جاتا ہے۔ اسی حقیقت (وحدت الوجود) کی عکاسی حضرتِ انورؔ کے درج ذیل اشعار میں ملتی ہیں:

ہر چیز میں ہے صفتِ خلاق جلوہ گر
اس وجہ سے ہے قابلِ تصویر ایک ایک

....

رنگ تیرا ہی ظاہر گلشنِ جہاں میں ہے
کون سا ہے گل جس میں تیری بو نہیں آتی

....

عدم شکل ہستی میں بن بن کے آیا
کہیں کیا ہوئے امتحان کیسے کیسے

....

کیا کرتے ہیں طئے راہِ عدم آہستہ آہستہ
کھنچے جاتے ہیں اُس جانب کو ہم آہستہ آہستہ

سہل ممتنع میں کہے ہوئے ان اشعار میں صوفیانہ اور عارفانہ رموز و اسرار نہایت سادگی کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔حضرت انوار اللہ نے کئی صوفیانہ اسرار و رموز کی نہایت آسانی سے تفہیم وترسیل کی ہے۔ چنانچہ ہمہ اوست کی صوفیانہ اسرار ورموز کی تشریح وتوضیح بیک وقت نظم ونثر میں کامیابی کے ساتھ بیان فرمائی ہے۔غرض مولانا کے افکار ونظریات سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ آپ اپنے وقت کے کامل بزرگ اور صوفیءباصفا تھے۔

تھا یہی لحہ جو مدِحسان کے تھے روح الامین
کعب اورابن رواحہ کواسی کاتھا یقیں

....

ذکر ختم المرسلین اس نظم سے مقصود ہے
جوازل سے تاابد ممدوح اورمحمود ہے

....

نور سے اپنے کیا اک نور پیدا بے مثال
اور محمد(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)اس کا رکھا نام حمد اً لایزال

....

عقدہ یہ کھلتا نہیں کہ کون ہیں اور کیا ہیں وہ
ہاں سمجھتے ہیں بس اتنا برزخِ کبریٰ ہیں وہ

....

لبیک جب خود حق تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہہ دیا
پھر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے گر ان کو کہا تو کیا ہوا

مولانا انوار اللہ فاروقی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق و محبت کو سنت حسان سے تعبیر کرتے ہیں۔اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کو اعلی و ارفع متصور کرتے ہیں۔حضرتِ انوار نے عشق کا اظہار نثر و نظم میں کیا ہے۔انہوں نے علم و عرفان، عشقیہ جذبات، کیف و سرور اور جذب وغیرہ کو اپنے شعری اظہار کا زریعہ بناتے ہوئے علم و عرفان اور تصوف کو عیاں و بیاں کرنے کی سعی کی ہے۔چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

جہاں میں ہیں جلوے عیاں کیسے کیسے
ہیں اسرار دل میں نہاں کیسے کیسے

....

الٰہی یہ دل ہے کہ مہماں سرا ہے
چلے آتے ہیں کارواں کیسے کیسے

....

ذرا دیکھو انورؔ کہ انوارِ غیبی

نہاں　کس　قدر　ہیں　عیاں کیسے　کیسے

حضرت انوار کی شاعری قلب ونظر کو نہ صرف تازگی عطا کرتی ہے بلکہ ایمان وایقان کے قریب تر کردیتی ہے۔ آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حد درجہ محبت وعقیدت رکھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جان عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی انسان کیا مدحت بیان کرسکتا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مقدس کا مدح خواں جب خود خدا ہو تو بندہ کی کیا مجال کے ایسی ہستی کی ثنا بیان کر سکے۔ حقیقتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مثالیں انوار اللہ کے کلام میں دکھائی دیتے ہیں۔ جسے صوفیہ نے حقیقی تصوف سے بھی تعبیر کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

گرچہ ان کی مدح میں قرآں ہے ناطق سر بسر
وصف ان کی کرسکے کیا کوئی بیچارہ بشر

....

رتبہ ان کا کوئی کیا جانے جو دیوے کچھ خبر
عقل حیران ہے یہاں اور وہم کے جلتے ہیں پر

....

گرچہ حضرت ہیں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پرستودہ خدا
کیونکہ جملہ حمد راجع ہیں سوا رب العلا

....

لبیک جب خود حق تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہہ دیا
پھر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے گر ان کو کہا تو کیا ہوا

....

عقدہ یہ کھلتا نہیں کہ کون ہیں اور کیا ہیں وہ
ہاں سمجھتے ہیں بس اتنا برزخِ کبریٰ ہیں وہ

....

یعنی جب خالق نے چاہا غیب کا اظہار ہو

اور عبودیت کا ساری خلق میں اقرار ہو

حضور شیخ الاسلام انوار اللہ فاروقی تمام زندگی امتِ کی اصلاح وتربیت میں صرف کردی اور تا قیامت علمی فیض جاری رکھنے کے لئے حیدر آباد دکن میں ایک عظیم الشان مدرسہ ''جامعہ نظامیہ'' قائم کیا جو ایک صدی سے زائد عرصے سے تشنگان علوم کو فیض یاب کرر ہا ہے۔اس کے علاوہ تیس سے زائد علمی و مذہبی تصنیفات وتالیفات یادگار چھوڑا ی ہیں۔مولانا نے تمام عمر علم و عرفان اور درس وتدریس میں گزارتے ہوئے 1918ء کو انتقال کر گئے اور آپ کو جامعہ نظامیہ کے صحن میں سپرد خاک کیا گیا۔☆

سید جلال الدین توفیق:

سید جلال الدین توفیق (وفات 1339ھ) کا شمار بھی اپنے وقت کے صوفی شعراء میں کیا جاسکتا ہے۔ان کے حالات نصیر الدین ہاشمی نے ''دکن میں اردو'' میں بیان کئے ہیں۔توفیق کا شمار اپنے وقت کے اعلیٰ تعلیمی یافتہ شخصیتوں میں ہوتا تھا۔اس دور کے اکابر اور شفیق اساتذہ کی صحبت اور تربیت سے توفیق کے اخلاق و کردار میں نکھار پیدا ہوگیا۔ان کے مزاج میں ابتداء سے سادگی تھی ہمیشہ،صوم وصلوٰۃ کی پابندی،، مذہبی عقائد سے فریفتگی، نیک اطوار، حلیم الطبع، خوش اخلاقی اور صوفیہ اور اولیاءے محبت وغیرہ ان کی مزاج کا حصہ رہا۔ساری عمر صوفیانہ فکر وعمل میں منہمک رہ کر دنیا کی جاہ وحشمت اور دولت کی طلب سے دورر ہے۔بلکہ مزاج میں سادگی، بے ریائی تھی،جس محفل میں بھی رونق افروز ہوتے اپنے اخلاق رئیسہ و اوصاف حمیدہ کی وجہ سے محفل کی شان وشوکت بنتے۔منکسر المزاج کا یہ عالم تھا کہ لوگ ان سے عقیدت کا اظہار کرتے تھے۔حضرتِ توفیق نے اپنے علمی واخلاقی اور ادبی وروحانی فیض سے ملت کو سرفراز کیا۔

توفیق نے بیک وقت اردو اور فارسی میں شاعری کی ہے جس کی وجہ سے آپ اردو اور فارسی کے ایک بلند پایہ شاعر کی حیثیت سے مسلم سمجھے جاتے تھے،اور تمام عمر عشق حقیقی ومعرفتِ خداوندی کی دعوت کو اپنے کلام کے ذریعے دیتے رہے،توفیق کی شاعری عام خصوصیات سے پاک تھی،اگر کہیں اس طرح کے مضامین ان کی شاعری میں آ بھی جاتے تو اس میں بھی حقیقت اور معرفت کی لے نظر آتی ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے ان کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''حضرتِ توفیقؔ کے کلام میں مجاز و حقیقت کے جلوے دوش بہ دوش نظر آتے ہیں، دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے، جلال الدین توفیقؔ صوفی منش انسان تھے، فلسفے سے بھی انہیں لگاؤ تھا، انہوں نے تصوف کے مضامین کو بڑی گہرائی کے ساتھ باندھا ہے جو دعوتِ فکر دیتے ہیں، جتنا غور کریں معانی کی نئی تہیں کھلتی جاتی ہیں''۔(9)

توفیقؔ کی شاعری عوام کے برخلاف مخصوص صوفی اور مذہبی محفلوں کی زینت بنا رہتا تھا۔سماع کی محفلوں میں ان کا کلام عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پروانوں کو ایک وجد طاری کرتا تھا۔وہ ایک عاشق صادق تھے جن کی زندگی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف اور خوبیوں کو عیاں اور بیان کرنے میں گزر گئی۔حیدرآباد کی نعتیہ شاعری میں ان کا ایک مقام ہے۔نعتیہ شاعری میں تصوف و معرفت کے ایسے رموز و حقائق بیان کئے ہیں کہ جس کے مطالعہ سے ان کے تبحر علمی، عشق اور تصوف میں ان کی کاملیت کا پتہ چلتا ہے۔چند شعر ملاحظہ ہوں:

تو ہے وہ مقطع آکر کہ جب پر تو پڑا تیرا
ظہور ِ مطلع ہستی بنا ہر نقشِ پا تیرا

....

حقیقت تیری ہی بالذات اصل کل حقائق ہے
مدارِ کن فکاں ہے عالم نشو نما تیرا

....

جہاں ہے ابتداء تیری وہیں ہے انتہا تیری
ملا ہے نقطۂ وحدت سے ایسا سلسلہ تیرا

توفیقؔ نے مندرجہ بالا اشعار میں ''حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' جو تصوف کی عظیم واعلیٰ اور معنی خیز اصطلاح ہے اُس پر سے پردے ہٹانے کی سعی کی ہے،توفیقؔ نے ''حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کو اپنے رباعیات میں بھی بیان کیا ہے۔جن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کو ''شان ابدی، ازلی بالذات، آئینۂ ذات، فوق الادراک، اسرارِ الوہیت، حقیقت الحقائق، آئینہ نور ازلی، اور تفسیرِ حرف کن'' جیسے اعلیٰ و ارفع مقامات سے تعبیر کیا ہے۔ہمہ اوست کے تناظر میں توفیقؔ نے اللہ تبارک تعالی کی مختلف صورتوں میں

ظاہر ہونے کی صورتیں بیان کی ہیں کہ جسے صوفیانہ اصطلاح میں ''اعیانِ ثابتہ'' یعنی وہ صورتیں جن میں اسمائے الٰہی، علم الٰہی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی طرح عرفان و معرفت، وحدت اور ہمہ اوست، وغیرہ کو بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ شعر دیکھئے:

عدم تھے ہم تو کن کی کچھ خبر بھی نہ تھی ہم کو
ترے علم وارادے میں نہاں تھا مدعا تیرا

....

حقیقت تیری اصل جوہر واعراض عالم ہے
تو پنہاں سب سے ہے پر سب سے ملتا ہے پتا تیرا

....

منزہ ہے تو چوں وچند تشبیہ و تمثیل سے
مبرہ ہے اضافات و نسب سے مرتبہ تیرا

....

کس طرح رنگِ دوئی اس کا نظر میں جمتا
جس کو آتا ہو ہر اک رنگ میں یکتا ہونا

....

جدھر دیکھو اُنہیں کا ظاہر و باطن میں جلوہ ہے
کبھی وہ دل میں رہتے ہیں کبھی چشمِ تماشا میں

توفیقؔ تصوف کے بحر میں غرقاب معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ہر شعر سے علم و عرفان اور تصوف رواں معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے کلام سے مزید اصطلاحاتِ تصوف جیسے ذکرِ خفی، ذاتِ مخفی، وحدت در کثرت، تسلیم و رضا، ساقی، وغیرہ کے تحت اشعار ملاحظہ ہوں جن کے مطالعہ سے توفیق کے مطالعہ علم و عرفان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

ہر ایک شئے ہے زبانِ حال سے تسبیح خواں تیری
الٰہی کرتے ہیں ذکر خفی ارض و سما تیرا

....

عیاں سب میں ہے تیرا نور سب ہیں نور سے تیرے
تری وحدت میں کثرت ہے تری کثرت میں وحدت ہے

....

نہ چھوٹی مجھ سے وضع خاکساری مست ہوکر بھی
برنگِ شیۂ مئے ہے سرِ تسلیم خم میرا

....

کہیں میرا تنزل ہے کہیں میری ترقی ہے
کبھی دریا میں قطرہ ہوں کبھی قطرہ میں دریا ہوں

....

ہر اک ساغر میں عکس روئے رنگیں ڈال کر اپنا
ہزاروں رنگ ساقی نے مئے انگور کے بدلے

....

اپنی چشم مست کا کچھ عکس مئے میں ڈالدے
مئے جو دینا ہوتو ساقی ساتھ پیانہ بھی دے

توفیقؔ کا کلام تصوف وعرفان سے معمور ہے۔زبان و بیان اور اسلوب کے اعتبار سے بھی ان کا کلام ناقدین کی توجہ چاہتا ہے۔مضامینِ تصوف دلکش اور دلنشین اور تازگی کا پیکر معلوم ہوتے ہیں۔غرض ان کے یہاں ایسے صوفیانہ رمزونکات اور اصطلاحات بیان ہوئے ہیں کہ اس میں ایک نوع کی صوفیانہ اور عارفانہ تازگی کا احساس ہوتا ہے۔☆

سید اعظم علی شائق:

سید اعظم علی اپنے دور کے ایک صوفی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کے والد سید احمد علی حسینی ایک متقی انسان اور حافظ اور عالم بھی تھے۔رواج عام کی طرح ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔اس کے بعد انہیں قاضی پورہ کے مدرسے میں داخل کرایا گیا جہاں پر انھوں نے شریعت اور معرفت دونوں تعلیم سے سرفرازی حاصل کی۔اس ضمن میں ڈاکٹر احمد حنبلی رقم طراز ہیں:

’’آپ کے نانا حضرت مفتی محبوب نواز الدولہ کو چونکہ اولادِ نرینہ نہیں تھی اس

لئے آپ نے حضرت شائق کی ابتدائی تعلیم اپنے ذمہ لے لیا، سن شعور کو پہنچتے ہی آپ کو قاضی پورہ کی درسگاہ میں داخل کر دیا گیا جو اس زمانے میں ظاہر و باطنی علوم کا حیدرآباد میں سب سے بڑا مرکز تھا، اس لحاظ سے اس دور کے جید علماء اہل نظر اور صاحب دل بزرگوں کے زیر سایہ و سرپرستی آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی''۔(10)

اس درسگاہ میں شائقؔ کے ہی اہل خاندان اساتذہ تھے، حضرت خواجہ محبوب اللہ روحانی تعلیم دیتے، دیگر اساتذہ میں آپ کے والد حضرت سید احمد علی شاہ اور چچا حضرت سید محمد عمر حسینی شامل ہیں، اس کے علاوہ اُن کے تایازاد بھائی حضرت عثمان حسینی فائق علم عروض کی تعلیم دیتے، شائق نے بہت جلد اپنی علمی قابلیت کی بنا پر کم عمری ہی میں مفتی کے عہدے پر فائز ہو گئے۔(11)

شائق میں بردباری، ذکی الفہمی، فراست اور مہمان نوازی وغیرہ جیسی صفات موجود تھیں۔وہ شریعت مطہرہ پر پابند تھے۔اس کی وجہ ان کا پورا خاندان شریعت اور طریقت کا آئینہ خانہ تھا　قطب الاقطاب حضرت خواجہ محبوب اللہ قدس سرہ العزیز کے سے شائق کو بیعت حاصل تھی۔اپنے پیر و مرشد کے علاوہ شائق، غوث اعظم سے بھی عقیدت رکھتے تھے۔حضرت شائق کی پوری زندگی عشق، دیوانگی اور وارفتگی میں بسر ہوئی۔بالخصوص عشق رسول ﷺ آپ کے قلب و نظر کا محور و مرکز تھا۔حضرت کا دیوان عشق نبی ﷺ کی حلاوت سے معمور ہے۔بقول پروفیسر عبدالحمید اکبر:

''حضرت شائق کے کلام کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کے یہاں عشق رسول ﷺ کا یہ والہانہ پن ہے کہ وہ جس طرح بھی بن پڑے مدینہ پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ان کی کوئی نعتیہ غزل ایسی نہیں ہوتی کہ جس میں وہ مدینہ پہنچنے کی آرزو نہیں کرتے۔لیکن جامئ دکن حضرتِ شائق جب حج کیلئے مکہ مکرمہ گئے سارے مناسک حج مکمل کر لئے لیکن اپنے ہی اس شعر کے مصداق مدینہ منورہ بظاہر نہیں پہنچ سکے''

سوئے طیبہ مرا گزر نہ ہوا
وائے قسمت کہ یہ سفر نہ ہوا

(12)

شائقؔ کے کلام میں تصوف کی نیرنگیاں نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے دیکھی جاسکتی ہیں، شائق کی ذات عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وابستہ تھی، اُن کے کلام میں اسی کیفیت کی غمازی ملتی ہے۔عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دیوانگی ووارفتگی نے اُن کے دل کو تصوف ومعرفت کے راز کا مسکن بنادیا تھا۔شائقؔ عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس قدر محو رہتے تھے کہ انہیں سوائے اس ذات کے کوئی نظر نہیں آتا تھا۔اور وہ خدائی کے جلوے کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پاک کے حوالے سے دیکھا ہے جس میں ''وحدت الوجوذ'' کے اشارے بھی پنہاں ہیں۔شعر ملاحظہ ہوں:

تجھ میں یکتائی کی اک شان نظر آتی ہے
اک شگافِ درِ وحدت ہے گریباں تیرا

....

بحر وحدت کی عجب موج ہے سبحان اللہ
مجھ میں پوشیدہ مرا یار ہے پھر یار جدا

....

تصور شانِ وحدت کا تھا جب یہ ذہن میں آیا
سمٹ کر سایہ قد بن گیا ہے میم احمد کا

''نفی واثبات'' کے حوالے سے بھی ان کے یہاں ''ہمہ اوست'' کا نظریہ محسوس کیا جاسکتا ہے۔شعر دیکھیے:

لاالہ سے جو میں نے نفی کی اغیار سے
مل گیا دل کو وہیں بس لطفِ الااللہ کا

....

ثبوت نفی میں اثبات الا کا میں قائل ہوں
کھینچی ہے تیغ لا کی ماسوا کا اپنے قائل ہوں

....

کھوئے جو خودی اپنی تو بندہ بھی خدا ہو

منصور کے لب ہوتو اناالحق کی صدا ہو

شائق ایک عاشق بامراد کی طرح عشق کی نیرنگیوں کو عشق رسول ﷺ کے حوالے سے پیش کیا ہے۔وہ کہیں وحدت و یکتائی تو کہیں وحدت درکثرت، اور عظمت انسانی کو عاشقانہ و عارفانہ انداز سے بیان کیا ہے۔ان کے اظہارِ بیان میں سرکار عالی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے حوالے سے بات آگے بڑھتی ہے۔اشعار ملاحظہ ہوں:

تجھ میں یکتائی کی اک شان نظر آتی ہے
اک شگافِ درِ وحدت ہے گریباں تیرا

....

شکل احمد میں نظر آتا ہے کیا کیا آیا
کبھی وحدت کبھی کثرت کا تماشا آیا

....

دیکھتے آپ کی صورت کو ہر ایک صورت میں
دل یہ کہتا ہے کہ دیدۂ باطن ہی نہیں

....

خدا کا خاص مظہر ہوں ظہور حق کا حامل ہوں
خدائی مجھ سے ظاہر ہے خدائی کا میں حاصل ہوں

....

میں وہ ہوں ہر جگہ ہے تجلی مری عیاں
میں نور شمع انجمنِ بزم رہا ہوں

شائق کے یہاں تصوف کی مختلف کیفیات کا اظہار حضور ﷺ کی ذات کے حوالے سے ہوا ہے۔دل، مقام دل، اثبات ونفی، اور اس طرح کئی صوفیانہ اصطلاحوں کو اپنے اشعار میں پیش کرتے ہوئے نبی ﷺ کے واسطے سے تصوف کو سمجھنے اور سمجھانے کی سعی کی ہے۔چند اور شعر ملاحظہ فرمائیں:

جدھر وہ ہیں بتاتا ہے پتہ دل

وہ قبلہ ہیں تو ہے قبلہ نما دل

....

کسی دن تونظر آئے گا اس میں نور احمد کا
خیال اسواسطے رکھتا ہوں میں دل کی صفائی کا

....

کھوئے جو خودی اپنی تو بندہ بھی خدا ہو
منصور کے لب ہوتو اناالحق کی صدا ہو

....

فقیری میری خود کہتی ہے میں شاہی میں شامل ہوں
تجھی سے مانگتا ہوں تجھکو یارب میں وہ سائل ہوں

....

جدھر کو دیکھتے ہیں آپ ہی کو دیکھتے ہیں
کبھی ہم اپنے بھی محوِ جمال ہوئے ہیں

....

یہ ہے عاشق کا مذہب اور یہی عشاق کہتے ہیں
تمہاری شکل میں یا مصطفیٰؐ روئے خدا دیکھا

کلام مختصر حضرت شائق کا کلام صوفیانہ مسائل سے پرنظر آتا ہے۔ان کے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے حوالے سے تصوف کی ضوفشانیاں نمایاں ہوتی ہیں جس میں کہیں فنا و بقا کی باتیں ہیں تو کہیں ہمہ از اوست تو کہیں ہمہ اوست کو دلچسپ و دلنشین انداز میں بیان کرتے ہوئے عشق کی اعلیٰ وارفع مثال پیش کی ہے۔☆

مغموم مدراسی:

مدراس سے تعلق رکھنے والے مغموم بیسویں صدی کے ربع صدی تک رہے۔ابتداء ہی سے شعر وسخن سے دلچسپی لیتے رہے۔مغموم کا اصل نام محمد اسمعیل سیٹھ ہے مگر مغموم کے نام سے شعری دنیا میں نام کمایا ہے۔ان کی تاریخ ولادت اور حیات

کے بارے میں تذکرے خاموش ہیں ۔وہ اپنے عہد کے معروف شاعر رہے جن سے علمی و ادبی فیض جاری رہا۔بقول محمد عبدالستار میر:

''آپ کی ذات محتاج تعارف نہیں آپ کی شخصیت شہر مدراس میں نہایت دقیع تھی اورشعر وسخن میں آپ ایک ممتاز اور مدح گوشاعر کی حیثیت رکھتے تھے نہایت خلیق ملنساراور حد درجہ منکسر المزاج تھے سادگی پسند تھے ظاہری نمائش سے تا آخر عمر آپ کو تنفر رہا ہمیشہ آپ کا مطمحِ نظر منجان مرنج اور مسلک صلح کل رہا ہر کس و ناکس کی تواضع کیا کرتے تھے''۔(13)

مغمومؔ جن شعراء اور ادباء سے متاثر رہے ان میں، اکبرؔ الہ آبادی، علامہ اقبالؔ، حالی نذیر احمد، آزاد، شرر اور شبلیؔ وغیرہ شامل ہیں۔وہ شعری فن اور فنکار کی عظمت کے قدر داں بھی تھے۔ان کے مزاج میں عجز و انکسار تھا اور وہ حضور اکرم ﷺ کے عاشق اور بزرگوں سے عقیدت رکھتے تھے۔آپ کا وصال 31 راگست 1929ء کو ہوا۔

مغمومؔ ایک عاشق مزاج، مہذب اور پاک باطن ہونے کے ساتھ ساتھ عشقِ رسول ﷺ پر فخر کرنے والے بامراد عاشق رہے جنہوں نے ہمیشہ عشق حقیقی کا درس دیا۔عاشق بامراد کے باوصف انہوں نے اپنی شعری اظہار میں تصوف کے رموز و معارف کے درواہ کئے ہیں اور وہ عشق ومحبت کے رموز کو عشق رسول ﷺ کے حوالے سے بیان کیا ہے۔شعر دیکھئے:

کب قلب مرا محرم اسرار نہیں ہے
کب سینہ مرا مطلع انوار نہیں ہے

....

مرا سینہ نہیں ہے، مخزن اسرارِ قدرت ہے
کہ گنج معرفت حاصل ہوا ہے اس دفینے میں

....

محمد ﷺ گنج عرفاں قلزم راز حقیقت بھی
محمد ﷺ مخزن انوار عظمت شانِ رحمت بھی

....

ضیائے رمزِ وحدت ہے عیاں شانِ نبوت سے
یہی ہے معرفت حق کی شریعت بھی طریقہ بھی

....

جو طالب قُربِ حق کا ہو کوئی دیدار سے پہلے
تو وابستہ ہو عشقِ سید ابرار سے پہلے

....

بابِ عرفاں پہ کسی غیر کو یاں راہ نہو
عشقِ احمد کے سوا دل میں کوئی چاہ نہو

....

شانِ حق کوئی ، کوئی خیر البشر کہتے ہیں
ہم تجھے قلزم وحدت کا گہر کہتے ہیں

راہ سلوک میں سالک کو فنا کی منزلوں سے گزرنا ہوتا ہے سلوک میں فنا کو اعلی درجہ حاصل ہے ''فنافی الرسول'' کو تو اعلی وارفع مقام حاصل ہے۔فنا کی منزل اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب سالک خودی کو مٹا کر بے خودی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔فنا دراصل صوفیہ کے یہاں لاشعوری کیفیت کا نام ہے۔فنا کے بھی مختلف درجات ہیں جیسے فنائے صفاتی، فنائے ذاتی اور فنائے افعالی وغیرہ۔اس کیفیت کا اظہار مغموم کچھ اس طرح کرتے ہیں:

توحید کا ہے راز فنافی الرسول میں
بت کو خودی کے توڑ کے کچھ رنگ لائے

....

آگاہ ہو چکا ہوں فنافی الرسول سے
اپنا نشاں مٹاؤں تو اسکا پتا ملے

....

فنا فی المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جبتک نہو رب کو کہاں پائے

ادھورا ہے محبت میں وہ پورا ہو نہیں سکتا

عشق، محبت کی اعلیٰ ترین صورت کو کہتے ہیں۔ اور یہ کیفیت اپنے آپ کو گم کرنے کے بعد یا دمعشوق سے حاصل ہوتی ہے۔ مختلف کاملین تصوف نے اس کی اہمیت اور حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ اہل طریق کے پاس عشق مشعل ہے جس کی روشنی سے سالک نور حاصل کرتا ہے اور مدہوشی کے عالم میں مستغرق ہو جاتا ہے یا محبوب میں اور بے خود بھی ہو جاتا ہے۔ عشق کی مختلف النوع کیفیات کا اظہار درج ذیل اشعار میں ملتا ہے:

بے خود کیا کسی کو، کسی کو مٹادیا
وہ التفاتِ عشق ہے یہ ہے ادائے عشق

....

ہوگیا جل کر قصر تن برباد
عشق کی آگ تھی دبی نہ رہی

....

دائم ہوں محو لذت جو روجفائے عشق
مجھ پر فدا ہے عشق تو، میں فدائے عشق

....

مست ہوں مغموم جامِ عشق سے
بیخودی آئی خودی جاتی رہی

....

گو مشکلیں ہیں عشقِ حقیقی کی راہ میں
انسان کو تجربہ ہونشیب و فراز کا

....

عشق کے اعجاز سے قلب پُر انوار ہے
عشق جو پیدا نہو دل بھی گرانبار ہے

....

اے دل ہے یہ راہِ عشق مگر ہمت کا سہارا لے کے گزر
اس رہ میں عبث ہے جاں کا خطر ہستی کا نقش مٹا دینا

مغموم نے روح، دل ،تسلیم و رضا، اخلاص، فنا و بقا، خودی ، بے خودی، حیرت، عظمت انسانی، جستجو، وحدت الوجود، حقیقت اور مجاز وغیرہ اصطلاحات کو شعری پیراہن عطا کیا ہے۔ یہ صوفیانہ عناصر کسی بھی شاعر کی متصوفانہ خوبیوں کو عیاں کرتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کیفیتِ روح کی خاصانِ خدا کو معلوم
ماہیت اس کی ہے دشوار پر اسرار ہے روح

....

رموز و قدرت خلاق کا یہ مسکن ہے
کہ گنج سرحقیقت کا راز دار ہے دل

....

جھکادے سر کو تسلیم و رضا پر کام ہو آساں
رہیگا شکوہ سنج بخت وجود آسمان کب تک

....

ہو اطاعت تو ذوق الفت سے
بندگی ہو اگر تو با اخلاص

....

فنا سے قرب حاصل ہو مقام رازداری ہے
بقا کا ہے وہی طالب جو محو ذات باری ہے

....

مغمومؔ ذات حق میں یہ ہستی فنا کروں

جز اس کے کیا علاج ہے حال تباہ کا

....

بیخودی ایسی ہو طاری جس میں ہو ذوق لقا
گرخودی زائل ہوجائے خدا ملتا نہیں

....

کبھی جلوۂ حقیقی کا ظہور تھا نہ ممکن
جو خودی کے دائرے میں دل بیقرار ہوتا

....

مقامِ قرب اک حیرت کدہ ہے
اے دل حجاب درمیاں کا

....

دشتِ توحید میں گم طالبِ جاناں ہوں میں
صورت غم نظر حق سے پنہاں ہوں میں

....

دل مرا ہوکر کسی کا مبتلا جاتا رہا
جستجوئے یار میں گم ہوگیا جاتا رہا

....

ہر ایک رنگ میں مغموم ہے ظہور اس کا
جوذوقِ دل ہے تو حاصل ہے وسعت نظری

....

اناالحق شور تھا منصور کے ہر قطرۂ خوں سے
صدائے حق کو روکے غیر ممکن کوئی طاقت بھی

....

ہوگیا نقش ہو عیاں حسن فریب ساز میں
عکس حقیقت آگیا آئینۂ مجاز میں

مغمومؔ نے ''روح'' کو امر ربی اور ''دل'' کو مشاہدہ الٰہی کہا ہے اسی طرح ''تسلیم و رضا'' کا بیان ''اخلاص'' کی اہمیت ''فنا'' کی کیفیات سے حاصل ہونے والے ثمرات، ''بقا'' کی منزل ''خودی'' کے راز سے ''بیخودی'' کی حالت ''دیدار '' سے پیدا ہونے والی کیفیت، ''حیرت'' کا نقش، ''عظمت انسانی'' کے علاوہ سالک کی جستجو و تلاش حق، ذات کو فراموش کردینا، انا الحق کی صدا اور 'وحدت الوجود' کے نظریہ کو اپنے اشعار میں اُجاگر کرتے ہوئے متصوفانہ فکر ونظر کہیں تشبیہ تو کہیں استعارہ تو کہیں تلمیح اور دیگر صنائع کے حوالے سے واضح کیا ہے۔غرض مغموم بیسویں صدی کے شعرائے تصوف میں اہمیت کے حامل قرار دئے جاسکتے ہیں۔☆

جلیلؔ حسن مانک پوری:

امیر مینائی کے تلامذہ سے تعلق رکھنے والے شعراء میں جلیل حسن مانک پوری کا شمار ہوتا ہے جنہوں نے اپنے استاد کی طرح صوفیانہ مزاج کے حامل شاعر گزرے ہیں۔حافظ جلیل حسن المتخلص جلیلؔ 1864ء میں بمقام اودھ کے مشہور قصبہ مانک پور ضلع پرتاب گڑھ میں شیخ حافظ مولانا عبدالکریم کے گھر پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔اور دیگر اساتذہ سے بھی تعلیم حاصل کرتے رہے اور علمائے فرنگی محلی سے مختلف علوم حاصل کئے اور امیر مینائی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔امیر مینائی کے ہمراہ حیدرآباد کا رخ کیا۔اسی دوران 1901ء میں استاد کے انتقال کے بعد حیدرآباد ہی کو وطن ثانی بنالیا۔حیدرآباد میں میر عثمان علی خان نے جلیلؔ کو اپنی استادی کا شرف بخشا۔جلیلؔ کے شعری مجموعے ان کی زندگی میں شائع ہوکر مقبول ہوئے۔''تاج سخن''(1910ء)''جانِ سخن''(1914ء) میں منظر عام پر آئے۔اور ''روح سخن''(1956) کے نام سے بھی شائع ہوچکا ہے جو جلیل کی وفات کے بعد منظر عام پر آیا۔5 رجنوری 1946 میں مختصر علالت کے بعد جلیل اس دار فانی سے کوچ کیا اور خطہ صالحین میں آسودۂ خاک ہوئے۔

جلیل مانک پوری غزلیہ شاعری کے اداشناس تھے۔ان کا کلام فصاحت و بلاغت کے علاوہ تغزل اور تصوف کی عرفانی شان وشکوہ رکھتا ہے اور ان کے یہاں فکر ونظر اور حکمت و اخلاق کی باتیں بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔جلیل کا کلام شاعرانہ خوبیوں اور عظمتوں کا مظہر ہے۔ان کے یہاں اخلاق اور ناصحانہ گفتگو کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ان کی شاعری کو عوام وخواص

میں یکساں مقبولیت حاصل ہے۔ان کے کلام ایک اور خصوصیت تصوف ہے جس میں صوفیانہ اور عرفانی افکار و نظریات بھی پائے جاتے ہیں۔ڈاکٹر اعجاز مدنی جلیلؔ کی شاعری اور اخلاق سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''جلیل دبستان لکھنوی کے آخری مسلم الثبوت استاد تھے،ان کی شاعری میں جہاں قدیم رنگ تغزل نمایاں ہے وہاں تصوف،خلق اور درس اخلاق کی کمی نہیں ہے''۔(14)

جلیلؔ مانک پوری کے کلام کا جائزہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کلاسیکی شاعری کا یہ رمز شناس صوفیانہ فکر کو بھی اپنی شاعری کا ذریعہ بناتے ہوئے کلاسیکی لفظیات کو استعمال کرتے ہوئے نئی معنویت پیدا کرنے کی سعی کرتا ہے۔وہ جن لفظیات کا استعمال کرتے ہیں ان میں،میکش،مستی،جام،سبو،پیانہ،شراب،ساقی،میخانہ اور نشہ وغیرہ شامل ہیں۔ان لفظیات کے مطالعہ سے کہیں مجاز تو کہیں حقیقت کا دھوکا ہوتا ہے اور معنویت بھی آشکار ہو جاتی ہے۔ان لفظیات کے مناسبت سے چند شعر دیکھیے جن میں ان کے پاکیزہ خیالات مترشح ہو رہے ہیں:

خم میں ، سبو میں، جام میں نیت لگی رہی
میخانے ہی میں ہم رہے میخانہ چھوڑ کر

....

ابھرنے دیتی نہ یادِ شراب پھر مجکو
شراب چھوڑ کے غرق ِ شراب ہوجاتا

......

محو ہوں دیکھ کے ساقی ترے مئے خانے کو
آج مجھ پر یہ کھلا راز کہ جنت کیا ہے

......

یار سے جب تک نہ ہو ملنا جبھی تک خیر ہے
شمع سے پروانہ لپٹا اور جل کر رہ گیا

......

رندوں کے ہاتھ سے نہیں ٹوٹی یہ ساقیا
نشہ میں چور ہوگئی بوتل شراب کی

جلیل کے طرز اِزِ بیان، فصاحت و بلاغت کی چاشنی اور تغزل و جمال نے اُن کے کلام میں موجود عرفانی رنگ وِ آہنگ کو سنوارنے میں ان کی شعری خصوصیات نے اہم رول ادا کیا ہے۔ عرفان عباسی کے بقول:

> ''جلیلؔ صاحب کے کلام میں دہلی اور لکھنوء اسکول کی خصوصیات کا امتزاج ملتا ہے۔ وہ سادگی ،لطفِ بیان وشعریت، حسن و دلکشی، معاملہ بندی و شوخی، رمانیت و مستی، زبان کی پختگی و شیرنی، ترنم و نغمگی، اظہارِ حسن و عشق، سوز وساز کی ہم آہنگی، سنجیدگی، متانت، گیرائی و گہرائی، داخلیت و گم گشتگی، سہل بیانی وجذبات نگاری، معنی آفرینی وجدت، فکر، تشبیہات و استعارات کے بر محل استعمال اور تصوف کی خوبیوں سے مالا مال ہے۔''(15)

جلیلؔ مانک پوری اپنے کلام کے ذریعے اپنی فکر کو اجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے کہیں صوفیانہ اور عارفانہ فکر و فن کا اظہار کرنے میں عشقیہ واردات سے بھی کام لیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مے اور میخانہ ذکر بار بار آتا ہے اور سالک کی کیف و مستی کو شراب اور ساقی سے تشبیہ دیتے ہیں اور کہیں یہ کہتے ہیں کہ عشق الہیہ کی ذات میں فنا ہونا ہی دراصل تصوف کی اساس ہے۔ سالک ہمیشہ محو و استغراق کی کیفیات سے دو چار ہوتا ہے۔ ان کیفیات کی عکاسی درج ذیل اشعار میں ملاحظہ فرمائیں::

کیمیائے بیخودی کی دھن میں رہتا ہے جلیلؔ
پوچھتا ہوں جب اُسے سنتا ہوں میخانے میں

....

مئے کشی سے نجات مشکل ہے
مئے کا ڈوبا کبھی اُبھرنا سکا

....

ترے جلوے سے غش آنا نہیں موقوف موسیٰ پر

یہ وہ مئے ہے کہ جو پیتا وہی سرشاد ہوجاتا

....

میں نے پوچھا تھا کہ ہے منزلِ مقصود کہاں
خضر نے راہ بتائی مجھے میخانے کی

مسرت وصل کی آنے نہ دیتی ہوش میں مجھ کو
جو تو ملتا تو پھر ملنا میرا دشوا رہوجاتا

....

محو ہوں اس قدر تصور میں
شک یہ ہوتا ہے میں ہویا تو ہے

....

محویت مجکو اب ایسی ہے کہ آئینہ میں
اپنی صورت تیری تصویر نظر آتی ہے

غرض حضرت جلیلؔ نے تصوف کی ضوفشانیوں کو اپنے شعری اظہارات کا حصہ بنایا۔انھوں نے صوفیانہ خیالات پیش کرنے کی لیے صنائع لفظی اور صنائع معنوی کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔عشق کے جام کا سرور، جذبۂ بے خودی، رازِ خودی، وحدت الوجود، فنا و بقا، وصل و فراق، وغیرہ جیسے جواہر تصوف ملتے ہیں اور جلیلؔ کو ایک متصوفانہ شاعر کے روپ میں ظاہر بھی کرتے ہیں۔اشعار ملاحظہ ہوں:

جام الست میں جلیلؔ کیا تھی بلا کہ آج تک
دل بھی اسی سرور میں ،میں بھی اسی خمار میں

....

کی بیخودی نے خوب مری رہبری جلیلؔ
ساتھی تھے جتنے چھوٹ گئے مجھ سے راہ میں

....

اس قدر محو تصور ہوں کہ شک ہوتا ہے
آئینے میں مری صورت ہے کہ صورت تیری

....

پردہ نہ تھا وہ صرف نظر کا قصور تھا
دیکھا تو ذرہ ذرہ میں اس کا ظہور تھا

....

مقام ِ خضر تھا یا میکدہ تھا کیا کیوں کیا تھا
جہاں سے میں حیات ِ جاوٗدانی لے کے آیا ہوں

....

میں سمجھتا ہوں کہ ہے جنت و دوزخ کیا چیز
ایک ہے وصل ترا ایک ہے فرقت تیری

عشق کے صدہا جلوے عارفوں،اورشاعروں کے یہاں ملتے ہیں۔راہ عشق کی وسعتوں کا اندازہ لگانا مشکل ہے کیونکہ عارفوں کا خیال ہے کہ عشق ایک بحرِ بیکراں ہے جسکا کوئی کنارہ نہیں ہے۔عشق شراب حیات ہے یہ ایک وجد آفریں ہے جو خدا کے قریب کرتا ہے اور اللہ والوں سے محبت کا درس بھی دیتا ہے۔عشق کی گونا گوں حقیقت کو جلیلؔ کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

محیط عشق کی وسعت نہ پوچھو مختصر یہ ہے
مری ہستی کی موجوں کوکوئی ساحل نہیں ملتا

....

ثبوت ِ عشق کو یہ دو گواہ کافی ہیں
جگر میں داغ بھی ہے دل میں اضطراب بھی ہے

....

شراب عشق پی کر جو نہ بہکے ظرف اس کا ہے
کہ اک اک بوند اس کی رکھتی ہے تاثیر میخانہ

جلیل مانک پوری صوفی منش ہیں یا نہیں اس سے قطع نظر ان کے کلام کا جائزہ ہمیں یہ بتا رہا ہے کہ ان کے یہاں عشقیہ جذبات اور واردات قلبیہ کی آئینہ داری کر رہا ہے۔غرض جلیلؔ مانک پوری صوفی شاعر نہ سہی مگر صوفیانہ اقدار ان کے یہاں عزیز رہے ہیں جو اس دور کی ضرورت اور اہمیت تھی۔علی احمد جلیلی کے حوالے سے ڈاکٹر اعجاز مدنی رقم طراز ہیں:

"جلیل کے یہاں تصوف اور عشق حقیقی کی وارداتیں کہیں کہیں کلام میں نظر آجاتی ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ خصوصیت ہے کہ شاعرانہ طرز ادا ہاتھ سے نہیں جاتا" (16)

حضرت جلیل کے یہاں چند اور صوفیانہ خصوصیات کے حامل اشعار درج کئے جاتے ہیں جن کے مطالعہ سے ان کی متصوفانہ فکر و نظر واضح ہو جاتی ہے۔

طلب یار ہے کیا اپنی خودی سے جانا
شوقِ دیدار ہے کیا موت کا خواہاں ہونا

....

حسن دیکھا جو بتوں کا تو خدا یاد آیا
راہ کعبہ کی ملی ہے مجھے بت خانے سے

....

شوقِ دیدار لکھا تھا یہ جواب آیا ہے
سیکھ پہلے صفت آئینہ حیران ہو

....

در پردہ مئے حسن سے مستانہ بنا دے
پردہ اٹھا اور مجھے دیوانہ بنا دے

....

اس آئینے کی سکندر تلاش ہے مجھ کو

جس آئینے میں نظر شکل یار آتی ہے

مقامِ طلب وشوق، تلاش وجستجو، کثرتِ ذکر، اور مجاز وحقیقت، حیرت، تڑپ، وغیرہ کو جلیلؔ نے نہ صرف معرفت انگیز پیرائے میں بیان کیا ہے بلکہ اس میں شعری حسن یعنی زبان و بیان، سلاست وروانی، لہجہ کی شگفتگی وغیرہ خصوصیات کی بھی جلوہ گری ہے۔اس ضمن میں علی احمد جلیلی نے لکھا ہے کہ:

''مجموعی طور پر جلیلؔ کے یہاں زبان کی صفائی سلاست، لہجے کی شگفتگی ،محاوروں کا استعمال شبنم کی نرمی، شعلۂ گل کی گرمی، اسلوب کا رکھ رکھاؤ اور ان سب سے زیادہ ایک مہذب سطح اور ایسا ستھرا پن ملتا ہے جو اوروں کے یہاں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے''۔(17)

جلیلؔ مانک پوری کے کلام میں اردو غزل کی کلاسیکی قدریں ملتی ہیں ان کے کلام کا بیشتر حصہ صوفیانہ وعارفانہ مضامین پر دلالت کرتا ہے۔انہوں نے کلام کو کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ان کا کلام فکر وفن کا مرقع بن گیا ہے۔☆

امجد حیدرآبادی:

بیسویں صدی میں اردو کی صوفیانہ شاعری کا ایک روشن چراغ امجد حیدرآبادی کو کہا جاسکتا ہے جنہوں نے رباعی کے حوالے سے صوفیانہ شاعری کے چراغ روشن کرتے ہوئے ملک گیر شہرت حاصل کی۔امجد حیدرآبادی جن کا اصل نام سید احمد حسین 1887ء (بعض جگہ ان کی تاریخ پیدائش 1888 بھی لکھا ہوا ہے) کو حیدرآباد میں سید رحیم علی کے گھر تولد ہوئے ۔ابھی ان کی عمر ایک ماہ کی تھی کہ والد کا سایہ سے محروم ہوئے۔والدہ نے بڑی محنتوں سے پرورش کی۔آپ کے والدین خدا رسیدگی اور پرہیزگاری کی مثال تھے۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور جامعہ نظامیہ سے بھی تعلیم کے سلسلہ کو جاری رکھا۔اس کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا اور سید نادر الدین سے فلسفہ کا درس بھی لیا۔حیدرآباد میں 1908ء موسیٰ ندی کی طغیانی میں ان کا سب کچھ لٹ گیا۔ان کی والدہ، بیوی اور ایک معصوم بیٹی اس حادثہ کی زد میں آ گئیں۔اس غم نے انہیں بے حال کیا مگر چونکہ ان کی تربیت تصوف کے زیر سایہ ہوئی تھی۔لہذا انہوں نے ہر غم اور مصیبت کا مقابلہ ثابت قدمی کے ساتھ کیا۔غرض ان کا مزاج صوفیانہ تھا اور ان کے اعمال و اشغال میں بھی صوفیانہ چمک دمک شامل تھی۔ان کے ابتدائی زندگی کا کلام بھی طغیانی کی نذر ہوگیا۔اس کے بعد رباعی کی طرف مائل ہوئے اور اس میں خوب شہرت

پائی۔امجد حیدرآبادی 21 مارچ 1961ء کو اس دارِفانی سے کوچ کیا اور احاطہ درگاہ حضرت شاہ خاموش میں انہیں سپرد خاک کیا گیا۔

امجد حیدرآبادی نے غزل سے اپنی شاعری کی ابتداء کی اور اس زمانے میں داغ دہلوی سے متاثر رہے۔مگر بہت جلد نظم نگاری کو ترجیح دی اور آخر میں رودموسیٰ کے بعد رباعی کی طرف مائل ہوئے اور شہرت دوام پائی۔آپ کی تصانیف میں رباعیات امجد (حصہ اول، دوم اور سوم) شائع ہو چکی ہیں۔اس کے علاوہ ان کے دیگر مجموعوں میں جمال امجد، صبح امجد، گلستان امجد، ریاض امجد وغیرہ بھی منظر عام پر چکے ہیں۔اگر چہ آپ نے مختلف اصناف میں شعر کہے ہیں۔تاہم صنف رباعی نے انہیں اردو کا عمر خیام بنا دیا۔اس ضمن میں محمد رضی الدین معظم لکھتے ہیں:

> ''امجدؔ اپنے پاکیزہ حکیمانہ کلام کے باعث آسمان شاعری کے مہر درخشاں ہیں۔فارسی ادب میں عمر خیام، سلطان ابوسعید ابوالخیر سبحانی نجفی اور سرمدؔ نے رباعی گو شعراء کی حیثیت سے اپنا اعلیٰ وارفع مقام پیدا کیا۔کہ پھر ان کا کوئی ثانی نہ ہو سکا۔باوجود اُس کے رب العزت کو اپنی قدرت کا ثبوت دینا مقصود تھا۔لہذا قدرت نے سرزمین دکن سے مسلسل حادثات زندگی کی شکار شاعری کی صنف رباعی کو اس طرح ودیعت بخشی کہ اُردو ادب کو صنف رباعی میں امجدؔ حیدرآبادی پر ایسا فخر و ناز حاصل ہو گیا کہ پھر کوئی ایسا منفرد رباعی گو شاعر پیدا نہ ہو سکا۔سچ پوچھیئے تو امجدؔ حیدرآبادی ہی پہلے شاعر ہیں جنہیں رباعی گو شعراء کی حیثیت سے خاص شہرت ملی۔(18)

امجد کی رباعی گوئی فکر و فن کا ایسا حسین مرقع ہے جس میں سادگی، نازک خیالی اور تاثر کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ان کے یہاں لفظی اور معنوی خصوصیات بھی ملتے ہیں، اور شعر کو زیور حسن سے آراستہ کرنے کے ہنر سے بھی واقف ہیں۔اس کے علاوہ اخلاقیات، عرفانیات، آدمیت اور پندونصائع وغیرہ کا درس بھی بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔عبدالقدیر صدیقی حسرتؔ رقم طراز ہیں:

> ''ہر رباعی سے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے اور ہر عنوان سے حیرت۔کتنے عمیق مشاہدے کے بعد ایک زبردست لکچر کا خلاصہ رباعی میں بیان کیا گیا۔پھر اسی عنوان

میں ایک لفظ میں ادا کیا ہے۔ یہ چیزیں نہ تعلیم سے حاصل ہوتی ہیں اور نہ تعلّم سے۔

ذلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء واللّٰہ ذوالفضل العظیم ۔(19)

امجد حیدر آبادی کی رباعیات سے چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:

ہر مرتبہ آئینہ دل دُھلتا ہے
کانٹا کانٹا نگاہ میں تلتا ہے
میں شاعری کو مراقبہ کیوں نہ کہوں
ہر فکر میں بابِ معرفت کھلتا ہے

....

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے
مضمونِ بلند لا مکاں سے لائے
ہر شعر بہ اعتبار فن خوب کہا لیکن
کوئی تاثیر کہاں سے لائے

....

کیا فکر ہے کوئی قدر داں ہو کہ نہ ہو
جھوٹی دنیا میں عزو شاں ہو کہ نہ ہو
اللہ مسرتِ حقیقی دے دے
ہم زندہ ہیں نام و نشاں ہو کہ نہ ہو

عشق رسول ﷺ سے سرشاری بھی انسان کو تصوف کی راہ پر ڈال دیتی ہے۔ عشق رسول ﷺ سے انسان کامل درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ عشق رسول کے بابت عصر جدید کے معروف اسلامی اسکالر پروفیسر طاہر القادری فرماتے ہیں:

''آج اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ قرون اولیٰ کے ان عشاق صحابہ کرام اور صلحائے امت کے تذکرے عام کئے جائیں۔ جنہوں نے اپنی زندگیوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور والہانہ عشق کی بھٹی میں سے گزارتے

ہوئے قدم قدم پر ایسے انمٹ نقوش ثبت کئے ہیں کہ رہتی دنیا تک کوئی عاشق
ومحب اپنے محبوب کے لیے محبت کی دنیا میں ایسے نذرانے پیش نہیں
کرسکتا۔ان کی ان ہی اداؤں کو آج ہم بھی اپنے لیے نمونہ بنا سکتے
ہیں۔کیونکہ پریشان امت کے دکھوں کا مداوا حضور کی محبت میں سرشار ہوکر
سنت واتباع رسول ﷺ کی طرف بلائے بغیر ناممکن ہے۔"(20)

عشق رسول ﷺ کے علاوہ صوفیہ اور کاملین سے محبت بھی اس امر کی نشاندہی کرواتی ہے کہ شاعر عشق ومحبت کے آداب سے واقف ہے۔امجد حیدرآبادی کی چند رباعیاں پیش کی جاتی ہیں جو عشق ومحبت کی معراج اور ان کی مختلف النوع عشقیہ کیفیات اور اشتیاق کا اظہار کررہی ہیں:

دریائے محبت ہے سفینہ میرا
حسن کی خاتم پہ نگینہ میرا
روشن ہے چراغ عشق سے کعبہ دل
معمور ہے نور سے مدینہ میرا

....

طیبہ ہی کو اب کعبہ مقصد کہیئے
دہلیز نبی کو سنگ اسود کہیئے
گر حمد خدا کا حق ادا کرنا ہے
دل سے اک بار یا محمد ﷺ کہیئے

....

اک آفتاب وحدت ہے جلوہ بخش کثرت
نکلی ہوئی ہیں گلیاں صد ہا تری گلی میں
امجدؔ کو آج تک ہم ادنیٰ سمجھ رہے تھے
لیکن مقام اس کا دیکھا تیری گلی میں

صوفیانہ افکار ونظریات ان کی شاعری کا غالب اور نمایاں وصف ہے۔ان کی رباعیوں میں فنا، بقا، خودی، بےخودی، وغیرہ جیسے صوفیانہ عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔جو امجد کو ایک صوفی پسند رباعی گو بناتے ہیں۔افتادِطبع اور تخیل نے ان کی رباعیوں میں ایک خاص رنگ اور بے نیازانہ شان بھی پیدا کر دی ہے جو ان کی شعری شان وشکوہ کی غمازی کرتی ہیں۔رباعیاں ملاحظہ فرمائیں:

بچپن ہی کے پہلو میں جوانی بھی تو ہے
باقی ہی کے آغوش میں فانی بھی تو ہے
سمجھے ہو غلط روح جدا جسم جدا
جو برف کی شکل ہے وہ پانی بھی تو ہے

....

اس موت نما حیات سے ڈرتا ہوں
زندہ ہونے کے واسطے مرتا ہوں
ظاہر ہوئے بیخودی میں اسرارِ خودی
بیخود ہو کر خودی کا دم بھرتا ہوں

....

سرکار پہ جبر کون کر سکتا ہے
مختار پہ جبر کون کر سکتا ہے
بخشے تو کرم ہے ورنہ اس کی مرضی
جبار پہ جبر کون کر سکتا ہے

مسئلہ وحدت الوجود صوفیانہ شاعری میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔صوفیانہ شاعری میں جوش وخروش، جذب وکیف اور سوز وساز کی جو کیفیات پیدا ہوتی ہیں داصل اس کی ابتداء عشق حقیقی سے ہوتی ہے۔یعنی ارباب تصوف پر جب عشق کا جذبہ طاری ہوتا ہے تو انہیں اپنے معشوق کے سوا کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔وحدت الوجود حقیقت میں خدا کے سوائے کسی بھی چیز کے انکار کا نام ہے۔سب خدا ہی خدا ہے۔اس عنصر کو اکابر صوفیہ اور متصوفانہ خیال وفکر کے حامی شاعروں نے بحسن وخوبی بیان

کیا ہے۔ چنانچہ امجد حیدر آبادی کے یہاں بھی دیگر صوفیانہ مسائل کے ساتھ ساتھ وحدت الوجود کا بیان بھی پایا جاتا ہے۔ درج ذیل رباعیاں ان کے وجودی (ہمہ اوست) احساس کو نمایاں کرتی نظر آتی ہیں:

واجب سے ظہور ِ شکل ِ امکانی ہے
وحدت میں دوئی کا وہم نادانی ہے
دھوکا ہے نظر کا ورنہ عالم ہمہ اوست
گرداب حباب میں موج سب پانی ہے

....

ہیں مستِ شہود تو بھی میں بھی
ہیں مدعی نمود تو بھی میں بھی
یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں
ممکن نہیں دو وجود تو بھی میں بھی

....

انسان ہزاروں ہیں مگر قسم ہے ایک
الفاظ بہ کثرت ہیں مگر اسم ہے ایک
اسی عالم کثرت کا ہے منشاء واحد
اعضاء ہیں جدا جدا مگر جسم ہے ایک

وحدت الوجود کے حوالے سے اپنی رباعیات میں امجد حیدر آبادی یہ کہتے ہیں کہ خدا ہی میں کائنات کو دیکھنا چاہئے کہ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ اس کائنات میں وجود تو صرف اللہ کو حاصل ہے۔ وہ مقام عبدیت کو ہمہ اوست کے ذریعے سمجھانے کی سعی کرتے ہیں۔ انہوں نے اللہ تبارک تعالیٰ کی ذات وصفات اور یکتائی کو معرفت کے پردے میں بیان فرمایا ہے۔ ھو کا بیان بھی امجد کے یہاں بڑے ہی لطیف پیرائے میں بیان ہوا ہے اور وحدت الوجود کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ہر عدد کی ایک اکائی ہوتی ہے اسی طرح دنیا کی ہر شئے میں بھی ایک اکائی ہے اور وہ اکائی خدائے واحد ہے۔ رباعی ملاحظہ فرمائیں:

پوشیدہ ہے میرے من میں تو کی صورت
میں صورت گل ہوں وہ ہے بو کی صورت
ہر سانس میں کیوں نہ دم بھریں ھوھو کا
دونوں نتھنے بنے ہیں ھو کی صورت

....

ذرے ذرے میں ہے خدائی دیکھو
ہر بات میں شان کبریائی دیکھو
اعداد تمام مختلف ہیں باہم
ہر ایک میں ہے مگر اکائی دیکھو

''امجدؔ فطرتاً صوفی شاعر تھے۔ان کی نہ صرف رباعیاں بلکہ غزلوں میں بھی عارفانہ شاعری کے جلوے نظر آتے ہیں۔وہ صوفیانہ فکر وجذبے کو سادگی کے ساتھ بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔امجدؔ کی رباعیات تصوف اور معرفت کی آئینہ دار ہیں۔وہ ایک بلند پایہ شاعر اور عظیم المرتبت انسان خدا رسیدہ صاحب باطن صوفی ہیں۔ان کے دل کی آنکھ ہمیشہ کھلی رہتی ہے۔ان کی نظر میں کائنات ایک آئینہ ہے۔جس میں وہ ذرہ ذرہ کو حسن حقیقی اور گوشہ گوشہ کو اس کے جلوں سے منور دیکھتے ہیں۔کیونکہ ان کی نگاہ معرفت بیں ہے۔''(21)☆

نامیؔ کوہ سوار:

نامی کوسوار گلبرگہ کے ایک قصبے شاہ پور میں 12 / نومبر 1884ء کو ایک صوفی منش شاہ حسین کوہ سوار کے گھر ہوئی۔نامی کا پیدائشی نام شاہ محمد چندا حسینی نامیؔ کوہ سوار تھا۔نامیؔ کا سلسلہ نسب صوفیٔ کامل حضرت سید شاہ اکبر حسینی کوہ سوارؒ کی ساتویں نسل سے ملتا ہے۔جن کا مزار آج بھی شاہ پور میں مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔نامی کی ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں ہوئی۔بعد ازاں ان کے والد کی ایماء پر ترک وطن کر کے شوراپور منتقل ہوئے اور مابا قی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔نامی نے خود لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے والد کی نگرانی میں قرآن مجید کے علاوہ گلستاں، بوستاں، خالق باری وغیرہ جیسی کتابیں پڑھیں۔اس کے بعد ان کے مطالعہ میں مزید نکھار پیدا ہوا بہت جلد اس علاقے میں ان کی کتابیں اور شاعری مشہور ہوئی۔وہ ابتداء ہی سے ذہین و

فطین طبیعت کے مالک تھے۔فارسی میں کاملیت حاصل کرنے کے لیے فارسی کے معروف استاذ مولوی رزاق نور خاں کی صحبتوں نے ان کی تربیت کی۔نامی کا ماحول اور فضا دینی تھی اکثر و بیشتر میلاد،نعت اور دیگر شعر وسخن کی محفلوں میں اپنے والد کے ہمراہ جایا کرتے تھے۔اس طرح کم عمری میں شعر وسخن میں طبع آزمائی کرنے لگے اور بہت جلد ان کی غزلیں،نظمیں حیدرآباد کے علاوہ لاہور،امرتسر،جالندھر وغیرہ کے موقر رسائل وجرائد میں شائع ہونے لگے اور اس دور میں علامہ اقبالؔ،اکبرالہ آبادی سیمابؔ وغیرہ کے ساتھ ان کا کلام بھی زینت بنا رہا۔اس طرح ان کی شعری قابلیت میں اضافہ بھی ہوا۔وہ اپنے معاصرین سے بھی متاثر رہے۔اس ضمن میں خود لکھتے ہیں:

''علامہ اقبالؔ،اکبرالہ آبادی،مولانا سیماب اکبرآبادی اور مرشد عالی مقام حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کے رشحاتِ فکر کے ساتھ دکن کے اس کم سواد شاعر اور نثر نگار کی تخلیقی صلاحتیں پروان چڑھتی رہیں''(22)

حضرت نامی کی ادبی زندگی نصف صدی کو محیط رہی اس دوران انہوں نے کئی کتابوں کو شائع کروایا جن میں کچھ منثور تو کچھ منظوم تھے۔نامی کی تصنیفات وتالیفات کے سلسلہ میں ان کے فرزند دلبند وقار خلیل رقم طراز ہیں کہ:

''کیمیائے مقاصد(نیاز مانہ منظوم اما جعفر صادقؒ)(1907ء)''نمکدانِ سخن''،مشہور شعرائے ہند کے لطائف کا مجموعہ(1910ء)''مجموعہ کلام نامیؔ(1912ء)اور انشائیوں کا مجموعہ''ناصح مشفق'' قابل ذکر ہیں، مخطوطات میں اُصول تعلیم پر، رسالہ،سوانح اور کلیات نامی کے علاوہ فارسی کلام محفوظ ہے''۔(23)

نامیؔ کا انتقال 27رجولائی 1950ءکو ہوا اور شاہ پور میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔نامیؔ نے نثر کے علاوہ حمد،نعت، منقبت،قطعہ،رباعی،واسوخت،تضمین اور غزل وغیرہ جیسی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔علاوہ ازیں نئے طرز کی نظمیہ شاعری میں بھی اپنے جوہر دکھلائے ہیں۔ہر صنف میں انہوں نے اپنے فکر وفن کو مترشح کیا ہے۔ان کی شاعری میں صوفیانہ افکار ونظریات پائے جاتے ہیں۔ابتداء ہی سے ان کے مزاج میں مذہبیت کا رنگ چھلکتا ہے۔ان کے مزاج میں عجز، انکسار، بے نیازی موجود ہے لہذا اسی کیفیات کو انہوں نے اپنے کلام کے ذریعے بھی پیش کیا ہے شعر دیکھئے:

میری سیرت کا پتہ ہیں مرے جذبات صحیح

دیکھنا ہوتو اشعار میں مجھ کو دیکھو

....

دنیا جہاں سے مجھ کو سروکار کچھ نہیں
میں بے خبر زمانے سے عُزلت گزیدہ ہوں

....

جز عاجزی کے سر میں اُٹھاؤں گا کیا یہاں
گویا میں کلک نے کی طرح سربریدہ ہوں

....

نامؔی خیال یار سے غافل نہیں ہے دل
وحشت زدہ ہوں اور سراسر رسیدہ ہوں

نامؔی نے اپنی شاعری میں قاضی محمود بحری کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انہیں ایک فطری شاعر، کامل، راہ طریقت کا شہہ سوار اور عشق حقیقی کی تجلیات کا حامل قرار دیا ہے اور ان کے فکر و عمل کو نور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تشبیہ دیتے ہوئے انہیں ایک عاشق رسول بتایا ہے۔ نامی نے شاہ پور کے اس بزرگ سے عقیدت کا اظہار کیا ہے اور ان کی مثنوی ''من لگن'' کو معرفت سے تعبیر کیا ہے۔ شعر ملاحظہ کیجئے:

حضرت محمود بحری شاعر فطرت نگار
جن کے کلکِ معرفت سے من لگن ہے آشکار
قطب کامل، سالک راہ، طریقت بے بدل
جن کا سینہ طور سینا کی تجلی کا شکار
حق شناسی میں یدطولیٰ تھا حاصل آپ کو
آپ تھے نورِ نبی کے باعمل آئینہ دار

نامؔی کی شاعری میں تصوف کی جھلکیاں جا بجا نظر آتی ہیں۔ انہوں نے تلمیحات کا استعمال اس خوبی سے کیا ہے کہ ان میں معرفت اور حقیقت کی باتیں بھی واہ ہونے لگتی ہیں؛

صدائے لن ترانی سے ہوئی موسیٰ کو مدہوشی
شرابِ ربی ارنی کا نشہ معلوم ہوتا ہے

....

منصور کے پردے میں سردار ہمیں ہیں
اور دامِ اناالحق میں گرفتار ہمیں ہیں

....

گہہ شانِ ابراہیم کا اظہار ہمیں ہیں
اور نار کے پردے میں بھی گلزار ہمیں ہیں

....

موسیٰ نے سرطور جو دیکھا وہیں ہم تھے
بے ہوش جو ہوتے ہیں وہ ہشیار ہمیں ہیں

....

یونس تہہ ِ دریا کا تماشہ بھی ہے ہم میں
اور صبر میں ایوب سے عیار ہمیں ہیں

نامیؔ نے انسانی عظمت ورفعت کو تلمیحات کے ذریعے بیان کیا ہے۔اس بات سے اہل علم ودانش خوب واقف ہیں کہ انبیاء، اصفیاء اور بزرگانِ دین وملت کو خالق باری نے جو مقامات عطا کئے ہیں وہ دراصل انسان کی عظمت کا مظہر ہیں نامیؔ کے درج بالا اشعار انسانی عظمت و بلند و بالا مقام کو واضح کرتے ہیں۔نامی کی ایک نظم کے مطالعہ سے اس بات کا اشارہ ہے کہ آدم کو انسان کا استعارہ بناتے ہوئے اس کے مقام ومرتبہ کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔نظم ملاحظہ فرمائیں:

مایۂ ناز ہستیِٔ عالم
فخر کل کائنات ہے آدم
جس کو جن و ملک پہ فوقیت
مرحبا اس شانِ ذی رفعت

اس کو سجدہ کیا فرشتوں نے
اس کو رہنے دیا بہشتوں نے
مظہر قدرتِ الٰہی ہے
باعثِ تخت و تاجِ شاہی ہے
اس میں شانِ خدا ہے جلوہ نما
اس کے دل میں ہے خود خدا رہتا

صوفیہ کرام کے نزدیک انسان اپنی حقیقت سے آگہی اسی وقت حاصل کرسکتا ہے جب وہ عجز و انکسار کا مظاہرہ کرتا ہے۔اس کے علاوہ نامی نے صوفیہ کی تعلیمات کو شعری جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ سالک کے دل میں صرف اللہ کا خیال آنا چاہئے اگر سالک اس کیفیت سے متصف ہوجاتا ہے تو وہ کامل درجے پر پہنچ سکتا ہے۔غرض تصوف کے مختلف رموز کو شستگی، سادگی اور خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔چند صوفیانہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

عجز و فروتنی کا لازم رہے وہ خوگر
اسراف و بخل سے خود کو بچائے رکھنا

....

نگاہوں میں جچتی نہیں شانِ دنیا
خدا کے سوا سب عدم دیکھتے ہیں

....

جس دل میں یادِ حق ہو وہ فکر کے ہے لائق
جس میں نہ ہو یہ خوبی وہ ہے جہاں میں بد تر

....

فنا میں بقا کی نظر آئی صورت
عجب جلوہ خوابوں میں ہم دیکھتے ہیں

....

عیش میں طیش میں راضی بہ رضا جو نہ رہے
تاک میں اُن کی لگی رہتی ہے رسوائی بھی

نامیؔ تصوف کی گہری وادیوں میں سیر نہیں کرتے بلکہ زندگی کے مدوجزر سے تصوف کی وادیوں سے ان کا گزر ہوا ہے۔نامیؔ کے مزاج میں انسان دوستی، قناعت، خداترسی، رواداری، اللہ والوں سے محبت وغیرہ جیسی خصوصیات اس بات کی طرف اشارہ ہیں کہ وہ تصوف کے دلدادہ ہیں۔☆

مولوی اسماعیل شریف ازل (ازلؔ گلبرگوی)

گلبرگہ کے نواح بشیرآباد میں محمد ابراہیم کے گھر ایک لڑکے کی 1892ء میں ولادت ہوئی اور اس لڑکے کا نام محمد اسماعیل شریف رکھا گیا۔مگر بعد میں ازلؔ کے نام سے علمی و ادبی دنیا میں مشہور ہو گئے۔ابھی یہ لڑکا کم سن ہی تھا کہ والد کے سایہ سے محروم ہوا۔اس کے بعد والدہ نے محنت سے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔بعد ازاں حیدرآباد میں جامعہ نظامیہ حیدرآباد سے منشی فاضل (فارسی) اور مولوی کامل (عربی) امتیازی درجے سے کامیاب کیا۔انہوں نے راست طور پر چند علوم مولانا محمد انواراللہ فاروقی بانی جامعہ نظامیہ سے بھی حاصل کی اور اس طرح مولانا کی شاگردگی سے کافی فیض پایا۔بانی جامعہ نظامیہ کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ اسماعیل شریف کی فکر و نظر میں مذہب کا عنصر غالب رہا وہ ایک شریف النفسی کی اعلی مثال تھے۔وہ ایک بہترین استاذ اور عمدہ مقرر کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔آپ کا تقرر بحیثیت معلم کوڑنگل ضلع گلبرگہ (آزادی سے قبل کوڑنگل گلبرگہ کا قصبہ ہوا کرتا تھا) میں ہوا۔ملازمت کے دوران آصفیہ سلطنت کے مختلف مقامات پر درس و تدریس کی خدمات پر معموررہ کر دینیات، اخلاقیات اور ادب کو عام کیا۔وظیفہ یاب ہونے کے بعد گلبرگہ کو اپنا وطن بنایا اور بارگاہِ بندہ نواز کے مدرسے میں ایک دہے تک علم دین اور قرآن الحکیم و الفرقان المجید کی تعلیم دیتے رہے اور ایک نسل کی تربیت میں اہم رول ادا کیا۔آپ کے خاص شاگردوں میں اس دور کے معروف شعراء کے علاوہ رئیس القراء محمد عبدالعزیز (جنہوں نے معروف طنز و مزاح نگار، کالم نگار مجتبیٰ حسین کے والد گرامی کو قرآن کی تعلیم دی تھی)، سلیمان خطیب، شور عابدی، وغیرہ ن بھی آپ سے مستفید رہے۔قاری عبدالعزیز، راقم الحروف کے دادا جان ہیں جنہوں نے اکثر گفتگو کے دوران اپنے استاذ محترم اسماعیل شریف کا تذکرہ کرتے اور ان کے حوالے سے مولانا انواراللہ فاروقی کا نام لیتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہوتی تھیں۔اکثر کہا کرتے تھے کہ بانی جامعہ نظامیہ کا خاص کرم ہے کہ وہ ازلؔ صاحب کو بھی علم و عرفان کا حامل بنا دیا تھا۔وہ مزید کہتے تھے کہ میرے استاذ

اپنے وقت کے ولی صفت تھے۔ یہ اس پاک پروردگار اور حضور اکرم ﷺ کا کرم ہے کہ مجھے ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہے اور ایک واسطے سے میرے دادا استاذ مولانا انوا اللہ فاروقی بانی جامعہ نظامیہ ہوتے ہیں جس کے لیے میں فخر محسوس کرتا ہوں۔اب وہ استاذ رہے نہ ان جیسا علم۔

گلبرگہ کے معروف شاعر سلیمان خطیب اسماعیل شریف ازلؔ کے بھتیجے داماد ہوتے ہیں۔جن کی شادی ازل صاحب کی بھتیجی ''راشدہ ثریا'' سے ہوئی تھی۔راشدہ ثریا کی بھی تعلیم و تربیت ازلؔ صاحب کی نگرانی میں ہوئی تھی۔سلیمان خطیب کی ترقی میں بھی راشدہ ثریا کا اہم رول رہا ہے۔اس طرح سلیمان خطیب کی شہرت میں نہ صرف ان کی شریک حیات بلکہ ان کے خسر محترم کا بھی اہم حصہ ہے۔ازلؔ کے کلام اور حالات زندگی کو ان کی نواسی ڈاکٹر شمیم ثریا نے ترتیب دیا ہے۔وہ ازلؔ صاحب کا حلیہ ،اساتذہ اور ان کے شعری مجموعے کے ضمن میں کہتی ہیں:

''محمد اسماعیل شریف ایک باوقار، متین اور مذہبی شخص تھے۔اکہرا بدن، اوسط قدو قامت اکھڑا چہرہ، ستواں ناک، کشادہ پیشانی اور ذہین آنکھیں اُن کی شخصیت کی شناخت تھیں۔اُن کی گفتگو سے علمی استعداد کے ساتھ ساتھ ان کی زندہ دلی اور جدت طبع کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ ایک اچھے مقرر بھی تھے۔''(24)

مزید اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

محمد اسماعیل شریف کو شاعری سے لگاؤ تھا۔انہوں نے پیش رو اساتذہ کے علاوہ معاصرین کے کلام کا تذکرہ کیا اور ان سے متاثر بھی رہے۔ان کی شاعری نواب مرزا خاں داغ، حسرت موہانی، فصاحت جنگ جلیل کا تسلسل معلوم ہوتی ہے۔انہوں نے ازل تخلص اختیار کیا تھا۔مولوی اسماعیل شریف ازل نے ''کنز المعارف'' کے عنوان سے اپنا کلام ترتیب دیا تھا لیکن ان کی حین حیات میں شائع نہ ہوسکا۔''(25)

ازلؔ صاحب ایک بھرپور زندگی گزار کر ۷۰ برس کی عمر (اکتوبر 1957ء) میں رحلت کر گئے اور پائین درگاہ حضرت بندہ نواز میں آسودۂ خاک ہوئے۔آپ کی علمی و ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ازلؔ صاحب فطری شاعر تھے

جب بھی ان کی طبیعت اس طرف مائل ہوتی علم و معارف کی باتیں کرتے۔انہوں نے ایک دیوان ترتیب دیا تھا جس کا نام کنز المعارف رکھا تھا۔اگر یہ دیوان شائع ہوتا تو کس طرح کی معرفت انگیز باتیں شعری زبان میں سامنے آتیں۔وہ ایک سچے عاشق رسول بھی تھے اور صاحبہ کرام اور اولیاء سے بھی حد درجے عقیدت رکھتے تھے۔ازلؔ کے یہاں رسول مقبول ﷺ کے تئیں وارفتگی و محبت رسول درج ذیل تین شعر میں ملاحظہ فرمائیں:

عشاقِ نبی گرچہ ہوئے دفن دکن میں
اُٹھیں گے قیامت میں مدینے کی زمیں سے

....

دی ہم نے جان کو چۂ دلبر میں اے ازلؔ
سب کچھ نہیں پہ کچھ تو حق اُس کا ادا ہوا

....

یا رسول اللہ دم نکلے تمہاری یاد میں
رہ گئی ہے بس یہی خواہش دل ناشاد میں

ازلؔ گلبرگوی نے عشق کی نیرنگیوں کا اظہار عارفانہ انداز میں کیا ہے۔عشق کی راہوں کی دشوار گزاری گھاٹیوں سے وہی شخص کامیاب و کامران ہوسکتا ہے جس نے راہ عشق میں اپنا سب کچھ لٹانا جانتے ہیں تاریخ گواہ ہے کہ صحابہ کرام اپنا سب کچھ حضور ﷺ پر قربان کیا کرتے تھے۔اسی طرح ایک عاشق صادق اپنے معشوق پر ہر چیز قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے اور یہی فنائیت عشق کی منزل ہے۔غرض انہوں نے عشق کو ایک لازوال دولت سے تشبیہ دی ہے۔ازلؔ صاحب نے عشق و محبت سے حاصل ہونے والے ثمرات، کیفیات اور جذبات کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے:

مقامِ عشق وہ ہے راستہ نہیں ملتا
نہ مبتداء ہی ملا ہے نہ منتہا نہیں ملتا

....

ہے عشق میں درویش تو نگر کے برابر
اس شوق میں ہے سنگ بھی گوہر کے برابر

....

حاصل کرو اے کہ یہی اک کمال ہے
دولت جو عشق کی ہے وہی لازوال ہے

....

آبِ وصال سے کبھی سیراب کر اُسے
عاشق کا قلب سوختہ مانند عود ہے

....

عاشق کو کہا کس نے کہ فرزانہ نہیں ہے
دانا نہیں بنتا ہے جو دیوانہ نہیں ہے

کلام ازلؔ میں سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔وہ مشکل سے مشکل مضامین کو بھی سہل انداز میں بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ان کی شاعری صوفیانہ عناصر سے لبریز ہے اور شعری حسن بھی ان کے یہاں جلوہ گر ہے۔وہ کسی بھی جذبے کو اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں بیان کرتے تھے۔ان کے یہاں فکر وفن کی پختگی ملتی ہیں۔ان کے شعری خصوصیات کا احاطہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شمیم ثریا اپنی تالیف ''انتخاب کلام ازلؔ'' میں رقم طراز ہیں:

''تصوف، فلسفۂ حیات، اخلاق و موعظت، عشق و عاشقی ان کی شاعری کے موضوعات ہیں۔معاملہ بندی، شوخی وظرافت معنی آفرینی و برجستگی کے علاوہ محاورات وتجانیس کا استعمال ان کے کلام کی اہم خصوصیات ہیں۔وہ اُردو کے ان کلاسیکی شعراء میں سے ہیں جنھوں نے پامال مضامین کو نیا انداز دیا۔ ان کے یہاں روایتی حسرت و ناکامی کی بجائے اُمنگ وحوصلہ اور نکتہ آفرینی پائی جاتی ہے۔''(26)

جیسا کے بیان کیا گیا ہے کہ کلام ازلؔ اور مزاج ازلؔ میں صوفیانہ رنگ وآہنگ پیدا کرنے میں اپنے وقت کی ذی علم و عرفان شخصیت مولانا انوار اللہ فاروقی کی صحبت صالح اور ان کی تعلیم وتربیت ومعاونت کرتی نظر آتی ہے۔اسی لئے ان کے عوارف المعارف کے نکات جا بجا شاعری میں نظر آتے ہیں۔غرض ازلؔ صاحب تصوف کی رمزیت اور اور شعری فن کی

ایمائیت کو سلاست اور روانی کے ساتھ نظم کا روپ دینے میں کامیاب نظر آتے ہیں شعر ملاحظہ ہو:

تم پوچھتے ہو مجھ سے بے حال ازلؔ کا کیا
فرزانوں میں فرزانہ دیوانوں میں دیوانہ

....

خزانہ ہے الفت کا یہ قلب محزوں
محبت کا گنجینہ سینہ ہمارا

....

بندہ بنتا نہیں خدا ہرگز
اور بندہ کبھی خدانہ ہوا

....

وصل اُس کا اس طرح کبھی ہوتا نہیں ہرگز
بندہ کبھی خدا میں کسی وقت ضم نہ ہو

....

ہیں دور تو ہم اُس سے پروہ دور نہیں ہے
ہم یوں گئے جدا پروہ جدا ہو نہیں سکتا

....

آنکھوں میں تصور میں خیالوں میں تم ہی ہو
یہ جائے تعجب ہے کہ پھر پردہ نشین ہو

مولوی اسماعیل شریف ازلؔ نے تصوف، علم وعرفان، تعلیمات تصوف اور اصطلاحات تصوف کو اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہوئے طالبان حق کو علم وعرفان کی روشنی عطا کی ہے۔اس روشنی میں کہیں وجود وشہود کی باتیں نظر آتی ہیں تو کہیں نفس کی فریب کاریوں سے آگاہ کرتے ہیں تو کہیں سالک کو فنا وبقا کی تعلیم دیتے نظر آتے ہیں۔غرض ازل گلبرگوی نے بیسویں صدی کے نصف تک اپنے کلام کے ذریعے سماج ومعاشرہ کی تربیت کرنے کی سعی جمیل کرتے رہے اور اس میں کسی حد

تک کامیاب بھی رہے۔ اپنی بات کو ختم کرنے سے قبل چند اور اشعار پیش کرتا ہوں تا کہ ان کی صوفیانہ چمک دمک اور فلسفیانہ تصورات ظاہر ہو سکے:

کون و مکاں میں آپ کے جلوے کہاں نہیں
زیرِ زمین نہیں کہ سرِ آسماں نہیں

....

ہر اک شخص میں اُس کی اک آن ہے
ہر اک چیز میں اُس کی اک شان ہے

....

وابستہ ہے وجود سے میرے نظامِ پہر
میں نظم ہوں نہ بیت نہ شعر و قصیدہ ہوں

....

مجھے دیتا ہے دھوکہ ہر گھڑی یہ نفسِ امّارہ
بیا بانِ ضلالت میں جو پھرتا ہوں میں آوارہ

....

میں کیا کہوں کہ میں کیا ہوں کہاں کہاں ہوں میں
کبھی زمین میں کبھی فوقِ آسمان ہوں میں

غرض اسماعیل شریف ازلؔ نے صوفیانہ فکر کو نہ صرف شاعری کے ذریعے گلبر گہ اور نواحِ گلبر گہ کے کئی شعراء اور طالبانِ حق کی تربیت میں اہم رول ادا کیا بلکہ انہوں نے اپنے شعری فن کے ذریعے متصوفیانہ افکار کی اشاعت میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔☆

صفیؔ اورنگ آبادی:

صفیؔ اورنگ آبادی کے نام سے معروف شاعر جن کا اصل نام حکیم محمد بہا الدین بہبود علی صدیقی تھا۔ 14 رفروری 1893ء محلہ نواب پورہ اورنگ آباد میں حکیم محمد منیر الدین صدیقی کے گھر پیدا ہوئے۔ صفی کے بچپن میں ہی والد

بزرگوار نے نقل مکانی کرتے ہوئے حیدرآباد منتقل ہوئے۔ قیام حیدرآباد کے دوران مدرسہ نظامیہ سے ابتدائی تعلیم اور مدرسہ طبیہ میں بھی داخلہ لیا مگر اس کی سند حاصل نہیں کر سکے۔ بچپن سے ہی شعر وادب کا ذوق رہا۔ چنانچہ شاعر کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ صفیؔ کے اساتذۂ سخن میں ان کے والد، ظہور دہلوی اور استاذ داغ شامل رہے۔ صفیؔ شعر وسخن کی خدمت کرتے ہوئے 21/ مارچ 1954ء کو انتقال فرمایا اور آغا پورہ حیدرآباد میں تدفین عمل میں آئی۔ صفی ابتداء ہی سے صابر اور شاکر کی عمدہ مثال رہے ہیں۔ چنانچہ صفی کی شخصیت اور مزاج کے حوالے سے ڈاکٹر سید بشیر احمد اور پروفیسر محمد علی اثر کے یہ دو اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> ''صفیؔ غیر معمولی خوددار اور وضع دار شخصیت کے حامل تھے۔ کبھی انہوں نے دستِ سوال کسی کے آگے نہیں پھیلایا، جب وہ بیمار تھے اور دوا خریدنے کے موقف میں نہیں تھے، اس وقت بھی انہوں نے کسی سے کچھ طلب نہیں کیا''۔
> (27)

> ''حضرت صفیؔ ایک خوددار، قناعت پسند اور قلندر منش آدمی تھے۔ ان کے شاگردوں و پرستاروں میں امراء اور رؤسا شامل تھے لیکن انہوں نے کبھی کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کیا۔ ان کی ساری زندگی آزمائش وابتلا میں گزری، توکل، اور استغنا کا یہ عالم تھا کہ ''مل جائے تو روزی ہے نہیں تو روزہ'' کے مسلک پر گامزن تھے''۔(28)

صفیؔ اورنگ آبادی فطری شاعری کی مثال تھے، ان کا مزاج داخلی شاعری کیلئے نہایت موزوں تھا دلی احساسات، قلبی واردات اور شاعرانہ جذبات کے اظہار پر انہیں پوری مہارت حاصل تھی، زبان و بیان کی ندرت کی وجہ فکر و خیال کو نئے رنگ و آہنگ میں پیش کرتے تھے۔ اُس دور کا حیدرآبادی ماحول جہاں مولانا انوار اللہ فاروقی اور دیگر صوفیہ کرام اور صوفیانہ شاعری کی روایت نے صفی کو بھی اس کوچے کی سیر کرنے کی ترغیب دی۔ صفی کے یہاں باطنی کیفیات کے اظہار کی پوری صلاحیت موجود تھی چنانچہ وہ متصوفانہ شاعری کو اپنے فکر و احساس کا ذریعہ بنایا۔ صفی کے مزاج کی طرح ان کی شاعری سادگی اور سلاست کے عناصر سے پر نظر آتی ہے۔ تصوف میں عشق اور اس کی مختلف کیفیات کا اظہار صفی کچھ اس طرح کرتے نظر آتے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہوں:

ہے شاعری و عشق تو اب لازم و ملزوم

عشاق کا جو ہے وہی مذہب شعرا کا

....

ختم ہوجاتے جو حسن و عشق کے راز و نیاز
شاعری بھی ختم ہوجاتی نبوت کی طرح

....

اگر ہے ابتدائے عشق مرنا
تو پھر اس ابتداء کی انتہا کیا

....

جنوں عشق کا آغاز ہوتو موت انجام
اس ابتداء کی تو ایسی ہی انتہا ہوتا

....

عشق اک لفظ ہے مگر توبہ
اس میں وسعت ہے جسقدر سمجھو

صفؔی نے عشق کے اظہار کو سادگی کا نیا انداز دیا ہے۔عشق کے مراحل اور منازل کا اظہار اس سادگی سے کیا ہے کہ عشق' کی مختلف کیفیات واضح ہونے لگتی ہیں۔عشق کی بنیاد حسن پر قائم ہے۔حسن حقیقی تو صرف اور صرف شاہد حقیقی ہے۔عشق کامل وہی ہے جس میں جلوۂ جاناں پایا جاتا ہو۔حقیقی جلوہ تو اسی کا ہے جس نے دنیا بنائی اور دنیا جس کے لیے بنائی یعنی حسن کامل تو حضرت کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا میں مضمر ہے اور اسی ذات سے تقسیم ہوتا ہوا کائنات کا ذرہ ذرہ روشن ومنور ہوا۔غرض حسن کی تلاش ہی عشق کا شعار ہے۔صفؔی نے ''حسن وعشق' کے معاملات کو بحسن خوبی پیش کیا ہے۔شعر دیکھئے:

جنت سے کچھ زیادہ ہے دارالامان عشق
دنیائے عقل و ہوش کے جھگڑے یہاں کہاں

....

ہر ذرہ کائنات کا سرمست عشق ہے

قرباں جاؤں آپ کہاں ہیں کہاں نہیں

....

عشق بازی ہے زندہ در گوری
موت سے پہلے مرچکا ہوں میں

....

راز حسن و عشق تو اک انکشافی چیز ہے
یہ معمہ اہل حکمت سے کہاں پوچھا گیا

....

اے صفی حسن و عشق سے واقف
ایک وہ ہیں تو دوسرا ہوں میں

....

حسن خود میں اگر نہیں ہوتا
عشق میں خود سری نہیں ہوتی

حضرت جنید بغدادی اپنی معرکتہ الآراء تصنیف عوارف المعارف میں لکھا ہے کہ ایک عاشق اپنے صفات کو درکنار کرتے ہوئے محبوب کے صفات اختیار کرلے اگر محبوب ان صفات کا حامل ہوجائے تو یہی عشق کی معراج ہے۔سالک اپنے نفس کو اصلاح سے پاکیزہ بناتا ہے تو عشق میں کھرا اتر سکتا ہے۔عشق دراصل محبوب کی یاد، وصل وغیرہ سے بھی حاصل ہوتا ہے۔درج ذیل اشعار میں صفی نے 'فراق وہجر'' خودی اور خودفراموشی اور دیگر صوفیانہ تصورات کو پیش کیا ہے:

وصل ہو یا ہجر ہو لیکن ہوا اپنی شان میں
یہ نہو تو فرق پڑجاتا ہے اطمینان میں

....

کیا دیدۂ مشتاق سے ہے آئینہ بہتر
کیا تجھ کو یہی چاہئے اپنے کو ذرا دیکھ

....

بھولنے والا مرا مجھ سے نہ بھولا جائے بس
مجھ کو جان و دل سے اپنی خود فراموشی سہی

....

زندگانی کا سبب کے آمد و رفت ِ نفس
آمد و رفتِ نفس کیا تار اس کی یاد کا

....

اب تک تو کبھی بے مئے و معشوق نہ گزری
ائندہ رضا مند ہوں مالک کی رضا پر

وحدت،ضبط،وحدت درکثرت،حقیقت و مجاز،وجد وحال،وجود وعدم، بے نیازی، وغیرہ بے شمار صوفیانہ اصطلاحات کوصفؔی نے اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہوئے اشعار پیش کئے ہیں۔عظمت انسانی یا رفعت انسانی کی اہمیت کی بھی اپنے کلام میں وضاحت کی ہے۔شعر ملاحظہ ہوں:

میں اور غیر دو ہیں مگر اُن کے پاس ایک
ہے اُن کی ذات ہی کیلئے یہ حساب خاص

....

برطرف ضبط، کھلے راز، بلا سے کچھ ہو
روئیں گے آج تری یاد تو آئے دل میں

....

دل دادۂ جمال بشر کیوں نہو صفؔی
نیرنگِ جلو ہائے حقیقت مجاز میں

....

ہر ذرہ کائنات کا سرمست عشق ہے

قربان جاؤں آپ کہاں ہیں کہاں نہیں

....

طریقہ یہ بھی ہے عاشق کی آزمائش کا
تکلفات پیاپے اٹھائے جاتے ہیں

....

دل خانہ خدا ہے تو پھر اس میں اے صفی
حسرت نہو، امید نہ ہو، مدعا نہو!

....

مرے آگے ہر چیز ، ناچیز ہے
یہ ناچیز بندہ بھی،کیا چیز ہے

....

ملائک نے سجدہ کیا ہے صفی
حقیقت میں انساں کیا چیز ہے

غرض صفیؔ اورنگ آبادی کے کلام میں صوفیانہ مضامین ان کے مزاج ومنہج کے لحاظ سے ملتے ہیں۔ان کے پیش کش اور اسلوب میں سادگی اورسلاست پائی جاتی ہے۔اگر اہل علم وعرفان انہیں ایک صوفی شاعر نہ سہی مگر متصوفانہ فکر کا حامل شاعر ضرور قرار دیتے ہیں۔☆

مختار ہاشمی:

اصل نام سید شاہ احمد علی اور مختار ہاشمی کے قلمی نام سے دکن کے علاقوں میں معروف ہیں۔مختار ہاشمی 16راکتوبر 1904 کوگلبرگہ میں سید قاسم علی کے یہاں تولد ہوئے۔ابتدائی تعلیم گلبرگہ میں حاصل کی اور جامعہ عثمانیہ سے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کر کے درس وتدریس کے پیشہ سے وابستہ ہوئے۔ابتداء ہی سے صوفیانہ مزاج رہا۔چنانچہ چشتیہ سلسلہ میں بیعت حاصل کی۔شاعری میں مولوی جہانگیر علی اور مولوی اسماعیل شریف ازلؔ سے شرف تلمذ رہا۔اردو، فارسی اور عربی زبانوں سے واقفیت رکھنے والے ہاشمی صاحب اردو اور فارسی زبانوں میں شاعری کی ہے۔ان کے شعری مجموعے میں

فارسی اور اردو دونوں کے غزلیات اور رباعیات موجود ہیں جن کے مطالعہ سے ان کے فکروفن کا احاطہ ہوتا ہے۔ڈاکٹر منظور احمد دکنی نے ''شعلہ رقصاں'' کا تعارف کرواتے ہوئے ان کی فارسی شاعری سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''شعلہ رقصاں'' کی شاعری میں نزاکت بیان اور گہرائی و گیرائی ہے، اس مجموعہ میں حیات و کائنات کا ادراک نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔لوازمات شعری کے استعمال نے ان کے تخیل میں بلندی، ووسعت پیدا کردی ہے۔ ''چمن پارسی'' میں فارسی غزلیں شامل کی گئی ہیں، ان غزلوں میں عشقیہ کیفات اور تصوف کے تنوع مضامین جابجا نمایاں ہیں۔ ان غزلوں میں نزاکت بیان اور گہرائی ہے۔اور اس میں حیات و کائنات کا ادراک جابجا ملتا ہے۔ فارسی غزلوں میں نادر تشبیہات ور استعاروں کے استعمال سے تخیل میں بلندی پیدا ہوگئی ہے۔نزاکت بیان اور گہرائی کا سلیقہ دراصل فارسی شاعری ہی سے اردو شاعری میں منتقل ہوا ہے۔ ہاشمی کو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں بیان کی قدرت حاصل ہے۔وہ بیک وقت اردو اور فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ان کی شاعری اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہے۔جس کو محفوظ رکھنا اردو داں طبقہ کا فرض ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ''شعلہ رقصاں'' گلبر گہ کی تصنیفات میں ایک بلند مقام کی حامل ہے۔''(29)

بیسویں صدی کی ربع صدی کے بعد ان کی شاعری اس دور کے مختلف رسائل میں بھی شائع ہونے لگی۔ان کے ایک شعری مجموعہ شعلہ رقصاں اشاعت کی منزل سے گزر چکا ہے۔اس کے علاوہ ایک غیر مطبوعہ دیوان بھی اشاعت کا منتظر ہے۔شعلہ رقصاں کے شاعر نے حمد، نعت، منقبت، غزل، رباعی اور نظم میں طبع آزمائی کی ہے۔ 31رمئی 1970ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔آپ ایک صاحب خلافت بزرگ رہے ہیں آخری عمر تک طالبان حق کو سلوک ومعرفت کی راہوں سے روشناس کرتے رہے۔آپ کے کئی خلفاء اور مریدین آج بھی آپ کے بتائے ہوئے راہ پر چل رہے ہیں۔

مختار ہاشمی کی شاعری میں اساتذہ شعراء جیسے امیر مینائی' غالب' میر اور مومن وغیرہ کا رنگ چھلکتا ہے۔بطور خاص، ایسا

بھی محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اردو زبان کے قدیم شعراء کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔مختار اکثر و بیشتر فارسی شاعری کی استعمال شدہ تشبیہوں اور استعاروں سے اپنے تخیل کی دنیا آباد کی ہے۔وہ ایک صوفی منش انسان تھے۔اس لئے ان کی شاعری میں تصوف کی ضوفشانیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ان کے اشعار میں تہہ داری، اور معنی آفرینی کا ایک جہاں ہے۔انہوں نے غزل کو پوری زندگی کا ایک آئینہ بنا دیا اور اس میں سچے تجربوں کا رنگ بھر دیا ہے۔مختار ہاشمی نے اپنی شاعری کو کلاسیکی لب ولہجہ کے ساتھ ساتھ نئی تشبیہوں اور استعاروں سے متصف کر دیا ہے۔اور اردو غزل کی کائنات کو نئی زندگی اور وسعت عطا کی۔انہوں نے میر سے سوز و گداز، تکرار لفظی اور جذبے کی پختگی لی۔امیرؔ سے احساس کی شادابی اور غالب سے وسعت خیالی، شوخی اور پیچیدگی کا فن سیکھا۔اسی سبب ان کی شاعری میں حیات و کائنات کا ادارک داخل ہوا۔مزید یہ کہ ہاشمی نے فارسی شاعری سے نزاکتِ بیان اور گہرائی کا سلیقہ سیکھا، اور اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر اور کلچر کی روح کو داخل کیا ہے۔بقول منظور احمد دکنی

> ''ان کی شاعری کا خمیر ۱۹۴۰ء کی دہائی کے اسی دور سے اٹھتا ہے جیسے ترقی پسند ادب کے عروج کا دور کہا جاتا ہے۔ہماری شاعری ہر زمانے میں کسی نہ کسی نظریہ، رجحان اور تحریک کی نمائندگی کرتی رہی ہے۔تاہم ان کی شاعری تبلغ یا پروپیگنڈہ نہیں بنی۔انہوں نے اپنے اشعار میں انفرادیت کا رنگ برقرار رکھا ہے۔صوفیانہ مزاج کے باوصف ان کی شاعری میں صوفیانہ رنگ جا بجا نمایاں ہے۔انہوں نے ایسے رنگ میں شاعری کی جوان کے شخصی اور شعری میلان سے مطابقت رکھتی ہے۔مزاج سے ہم آہنگی کی بنا پر ان کی شاعری میں چاشنی بھر گئی ہے۔''(30)

مختار ہاشمی کے کلام میں زندگی کی پہچان کو عشق کا حاصل قرار دیا گیا ہے۔عشقیہ جذبات واحساسات انسان کے لیے اہم مانے جاتے ہیں اور محبت کے رابطے سے عام انسانی تعلقات کا جو، تانا اور بانا تیار ہوتا ہے وہ بڑا ہی نازک اور پیچیدہ ہوتا ہے۔لیکن اسے خارجی طور پر پیش کرنے میں گہرائی، بلاغت، عظمت اور بلندی اسی وقت آسکتی ہے۔جبکہ اس کے پیچھے زندگی کی اعلی قدروں کا ایک نظام موجود ہو۔ہاشمی نے اپنی عمر عزیز کا بڑا حصہ شاعری کیلئے وقف کر دیا۔اسی سبب ان کے پاس زندگی سے نظریں ملا کر بات کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ان کے اشعار کی معنویت زندگی سے رشتہ اور سچ کی تلاش کی کوشش ہے۔جو انہیں سنجیدگی، بلاغت اور گہرائی عطا کرتی ہے۔ان کی شاعری میں بندش اور دروبست عمدہ ہے۔اور ان کا پورا کلام عشق اور تصوف کا

نمونہ ہے شعر ملاحظہ ہوں:

ترک بستی کرکے دیکھا ترک ہستی کرکے دیکھ
بت برستی کرکے دیکھا حق پرستی کرکے دیکھ

....

کبھی وجود میں گم ہوں کبھی شہود میں گم
یہ ذوق کہوں نہ مجھے سب سے بے نیاز کرے

....

میرے عرفان سے عرفانِ خدا ٹھا مختار
بات کوئی میرے عرفان سے آگے نہ بڑھی

....

وہ ہی وہ تھے جدھر جدھر دیکھا
ہرطرف ان کو جلوہ گر دیکھا

....

تجھے راستہ ملے گا لاہوت سے بھی آگے
کبھی چھوڑ دے اگر تو یہ خصلتِ ازالہ

....

دیوانے بن کے عشق کی حد سے نکل گئے
اچھا ہوا کہ قامت و قد سے نکل گئے

....

مرے عشق کا ماحصل ہوتو تم ہو
مری زندگی بھر کا پھل ہوتو تم ہو

مختار ہاشمی کے پاس زندگی کا برتاو اوراس سے متعلق سوچنے کے انداز میں انفرادیت چھلکتی ہے۔ ہاشمی کی شاعری عشقِ

حقیقی کے دائرے کے پیچ گھومتی ہے۔ سادگی اور انکساری ان کے مزاج کی طرح ان کی شاعری کا بھی خاصہ ہے۔ جو فطری سطح پر گہرا تاثر چھوڑتی ہیں۔

ہاشمی کا کلام متاثر کن ہے۔ موضوع اور مواد کے اعتبار سے قابل ستائش بھی۔ وہ نہایت رواں دواں قرینہ سے اشعار کہتے ہیں۔ اور خوب کہتے ہیں۔ کلام میں تصوف کا رنگ گہرا ہے۔ علاوہ ازیں زندگی کے متنوع تجربات، انسانی فطرت سے آگہی اور اس کی نفسیات کے ادراک کا پرتو جا بجا نظر آتا ہے۔ چند شعر پیش ہیں۔

اک شعلہ رقصاں ہے یہ شعلہ مرے دل کا
کیا منظر پرکیف ہے خاکسترِ گل کا

....

کس کا جلوہ بے باک دیکھا
جو کچھ دیکھا تہہ ادراک دیکھا

....

عبد ہیں بندہ خدا ہیں ہم
یار سے اپنے کب جد ا ہیں ہم

....

برق سینا کبھی خاموش نہیں
چشم موسیٰ کو مگر ہوش نہیں

....

نہ تن باقی نہ تن میں جان باقی
رہی ہے تیری ایک شان باقی

....

آتا ہے ہرایک سمت نظر مجھ کو رخ یار
دنیا مرے دلدار کا ہے آئینہ خانہ

....

اک دن کا تماشہ ہے دنیا میرے آگے
اک رات کا منظر ہے لیلیٰ میرے آگے

ہاشمؔ کے کلام میں تصوف کے عناصر میں وحدت الوجود کے اشارے پنہاں ہیں۔عرفانی وروحانی کیفیات کا اظہار جا بجا نظر آتا ہے جسکا اثر قاری کے اذہان پر دیر پا قائم رہتا ہے۔اس کے علاوہ سماجی ،اخلاقی ،عشقیہ جذبات جا بجا نمایاں ہیں۔شاعری کی زبان سہل اور آسان ہے۔کلام میں زبان وبیان کی سادگی پوری طرح واضح ہے۔ان کے کلام کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مختار کی شاعری فنی محاسن کے علاوہ موضوعاتی لحاظ سے تازگی، جدت ،اور تنوع کی حامل بھی ہے۔مختار کی شاعری میں نزاکت بیان اور گہرائی و گیرائی ہے۔کلام میں حیات و کائنات کا ادراک (صوفیانہ فکر) نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔لوازمات شعری کے استعمال نے ان کے تخیل میں بلندی ،و وسعت پیدا کردی ہے۔غرض ہاشمی کو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں بیان کی قدرت حاصل ہے۔وہ بیک وقت اردو اور فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ان کی شاعری اردو ادب کا گران قدر سرمایہ ہے۔جس میں عارفانہ اور صوفیانہ مسائل ومراحل بھی بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ''ہاشمی '' گلبرگہ کے کلاسیکی اور صوفی شاعروں میں ایک بلند مقام کے حامل ہیں۔☆

عطا کلیانویؔ:

عطا کلیانویؔ کا شمار حیدرآباد کرناٹک کے اہم رباعی گوشاعروں میں ہوتا ہے۔عطا کلیانویؔ کا مقام ومرتبہ صرف حیدرآباد کرناٹک کے شعراء میں تلاش کرنا مناسب نہیں وہ علاقائی حدود سے ماوراء ہیں۔ان کا مقام ہندوستان کے قومی پس منظر میں ہونا چاہئے کیونکہ ان کی اعلیٰ وارفع شاعری خاص طور پر ان کی رباعیات کا مقام ومرتبہ ایسا ہے کہ انہیں امجد حیدرآبادی کے بعد رباعی گوئی میں ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔رباعی ایک پاکیزہ لیکن نہایت مشکل صنف سخن ہے۔

اصل نام محمد عطا اللہ اور عطا کلیانوی کے نام سے معروف ہیں ان کی پیدائش محمد رحمت اللہ کے مکان 20 اگسٹ 1905ء کو ہوئی۔عطا صاحب کے والد کلیانی کے نوابین کے یہاں ملازمت کرتے تھے۔چنانچہ عطا کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی چونکہ ان کے والد منشی رحمت اللہ صاحب جا گیر کلیانی کے معتمد تھے اس لئے انہوں نے اپنے لڑکے کو بڑے لاڈو پیار سے پالا تھا۔انھیں چھوٹی عمر میں مدرسہ میں شریک کیا گیا تھا۔جہاں انہوں نے مولوی میر عابد علی اور مولوی اسد اللہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔اس زمانہ میں کلیانی کے مدرسہ وسطانیہ کے ہیڈ ماسٹر مولوی سید جعفر حسینی تھے عطا کلیانوی نے 16 سال کی عمر میں منشی

کا امتحان کامیاب کیا اور حکومت نظام سے گولڈ میڈل' دوشالہ ایک اشرفی اور 25 روپیہ نقد عطا ہوا۔ عطا اللہ کی تعلیم وتربیت مذہبی ماحول میں ہوئی تھی خاص طور پر صوفیانہ ماحول کے اثرات ان کی زندگی پر مرتب ہونے لگے تھے جو تادم آخر ان کی شخصیت کی شناخت بن گئے تھے۔ انہیں صوفیانہ ماحول کے ساتھ ساتھ شاعرانہ ماحول بھی ورثہ میں ملا تھا۔ رحمت منزل میں اکثر ماہانہ مشاعرے منعقد ہوتے تھے جس میں عطا کلیانوی اپنے والد کے ہمراہ شریک رہتے' ان مشاعروں میں طرحی مصرعوں پر مقامی شعرأ اپنا کلام موزوں کرتے تھے۔ عطا کلیانوی ان میں شامل ہوجاتے خود ان کا بیان ہے کہ :

''میرے والد کا فیضان اثر ہے کہ میں نے شعر گوئی اختیار کی انہوں نے مجھے میر انیسؔ کی بیشتر رباعیات حفظ کرا کے رباعی کی خصوصیت سے اور اس کے وزن سے متعارف کرایا۔ عمر خیام کی رباعیات کے مطالعہ نے بھی مجھے صنف رباعی کی طرف مائل کیا۔ میں نے خمریات سے ابتداء کی''۔ ((31

عطا کلیانوی نے شعر وسخن کی تربیت کے لیے کسی سے بھی اصلاح نہیں لی بلکہ محنت' لگن اور مطالعہ ومشاہدہ نے ان کے فکروفن کو جلا بخشا۔ ابتدا ہی سے ان کے کلام میں پختگی اور روانی ملتی ہے ان کی پہلی تخلیق نعت کی صورت میں زیور طبع سے اس وقت کے ایک معروف اخبار ''مدینہ'' بجنور میں شائع ہوئی تھی۔ جس کا تذکرہ اور اس کا نمونہ ڈاکٹر اکرام باگ نے اپنے تحقیقی مقالہ میں درج کیا ہے :

شاداب ہے مثل گل ترخار مدینہ
فردوس کا گلزار ہے گلزار مدینہ
کچھ اور مداوانہ کرو چارہ گرو تم
پہنچا دو مدینہ میں ہوں بیمار مدینہ
کونین کا سردار ہے سردار مدینہ
دارین کا مختار ہے مختار مدینہ
دم لیگی وہیں جا کے جو نکلے گی بدن سے

ہے روح میری بلبلیں گلزار مدینہ
جویا ہے مدینہ کی حقیقت کا اگر تو
کعبے سے کبھی پوچھ لے اسرار مدینہ
ہو کیوں نہ عطا محفل میلاد معطر
ہر شعر میں ہے نکہت گلزار مدینہ

مذکورہ نعت کے مطالعہ سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ عطا کلیانوی عشق رسول ﷺ سے سرشار تھے اوران کی صوفیانہ فکراسی عشق کے مدار میں گھومتی نظر آتی ہے اس کے علاوہ کلام کی پختگی بھی اس سے عیاں ہوتی ہے۔عطا کلیانوی کی شہرت چالیس کی دہائی سے شروع ہوئی۔ان کی رباعیات اس دور کے مشہور رسالوں میں شائع ہوتیں۔یوں تو عطا نے غزل،نظم،نثر وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے مگران کی شہرت کا دارو مدار ان کی رباعیات ہیں اوروہ خود بھی رباعی گو کہلوانا پسند کرتے تھے۔جس کا تذکرہ انہوں نے مختلف تحریروں کے ذریعے کیا ہے۔ عطا کلیانوی اپنے شعری سرمایہ سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

''میں نے کافی غزلیں، نعتیں کہیں لیکن حیدرآباد کے پولیس ایکشن میں بجز رباعی کے وہ سب سرمایہ برباد ہوا۔میں ہر صنف پر لکھتا تھا مثلاً غزل، نظم، مسدس وغیرہ۔موجودہ حالات میں کلام کا جومختصر سرمایہ ہے وہ پولیس ایکشن کے بعد کی پیداوار ہے۔غزلیں، نظمیں ایک سو سے متجاوز نہیں ہیں مگر مجھے اس کی پرواہ بھی نہ تھی 'چونکہ ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ''۔ کیونکہ میری محبوب اور پسندیدہ صنف رباعی تھی جو بچ گئی تھیں اور میں رباعیاں ہی رباعیاں کہتا رہا۔اس وقت میرے پاس رباعی کا سرمایہ ایک ہزار سے بھی متجاوز ہے اس کے علاوہ قطعات بھی (800) ہیں' فارسی کلام جوتصوف پر مشتمل ہے اس کے علاوہ ہے۔میں صرف رباعی کا شاعر ہوں۔رباعی میرے لئے اور میں رباعی کا ہوکر رہ گیا ہوں اور کوئی مجھ کو دیکھنا چاہے تو رباعی میں دیکھیں''۔(32)

عطا کلیانوی بنیادی طور پر ایک رباعی گو ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت امجد حیدرآبادی کے بعد عطا کلیانوی کو بحیثیت رباعی گو جو مقام اور رتبہ ملنا چاہئے تھا وہ نہیں مل سکا۔ عطا کلیانوی کی رباعیات میں، اخلاقی درس، حکیمانہ نکات اور صوفیانہ ادراک بدرجہء اتم پایا جاتا ہے۔ وہ ایک صوفی منش شاعر رہے۔ چنانچہ سنجیدگی اور بردباری نہ صرف ان کی شخصیت کی پہچان تھی بلکہ ان کا کلام بھی ان خصوصیات سے متصف رہا۔ ان کی تعلیم وتربیت اوران کی صوفیانہ ذہنیت نے ان کی شاعری کا ایک خاص رخ متعین کردیا تھا۔

کر طے کہ رہ عشق ابھی باقی ہے
پی جام شراب تشنگی باقی ہے
حاصل تو ہوئی دوئی کی وحدت لیکن
تجھ میں ابھی وحدت کی دوئی باقی ہے

....

اٹھ جائے ان آنکھوں سے اگر پردہ ء راز
ہوجائے حقیقت ہی حقیقت یہ مجاز
جھگڑا من و توکا نہ رہے گا باقی
آئیں گے نظر ایک ہی محمودو ایاز

....

جب ذاتِ احد کو ہوا اکِ شوقِ نمود
ائے دوست! ہوئی میم محمدؐ مشہود
عنوان اس افسانے کا جز عشق نہیں
اک آگ نے بخشا ہے سمندر کو وجود

....

نقطے کو جو نقطے سے ملا دیتا ہوں
اللہ و محمدؐ کو دکھا دیتا ہوں

اک لوح پہ میں خاصے کو جنبش دیکر
خود اپنی ہی تصویر بنا دیتا ہوں

....

اک نام ہے قطرہ ہے نہ دریا کوئی
اک دَم ہے نہ آدم ہے نہ حوّا کوئی
اسما کے یقین سے جو گزراتو کھلا!
اک میں ہوں نہ اللہ ہے نہ بندہ کوئی

....

سر اپنا جھکا تاہوں میں جب سجدے میں
جھکتے ہیں ملائکہ بھی سب سجدے میں
کیا تجھ سے کہوں سجدے کا عالم کیا ہے
ہوجاتے ہیں ایک عبد و رب سجدے میں

....

باپردہ لیکن نہ کسی نے دیکھا
میں سب سے ملا اور کسی کو نہ ملا
جلوت بھی مری صورتِ خلوت نکلی
عالم میں عیاں ہوکے بھی میں راز رہا

عطا کلیانوی کا مندرجہ بالا کلام کے مطالعہ سے ان کے انداز فکر کا پتہ چلتا ہے خاص طور پر ان کی قادرالکلامی واضح ہونے لگتی ہے اوران کے کلام کی فکری اور فنی قدرو قیمت بھی متعین ہوتی ہے۔

ہندوستان میں عرصہ دراز سے تصوف اوراس کی تعلیمات سے سماج اور معاشرہ کی اصلاح کرنے کے لیے صوفیہ اور صوفی شاعروں نے اپنی زندگیاں وقف کی ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ صوفیہ کرام نے اپنے قول وفعل، پندونصائح اور دیگر تعلیمات سے مسائل تصوف کو کچھ اس طرح بیان کیا تھا کہ انسانی اذہان تعلیم وتربیت اور اخلاق کے حصول کی طرف مائل ہوئے۔

عطا کلیانوی نے بھی اپنے بزرگوں کی روایت کو آگے بڑھانے میں اپنی شعری اور نثری سرمایہ کا استعمال کرتے ہوئے اسی خدمات کو آگے بڑھایا ہے جسے سماج و معاشرہ میں صوفیانہ مزاج کہتے ہیں۔عطا کلیانوی کی صوفیانہ شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ صوفیانہ شاعری کی بنیاد انسان کو اخلاقی اقدار سے قریب کر دیتی ہے۔حسن و اخلاق کی تعمیر و تشکیل میں صوفیانہ شاعری کو تقدیم حاصل ہے جس نے نہ جانے کتنے بھٹکوں کی رہنمائی کا کام کیا ہے۔عصر حاضر میں تصوف کی اہمیت اور معنویت کل سے کچھ زیادہ محسوس کی جارہی ہے جہاں ہر طرف سماجی اور معاشرتی انتشار پھیلا ہوا ہے۔اسی انتشاری قوتوں کو تعمیری قوت بنانے میں تصوف بے حد کارآمد اور نمایاں حیثیت کا حامل بن سکتا ہے۔عطا کلیانوی کا کلام بظاہر مسائلِ تصوف کا احاطہ کرتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ شاعر کا مقصد تصوف کی اشاعت کے علاوہ انسان میں حسن و اخلاق کا درس دینا ہے۔ذیل میں عطا کلیانوی کا کلام پیش کیا جاتا ہے:

ذرہ کو تو خورشید درخشاں کردے
صحرا کو جو چاہے تو گلستاں کردے
سب کچھ تیری قدرت میں ہے یارب موجود
اک مور کو دم بھر میں سلیماں کردے

....

چھائی ہے گھٹا باغ میں آئی ہے بہار
دے اپنے کرم سے مجھے جام سرشار
ساقی تو نہ کر فکر مری توبہ کی
اک بار نہیں توڑی ہے میں نے سوبار

....

اک آئینے کے سامنے لاکر خود کو
وہ دیکھتے ہیں خود کو دکھا کر خود کو
انداز ہیں ان کی خود نمائی کے عجیب
ظاہر مجھے کرتے ہیں چھپا کر خود کو

....

میخانے میں ہم کرکے وضو پیتے ہیں

ساقی کو بٹھا کے روبرو پیتے ہیں

کب اپنی شراب آب شر ہے زاہد

ساقی کے سب سے مے ہو پیتے ہیں

غرض عطا کلیانوی کے کلام کو زبا و بیان اور موضوعات کے لحاظ سے وقیع کہا جاسکتا ہے۔انہوں نے صوفیانہ مسائل اور تعلیمات کو بحسن وخوبی سے پیش کیا ہے۔وہ چشتیہ سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے لہذا وحدت الوجود کا اظہار ان کے کلام میں موجود ہے۔اس کے علاوہ فنا، بقا، رضا، غرض راہ سلوک ومعرفت کا ااظہار ان کے کلام کا حاصل ہے۔ان کے یہاں صوفیانہ الفاظ مستعمل ہیں وہ ان کے کلام کے لیے کلید کی حیثیت بھی رکھتے ہیں جیسے نقطہ، الف، مرکز، محیط، نزول، عروج، عشق، حسن، لوح و قلم، دم، آدم، دارورسن، معنی، شکل، ساقی، آئینہ، تماشا، وغیرہ۔غرض عطا کلیانوی کو صفِ اول کے رباعی گو کہا جاسکتا ہے۔عطا کے فکروفن کو نظر انداز کیا گیا جس کی وجہ سے ان کے مقام ومرتبہ اور قدروقیمت متعین نہ ہوسکی۔تاہم ڈاکٹر اکرام باگ نے حق مریدی عطا کرتے ہوئے ان کی حیات اور کلام پر تحقیقی کام کیا اور جس پر گلبرگہ یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی سند بھی عطا کی گئی۔باگ صاحب نے اپنے تحقیقی مقالے میں عطا کلیانوی اور امجد حیدرآباد کے کلام کا موازنہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''عطا کلیانوی کا شعری کینوس امجد کے مقابلہ میں زیادہ وسیع، گہرا اور آفاقی ہے۔امجد کے ہاں اخلاقیات اور رشدو ہدایت کا منظر نامہ ملتا ہے۔جبکہ عطا کلیانوی کے ہاں تصوف، عرفان کی کائنات روشن ہے۔وجود سے متعلق عطا کا اپنا مخصوص فکرونظر ہے۔ان کی شاعری کا سرسری جائزہ ہی اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ شاعر کو تصوف اور اس کے متعلقہ مضامین سے گہری وابستگی ہے۔''(33)☆

سرور مرزائی:

محمد مستان علی المعروف بہ سرور مرزائیؔ 24 ڈسمبر 1923 کو گلبرگہ (تعلقہ چنچولی قصبہ صلح پیٹ) میں تولد ہوئے۔انہوں نے ابتدائی تعلیم صلح پیٹ میں مکمل کی۔اس کے بعد صنعتی تعلیم میں ڈپلومہ پاس کیا۔علم وادب سے لگاؤ کی وجہ

سے منشی، مرہٹی سے میٹرک اور ہندی سے وشارد کا امتحان بھی پاس کیا۔ بچپن ہی سے آپ کی تربیت علمی، ادبی و مذہبی فضا میں ہوئی تھی جس کی وجہ سے شعروادب کا ذوق پیدا ہوا۔ شاعری کا آغاز 1942ء سے کیا۔ ادب میں کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا بلکہ مطالعہ، ذوق، جستجو اور لگن نے انہیں کہنہ مشق اور پختہ فکر شاعر بنا دیا۔ تاہم کبھی کبھی عطا کلیانوی سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ سرور مرزائی کو زبان و بیان، عروض وغیرہ پر کامل دسترس حاصل تھی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے شاعری میں فن کو اولیت دی۔ بیک وقت کئی زبانوں سے واقفیت رکھتے تھے۔ نظم و نثر میں زور آزمائی کرتے تھے۔ آپ کے چار شعری مجموعے، **نشتر الدنا بیل** (1967)، **شیون احمدی** (1986ء)، **فریادِ ارشاد** (1986ء) اور **پند و پیغام المعروف بہ ھرنگ** (1989ء) کے علاوہ فارسی شعری مجموعہ اور نثری تصانیف عمدہ قاعدہ، لمعات وظلمات قابلِ ذکر ہیں۔ سرور مرزائی دکن کے منفرد صاحب اسلوب شاعر تھے۔ ایک طرف انہوں نے موضوعاتی سطح پر انسانی اقدار کو پیش کرنے کی سعی کی ہے تو دوسری طرف تصوف ان کی شاعری کا حاوی عنصر رہا ہے۔ شہرت، نام و نمود کے لئے کبھی ادب تخلیق نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اصلاحی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھا اور آخر دم تک دنیا کو حقانیت وعرفانیت کا پیغام دیتے ہوئے 10 اگست 1986 کو معبودِ حقیقی سے جا ملے۔ (34)

سرور مرزائی ایک قادرالکلام شاعر کی حیثیت سے نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے تقریباً چار دہائیوں تک اردو زبان وادب کی خدمت کرتے رہے۔ سرور صاحب کے طرز ادا میں مشکل پسندی ہے وہ کسی موضوع کو سلیس انداز میں بیان کرنے کے قائل نہیں۔ سرور صاحب دقت پسندی ومنفرد اسلوب کے دل دادہ تھے۔ ان کے فطری نظریئے اور شعری تاویلات، تصوف اور حکمت کے گرد گھومتے ہیں۔ بلکہ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کی فکر کا محور ''عرفانیات'' ہے۔

سرور مرزائی نے تصوف ومعرفت کے اسرار ورموز کو شاعری میں اس خوبصورتی سے سمودیا ہے کہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے۔ انہوں نے صوفی، مرشد، عمل، بندگی، حسن وعشق، تربیت نفس جیسے موضوعات کی تشریح کی ہے اور وحدت الوجود وشہود کے مسئلے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ عرفان کے چار درجات کا بیان، شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت کی تشریح کی ہے۔ جو قابل فہم اور قابل داد ہے۔ سرور مرزائی کا اسلوب بیانیہ ہے۔ ان کے یہاں اردو کے الفاظ کا ذخیرہ قابل دید ہے اور ساتھ ہی ساتھ فارسی زبان کے الفاظ کا غلبہ ہے صوفیانہ خیالات کے اظہار کیلئے مختلف وسائل کا سہارا لیا ہے۔ کہیں کہیں ایسے بھی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس میں موسیقی اور نغمگی کا احساس ہوتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب بھی ان کے مزاج وطبع نازک کا رہین منت ہے۔ سروؔر صاحب کے کلام کی نمایاں خصوصیت سنجیدگی اور تناسب ہے۔ اردو محاورے، عربی آیات کے استعمال

سے کلام میں بلاغت در آئی ہے۔تصوف کی دنیا بالکل الگ ہے۔اس لئے آپ کی شخصیت میں ایک کامل العقل استاد اور بالغ فکر رہبر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔چونکہ شاعر کے خیالات اس کے اپنے ذہن عوامل، مطالعے اور آنے والی زندگی کی بصیرت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

چاہنے والے خدا کے ہیں بہت، تم ہو حبیب
بخدا ختم ہر اک شان وفا ہے تم پر

....

صرف اک تجلی موسیٰ نے دیکھی تھی طور پر
میرے نبیؐ کی جلوہ یزداں پہ ہے نظر

....

ہے کون رب، کون بندہ خبر ہے
واقف کی آئینہ پر نظر ہے

....

اللہ نور نو محرم حضورؐ ہیں
نظروں کی تھی تلاش خدا مصطفیٰ ملے

....

بطون نور خدا مصطفیٰ ہے
دو عالم میں جمال مصطفیٰ ہے

....

تمہارے نام پر قربان ہونے والے زندہ ہیں
جنہیں شک ہے تمہاری زندگی پر وہ کہاں کیا ہیں

سرور مرزائی کا اپنا اسلوب اور مخصوص انداز بیان ہے۔ان کی سوچ بھی دیگر شعرا سے مختلف ہے۔آپ کی بیشتر نعتیں ایک عنوان کے تحت لکھی گئی ہیں۔حضورﷺ کی مدح سرائی کیلئے انہوں نے کچھ مخصوص الفاظ استعمال کئے ہیں۔نازشِ دو

جہاں، جلوہ حق، شاہ ہدیٰ، صاحب قرآن، انسان الحق، جمال مصطفیٰ، ابر رحمت، شمع ہدیٰ، آقا و مولا، نور الہ، سید البشر، سراج منیر، حق نما محرم خالق، مینار نور، جیسے الفاظ کے ذریعہ نعتوں کے مضامین باندھے ہیں، یہ تمام الفاظ نعت کے عام الفاظ ہیں تاہم سرور صاحب نے اس خوبی اور ہنرمندی سے ان کا استعمال کیا ہے کہ بات نئی معلوم ہوتی ہے۔ اور اسی کے ساتھ اوصاف رسول ﷺ کی وضاحت اور سرور کی عقیدت دونوں نمایاں ہوجاتے ہیں۔ ہر شعر میں حضور اقدس ﷺ سے والہانہ عشق ومحبت ظاہر ہوتی ہے۔ جس سے شاعر کے دل کی ترجمانی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ حضور ﷺ سے عشق صادق نے ان کے دل میں روضہ کی زیارت کی تمنا اور دیدار کا اشتیاق پیدا کیا، اسکا اظہار ان کی نعتیہ شاعری میں جابجا نمایاں ہے۔ اس طرح کا مضمون تقریباً ہندوستان کے ہر شاعر نے باندھا ہے۔

اک بار مدینے میں ہوجائے گزر مرا
سرور آرزو ہے کہ پہنچوں مدینہ

....

بے سمت دیدار آقا کی معراج
ان کی نظر کا دیدہ محتاج

....

آقا کی دید چشم تمنا کی عید ہے
نعلین ہیں کہ تحت سلیمان نظر میں ہے

سرور مرزائی کے یہ اشعار عشق رسول ﷺ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بیشتر اشعار میں روضہ اقدس ﷺ کی دید کا شدید اشتیاق نمایاں ہے۔ دیگر شعرا کی طرح آپ نے بھی حضور ﷺ کے اوصاف اور شافع محشر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ انہیں بزرگان دین سے نسبت قلبی حاصل تھی۔ اور عارف وکامل شخصیتوں کی صحبت نصیب تھی۔ اس لئے انہوں نے اہل طریقت میں ''وحدت شہود'' پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور ''وحدت شہود'' کے چند رموز و نکات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ آپ کی شاعری کا نمایاں عنصر تصوف رہا ہے۔

سلوک وسیر میں وہ ہیں سہارا
نہ ہو نسبت تو دل بھی سنگ سا ہے

....

مظہر کل تیر ا وجود تیری ادانمو،نمود
ہر ذرہ تیری جلوہ گہہ، نورالہ تیری ذات

....

ناصوت توحید، شرعی کی منزل
نہیں ہے الہ کوئی شئے ایسی محفل

....

جبروت ہے معر فت کی ہی منزل
یہ ہے طریقت کی نازک سی منزل

....

وہ لامکان ہے اور یہ مکاں ہے
حی ّ ہے اس کے قبضہ میں جاں ہے

خدا تک پہنچے کے وہ راستے جن پر چلتے رہنے کو تصوف میں سلوک کہا جا تا ہے۔جب تک حضور ﷺ سے نسبت نہ ہو، دل بے قرار رہتا ہے۔تصوف میں چار درجات ہیں۔شریعت،طریقت، معرفت اور حقیقت،شریعت، پہلی منزل ہے۔معرفت دوسری اس میں قدم رکھتے ہی بندہ ذات حق اور اسرار الٰہی سے واقف ہوجا تا ہے۔مکاں و لا مکاں،عرش وسماں کے درمیان الٰہی جگہ جولا مکاں ہے۔یعنی مکاں تو ہے۔لیکن معنوی مکان کی طرح نہیں ہے۔اس کا اظہار سرور مرزائی نے نادر تشبیہات کے ذریعہ کیا ہے۔ان کے اشعار میں حقیقت کچھ اس طرح سامنے آئی ہے۔حقیقت وہ درجہ ہے جہاں پہنچ کر صوفی خدا کی حقیقت کو مکمل طور پر سمجھ لیتا ہے۔اور اس کی ذات سے واصل ہوجا تا ہے۔ان نازک نکات کو انہوں نے اس آسانی اور خوبی سے اشعار کی لڑیوں میں پرویا ہے کہ حقیقی نقشہ سامنے آجا تا ہے۔دراصل آپ ایک صوفی منش اور صاحب دل بزرگ تھے۔تاہم ان کے پیر طریقت کی صحبت نے انہیں اور بھی کامل بنادیا اس طرح ان کے ذہنی افق پر تصوف کے نقوش ابھرنے لگے۔سرور صاحب نے یہاں ایک بات یہ کہی ہے کہ منصور نے حقیقت کی منزل کو پا کر انا الحق یعنی میں خدا ہوں کا نعرہ بلند کیا تھا۔اسلئے انہیں سولی پر لٹکا یا گیا۔حقیقت یہ ہے کہ منصور نے وہی کچھ کہہ دیا تھا جس منزل پر وہ پہنچ گئے تھے۔(35)

سرور مرزائی نے اپنے بلند و ارفع خیالات کو اپنی شاعری کے ذریعہ راست اور کبھی بالراست فنی چابکدستی کے ساتھ شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ سرور کا پیغام رازِ حیات ہے۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا راز جسے انہوں نے برسوں کی دل سوزی اور عرق ریزی کے بعد سلجھایا ہے۔ اس کو سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری کے ذریعہ عوام تک پہنچایا ہے۔ فن پر ان کی گرفت اس قدر مضبوط ہے کہ ہر موضوع کو انہوں نے خوبی سے نبھایا ہے۔ جس سے ان کی قادر الکلامی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔☆

حوالہ جات:

1 (تاریخ ادب اردو (جلد اول)، ڈاکٹر جمیل جالبی ص154

2 اردو زبان کی تاریخ۔ مرزا خلیل احمد بیگ، ص145

3 دکنی زبان (آغاز و ارتقاء) انجمن ترقی اردو گلبرگہ ص66

4 اذکار (4) کرناٹک اردو اکیڈمی بنگلور۔ ص15

5 حضرت مولانا محمد انوار اللہ فاروقی، شخصیت علمی و ادبی کارنامے، ڈاکٹر محمد عبدالحمید اکبر, ص19

6 مُرقعِ انوار ، شاہ محمد فصیح الدین نظامی , ص13

7 انوار اللہ الودود فی مسئلہ وحدۃ الوجود , مولوی حافظ حاجی محمد انوار اللہ ص6

8 حضرت مولانا محمد انوار اللہ فاروقی، شخصیت علمی و ادبی کارنامے ,ڈاکٹر محمد عبدالحمید اکبر ص156

9 فانوسِ خیال, حضرت سید جلال الدین توفیق ص17

10 نسخۂ افکارِ شائق, ڈاکٹر احمد حنبلی ص10

11 اردو شاعری پر تصوف کے اثرات (ولی سے اقبال تک) محمد افضل الدین جنیدی، ص328

12 مضمون: اُردو نعتیہ شاعری میں حضرتِ شائق حیدرآبادی کا مقام, پروفیسر محمد عبدالحمید اکبر ص17

13 کلیاتِ مغموم, سیٹھ محمد اسمٰعیل ص4

14 اُردو غزل میں تصوف ولی سے اقبال تک ڈاکٹر اعجاز مدنی ص 516

15 دبستانِ امیر مینائی, عرفان عباسی ص144

16 اُردو غزل میں تصوف ولی سے اقبال تک ڈاکٹر اعجاز مدنی ص 519

17 کائناتِ جلیل, علی احمد جلیلی ص27

18 آج کل۔اکتوبر 1995 خورشید اکرم ص 3

19 حیاتِ امجد، محمد جمال شریف ص122

20 اردوغزل میں تصوف ولی سے اقبال تک، ڈاکٹر اعجاز مدنی،ص624

21 اردوشاعری پر تصوف کے اثرات (ولی سے اقبال تک) محمد افضل الدین جنیدی،ص376

22 سخنِ نامی، نامی کوہ سواری ص14

23 ایضاً ایضاً ص129

24 انتخاب کلامِ ازل، ڈاکٹر شمیم ثریا ص(ب)

25 ایضاً ایضاً ص(ب)

26 ایضاً ایضاً ص(ج)

27 سخنورانِ حیدرآباد، ڈاکٹر سید بشیر احمد ص55

28 کلیاتِ صفی اورنگ آبادی، محبوب علی اخگر ص12

29 گلبرگہ کے شعری تصانیف کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، ڈاکٹر منظور احمد دکنی،ص83

30 ایضاً ایضاً ،ص80

31 عطا کلیانوی: حیات وخدمات، ڈاکٹر اکرام باگ۔جلداول ص32

32 عطا کلیانوی: حیات اور خدمات، اکرام باگ۔جلداول ص165

33 یادرفتگاں (عطا کلیانوی)۔ڈاکٹر اکرام باگ،ص101

34 اشرفیہ (ماہنامہ) مبارک پور (ڈسمبر ۲۰۰۶)، مدیر: مبارک حسین مصباحی ص 34

35 ایضاً ایضاً ،ص36

☆☆☆

اختتامیہ

(حاصل مطالعہ)

''اردو میں متصوفانہ شاعری (اہم شعراء کے حوالے سے)'' کے تفصیلی مطالعہ کے بعد مندرجہ ذیل نکات برآمد ہوتے ہیں۔

1 اُردو میں ابتدائی دور ہی سے شعروادب میں صوفیانہ رنگ نمایاں رہا ہے۔

2 صوفیانہ شاعری نے دکنی ادب کو حضرت بندہ نواز، میراں جی، جانم، سراج اور بحری وغیرہ جیسے صوفی شعراء عطا کئے۔اس کے علاوہ دکنی کے ہر شاعر کے یہاں صوفیانہ اقدار نمایاں ہوتے نظر آتے ہیں

3 شمالی ہند میں بھی ہر تحریک ورجحان کے حامل شاعروں نے صوفیانہ فکرونظر واضح کیا۔

4 شمالی ہند میں ایک طرف مظہر جان جاناں، خواجہ میر درد، امیر مینائی، رضا بریلوی، اقبال، اصغر وغیرہ کے یہاں صوفیانہ رنگ کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔تو دوسری طرف میر، ناسخ، آتش غالب، ظفر، حسرت، فانی اور جگر کے یہاں بھی متصوفانہ رنگ وآہنگ کو محسوس کیا جاسکتا ہے

5 جنوبی ہند میں مابعد دکنی، انور حیدرآبادی، شائق، توفیق، حسرت صدیقی وغیرہؔ کے یہاں بھی عرفانی کیفیات کا اظہار نمایاں ہوا ہے۔

6 امجد حیدرآبادی اور عطا کلیانوی کے یہاں رباعی میں تصوف کا خوب صورت اور فنی امتزاج ملتا ہے۔

7 ازل گلبرگوی، مختار ہاشمیؔ، اور سرور مرزائیؔ کے یہاں بھی عارفانہ نکات کی نمائندگی ملتی ہے۔

8 مغموم مدراسیؔ، صفی اورنگ آبادیؔ، وغیرہ کے یہاں بھی متصوفانہ عناصر کے عمدہ نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔

9 اردو کی صوفیانہ شاعری میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر صوفی اور متصوف شاعروں نے شعری اظہار کیا ہے۔ان دونظریات پر بیشتر شاعروں کے اشعار ملتے ہیں۔ان کے اظہارات اس بات کے شاہد ہیں کہ ان دونوں نظریات میں نظریاتی اختلاف کے باوجود ہر دونظریات سے شعرائے متصوفین ہم خیال نظر آتے ہیں۔

10 اردو شعروادب کے متصوفانہ منظرنامے میں شاعروں نے تعلیمات تصوف کا خاص خیال رکھا ہے۔شاعروں نے تعلیمات تصوف کی تبلیغ واشاعت میں توکل، فقر، توبہ، تقوے، اخلاص، فناو بقا، تسلیم ورضا، صبر وقناعت وغیرہ

جیسی اصطلاحیں کے ذریعے قاری کو متوجہ اور متاثر کرتے ہیں۔

11 اردو کے شعری منظرنامے میں خالص صوفیانہ فکر کو مترشح کرنے میں قاضی محمود بحری، سراج اورنگ آبادی، مظہر جانِ جاناں، خواجہ میر درد ۔رضا بریلوی اور انور حیدرآبادی غیرہ کے نام مقابل ذکر ہیں

12 مذکورہ بالا نکات اس بات کا اعلان نامہ ہیں کہ صوفیانہ فکر ونظر اردو شاعری کے خمیر میں داخل ہے۔

☆☆☆

کتابیات

بنیادی مآخذ: (شعری انتخاب، کلیات، دیوان اور شعری مجموعے):

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف/مرتب	ناشر	سنہ اشاعت
1	اُجڑے دیار میں (کلام بہادر شاہ ظفر)	امتیاز علی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2006
2	انتخابِ ذوق	تنویر احمد علوی	مکتبۂ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	2002
3	انتخابِ کلام حاتم	پروفیسر عبدالحق	اردو اکادمی، دہلی	2000
4	انتخابِ کلیاتِ آتش	احمد جاوید	دانش پبلشنگ کمپنی، نئی دہلی	2004
5	انتخابِ ناسخ	رشید حسن خاں	مکتبۂ جامعہ لمیٹیڈ دریا گنج، نئی دہلی	1972
6	انتخابِ کلامِ ازلؔ	مرتبہ ڈاکٹر شمیم ثریا	،سلیمان خطیب یادگار تعلیمی ثقافتی و امدادی ٹرسٹ، گلبرگہ،	2007
7	ارمغانِ امجدؔ	خالدہ یوسف	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	......
8	ارمغانِ حجاز (مع شرح)	یوسف سلیم چشتی	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	......
9	باقیاتِ فانیؔ	فانی بدایونی	ایم، آر، پبلیکیشنز	2003

10	باقیاتِ چاقؔ	مرتبہ: عبدالباقی رنگین	ادبی سنگم پبلیکیشن ،گلبرگہ	1970
11	بالِ جبریل (مع شرح)	یوسف سلیم چشتی	اعتقاد پبلیشنگ ہاؤس ،نئی دہلی	......
12	حدائق بخشش	امام احمد رضا خاں بریلویؒ	قادری بک ڈپو۔بریلی	1403
13	دیوانِ مصحفیؔ	اسیر لکھنوی ،امیر مینائی	خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ	1990
14	دیوانِ امیر	امیر مینائی	نامی منشی نول شور۔کان پور	......
15	دیوانِ داغؔ	نواب مرزا داغ دہلوی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس ،دہلی	2004
16	دیوانِ آبرو	ڈاکٹر محمد حسن	ترقی اردو بیورو،نئی دہلی	2000
17	دیوانِ درد	مرتبہ: فاروق ارگلی	فرید بک ڈپو پرائیوٹ لمیٹیڈ ،نئی دہلی	......
18	دیوانِ ظفر	بہادر شاہ ظفر	اعجاز پبلیشنگ ہاؤس ،نئی دہلی	1997
19	رباعیاتِ امجد، (مکمل حصہ اول تا سوم)	سید احمد حسین امجد	حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان ،حیدرآباد	......
20	سخن نامیؔ	مرتبہ: وقار خلیل	گلبرگہ	......
21	شمیم الانوار	مولانا محمد انوار اللہ فاروقیؒ	مجلس اشاعت العلوم جامعہ نظامیہ ،حیدرآباد	1336
22	شعلہ رقصاں	ممتاز ہاشمی	الجنتہ العلمہ حیدرآباد	......
23	شیون احمدی	سرور مرزائی	حنا پبلی کیشنز گلبرگہ	1982
24	فریاد الرشاد 1985	سرور مرزائی	مجلس انوار لمعارف حیدرآباد	
25	کلیاتِ ولیؔ	نورالحسن ہاشمی	اتر پردیش اردو اکادمی	1989
26	کلیاتِ حسرت موہانی	مرحوم بیگم حسرت موہانی	شفیق بک ڈپو اردو بازار ،جامع مسجد، دہلی	1997
27	کلیاتِ میرؔ (جلد اول)	ظل عباس عباسی	ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو ،نئی دہلی	1983
28	کلیات صفی اورنگ آبادی	محبوب علی خان اخگر	آندھرا پردیش اردو اکادمی ،حیدرآباد	2000
29	کلیاتِ مغمومؔ،	محمد اسماعیل صاحب مغمومؔ	در مطبع فردوسی ،دریاسین پریس ،مدراس	1929
30	کلیاتِ شائق	مولوی میر اعظم علی شائقؔ	کمرشل بک سنٹر ،حیدرآباد	......
31	کلیاتِ بحریؔ	ڈاکٹر محمد حفیظ سید	سری داس سیدہ پرنٹنڈ لکھنو	......
32	کلیاتِ سراج	سراج اورنگ آبادی	قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان ،نئی دہلی	1998

33	کلیاتِ سوداؔ (جلد اول)	ڈاکٹر محمد حسن	ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو۔نئی دہلی۔	
	1995			
34	کلام امیر مینائی	انور کمال حسینی	فرید بک ڈپو لمیٹیڈ۔دہلی	
	2004			
35	کلیات آتش	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	رام نرائن لال بینی مادھو۔الہ آباد۔	1995
36	کلیاتِ اصغرؔ	اصغر گونڈوی	کتابی دنیا۔نئی دہلی	2004
37	کلیاتِ فانیؔ	مرتبہ: فاروق ارگلی	فرید بک ڈپو پریوٹ لمیٹیڈ۔نئی دہلی	......
38	کلیاتِ اقبالؔ	علامہ اقبالؔ		
39	کائناتِ جلیلؔ مانکپوری	علی احمد جلیلی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی،	1999
40	کلیاتِ اکبر	سید اکبر حسین اکبر آبادی	فرید بک ڈپو پرائیویٹ لمیٹیڈ، نئی دہلی	......

ثانوی ماٰخذ: (تنقیدی، تحقیقی، تذکرے اور شرحیں وغیرہ):

1	آبِ حیات	مولانا محمد حسین آزاد	کاک آفسٹ پرنٹرس	2004
2	آئینہ معرفت	سید اعجاز حسین اعجاز	لالہ رام نرائن لعل بک سیلر	1932
3	انکشافات	پروفیسر محمد علی اثر	نشاط پبلشر، حیدرآباد	2009
4	ارمغان ایران وہند	ڈاکٹر زیب حیدر	مصنف	1996
5	اصطلاحات تصوف	حضرت شاہ سید محمد ذوقی	خانقاہ کمالیہ حیدرآباد	2006
6	اُردو ادب کی تحریکیں (ابتداء تا 1975ء)	ڈاکٹر انور سدید	......	......
7	امام احمد رضا اور معارف تصوف،	جمع از: محمد عیسیٰ رضوی	رضوی کتاب گھر نئی دہلی	2011
8	ادبی تحقیق	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی	1992
9	اُردو غزل	ڈاکٹر کامل قریشی	اردو اکادمی، دہلی	1992
10	انتخاب کلامِ ظفر فن وشخصیت	خواجہ تہور حسین	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1977
11	افکارِ غالب	ڈاکٹر خلیفہ عبدالکریم	غالب انسٹی ٹیوٹ،، نئی دہلی	1999
12	اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	صغریٰ مہدی	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	1981
13	افکارِ سوداؔ	ڈاکٹر شارب ردولوی	نصرت پبلشر، لکھنو	1972

14	امیر مینائی	شاہ محمد ممتاز علی آہ	ادبی پریس، لکھنو	1941
15	اُردو شاعری میں خودداری	سلام سندیلوی	انجمن ترقی اردو، نئی دہلی	1979
16	اصغر گونڈوی۔شخصیت اور فن	ڈاکٹر زبیدہ خاتون	شوکت لائبریری اسوسیشن۔کرنول	1994
17	اردو انسائکلو پیڈیا (جلد اول)	پروفیسر فضل الرحمن	قومی کونسل نئی دہلی	1996
18	اُردو زبان و ادب	ڈاکٹر مسعود حسین	ایجوکیشنل بک ہاؤس۔علی گڑھ	1974
19	اعجازِ ناسخ	ڈاکٹر احسن نشاط	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دریا گنج، نئی دہلی	1988
20	اقبال کا تصورِ عشق	شبنم منیر	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی	2008
21	اقبال اور تصوف	محمد شریف بقا	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی	2004
22	اقبال اور تصوف	پروفیسر محمد فرمان	تاج پبلیشنگ ہاؤس دہلی	1996
23	امام احمد رضا اور تصوف	مولانا محمد احمد مصباحی	المجمع الاسلامی مبارکپور، اعظم گڑھ	2004
24	اسلامی تصوف	علامہ محمد غزالیؒ	مکتبہ اشاعت القرآن، دہلی	2000
25	الامن والعلیٰ	احمد رضا خاں بریلویؒ	اسپریچول پبلیکیشنز، نئی دہلی	2005
26	احیاء العلوم (جلد اول)	حجتہ الاسلام امام غزالیؒ	مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ	......
27	اردو غزل میں تصوف، ولی سے اقبال تک	ڈاکٹر اعجاز مدنی	رضوی کتاب گھر، دہلی	1996
28	اسمارالاسرار،	حضرت سید محمد حسینی گیسودراز بندہ نواز	سید محمد حسینی گیسودراز تحقیقاتی کمیٹی، گلبرگہ	1981
29	اردو شاعری کا مزاج	وزیر آغا	نریندرناتھ سوز، دریا گنج، دہلی	1991
30	اردو شاعری میں مستعمل تلمیحات و مصطلحات، ڈاکٹر سید حامد حسین،		انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی	1977
31	اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل	ڈاکٹر ممتاز الحق	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	1999
32	اصطلاحاتِ تصوف	حضرت شاہ سید محمد ذوقیؒ	خانقاہِ کمالیہ جہاں نماں پھول باغ، حیدرآباد	2006
33	احسان	ڈاکٹر محمد طاہر القادری	منہاج القران پبلی کیشنز، لاہور	2000
34	بخاری شریف (جلد اول)	ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری	،اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1981
35	بہادر شاہ ظفر	اسلم پرویز	سمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی	1984
36	بزمِ صوفیہ	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	دارالمطبع معارف دارالمصنیفین، اعظم گڑھ	1989
37	بوستانِ سعدیؒ	غلام عباس ماھو	اعتقاد پبلیشنگ ہاؤس۔نئی دہلی	2004

38	تاثرات (رباعیات ابوسعید ابوالخیرؒ)	آقائے م۔ا۔رازی	تاج بک ڈپو، موہن لال روڈ۔لاہور	......
39	تاریخ ادب اردو (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	2000
40	تاریخ ادب	ڈاکٹر سیدہ جعفر، بی	ایس گرافکس، دلسکھ نگر، حیدرآبا	2002
	اردو، عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک (حصہ اول)			
41	تاریخ ادب	ڈاکٹر سیدہ جعفر، بی	ایس گرافکس، دلسکھ نگر، حیدرآبا	2002
	عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک (حصہ دوم)			
42	تاریخ ادب اردو، جلد اول (حصہ اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	2004
43	تاریخِ ادب اردو (جلد اول)	وہاب اشرفی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	2005
44	تاریخ ادب اردو (جلد دوم)	وہاب اشرفی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	2005
45	تاریخِ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	ادارہ کتاب الشفاء دریا گنج، نئی دہلی	2000
46	تاریخ ادبیات ایران	ڈاکٹر رضا زادہ شریف	ندوۃ المصنفین، جامع مسجد، دہلی	2000
47	تاریخ مشائخ چشت	خلیق احمد نظامی	ندوۃ المصنفین، اردو بازار، دہلی	1985
48	تحقیقات اثر	پروفیسر محمد علی اثر	نشاط پبلیشر حیدرآباد	2005
49	تذکرۃ الاولیاء	حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ	ناز پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	......
50	تصوف اور ہندوستانی معاشرہ	مرتبہ پروفیسر محی الدین بمبئی والا	موڈرن پبلیشنگ ہاؤس دہلی	1998
51	تصوف اور اردو شاعری	پروفیسر سید صفی حیدر دانش	سندھ ساگر اکادمی، لاہور	1984
52	تصوف اور اصغر گونڈوی	ڈاکٹر سلام سندیلوی	نسیم بک ڈپو، لکھنو	1970
53	تصوراتِ اقبال	مولانا صلاح الدین احمد	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	1974
54	تصورِ بشر اور مردِ مومن	ڈاکٹر حاتم رامپوری	یونین پریس، دہلی	1979
55	تعلیماتِ اعلیٰ حضرت	مولانا محمد میکائیل صاحب ضیائی	اسلامک پبلیشر، مٹیا محل، جامع مسجد دہلی	2003
56	تفسیر روح البیان (جلد نمبر ۸)	حضرت علامہ اسماعیل حقیؒ	رضوی کتاب گھر۔دہلی۔۶	1995
57	جگر مرادآبادی کی غزل گوئی	ڈاکٹر مہتاب انصاری	نکہت پبلیشرز، بند پیٹری، لیک فیاکٹری روڈ، رانچی	1989
58	جگر مرادآبادی	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری	ساہتیہ اکادمی، دہلی	1992
59	جگر مرادآبادی	حالات، انتخاب کلام تبصر	تبسم نظامی، نفیس اکادمی، حیدرآبادی	

	1946			
60	حسرت موہانی	ایم۔حبیب خان	ساہتیہ اکادمی، دہلی	1984
61	حیدرآباد کے ادیب	زینت ساجدہ	آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی، حیدرآباد	1962
62	حیاتِ مومنؔ۔تاریخِ مومنؔ	ضمیرالدین احمد	مصنف	2006
63	حقیقتِ تصوف	پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری	مکتبہ رضویہ، ادبی دنیا مٹیا محل، دہلی	2006
64	حیاتِ اقبالؔ	عنایت اللہ	تاج کمپنی لمیٹیڈ لاہور	1941
65	حیاتِ امجد	محمد جمال شریف	اعجاز پرنٹنگ۔حیدرآباد	1941
66	حضرت مولانا محمد انوار اللہ فاروقی (شخصیت علمی وادبی کارنامے)	ڈاکٹر محمد عبدالحمید اکبر	مجلس اشاعت العلوم، جامعہ نظامیہ حیدرآباد	2000
67	حیات اعلیٰ حضرت (اول)	ملک العلماء محمد ظفر الدین بہاری	ادارہ ترویج واشاعت مسجد نور الاسلام بولٹن، یو۔کے	2003
68	حضرت خواجہ نقشبند اور طریقتِ نقشبندی	پروفیسر ڈاکٹر شمس الدین احمد	شیخ محمد عثمان اینڈ سنس۔سرینگر	1992
69	خواجہ میر درد اور ان کا ذکر و فکر	قدیر احمد	شگفتہ نسرین	2004
70	خواجہ میر درد	قاضی جمال حسین	ساہتیہ اکادمی۔دہلی	1991
71	خواجہ میر درد (تنقیدی وتحقیقی مطالعہ)	ثاقب صدیقی، انیس صدیقی	مصنف	1989
72	خواجہ حیدر علی آتش	محمد ذاکر	ساہتیہ اکادمی، دہلی	1992
73	خرقۂ امجدؔ۔سی پیوند	سید احمد امجد حیدرآبادی	......	1374
74	خزینتہ التصوف	محمد صدرالدین صاحب	......	1350
75	دکن میں اردو مثنوی (سراج اورنگ آبادی تک)	ڈاکٹر ملک راشد فیصل	مصنف	2006
76	دکنی ادب	ڈاکٹر قیوم صادق	کرناٹک ادبی سرکل گلبرگہ	1988
77	دکن میں اردو	نصیرالدین ہاشمی	ترقی اردو بیورونئی دہلی	1985
78	دکنی ادب کی مختصر تاریخ	یوسف سرمست	آل انڈیا اردو ریسرچ اسکالرس کونسل حیدرآباد	2006
79	دکن میں اردو شاعری ولی سے پہلے	ڈاکٹر محمد جمال شریف	ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد	2006
80	دکنی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	2009
81	دکنی لغت	مرتبہ سیدہ جعفر	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	2008

82	دابستانِ آتش	ڈاکٹر شاہ عبدالسلام	جمال پریس۔دہلی	1977
83	داغ	نوراللہ محمد نوری	کوچہ ڈاکٹر بی جگن ناتھ، حیدرآباد دکن	1345
84	دہلی میں اُردو شاعری کا تہذیبی و فکری منظر (عہد میر تک)	پروفیسر محمد حسن	اردو اکادمی، دہلی	2003
85	ذوق دہلوی	تنویر احمد علوی	ساہتیہ اکادمی دہلی	1992
86	رسالہ قشیریہ	ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن قشیریؒ	اسلامک پبلیشر، مٹیا محل، دہلی	1994
87	رہنمائے بیجاپور	مترجم ڈاکٹر صبغتہ اللہ	رجسٹرار، کرناٹک اردو اکیڈمی بنگلور	1999
88	روح تصوف	سید خورشید احمد گیلانی	امام احمد رضا اکیڈمی، بریلی شریف	2008
89	سخنورانِ حیدرآباد	ڈاکٹر سید بشیر احمد	مصنف	2007
90	سراج اورنگ آبادی حیات اور شاعری	ڈاکٹر صدیق محی الدین	نرالی دنیا پبلیکیشنز، نئی دہلی	2004
91	سراج اور ان کی شاعری	عبدالقادر سروری	سب رس کتاب گھر، خیرت آباد، حیدرآباد	......
92	سیرتِ اقبال	مولوی محمد طاہر فاروقی	قومی کتب خانہ ریلوے روڈ۔لاہور	1939
93	سیرتِ جنیدؒ	علامہ فضل احمد عارف	مکتبہ رشیدیہ لمیٹیڈ، لاہور	1974
94	شرح دیوانِ غالبؔ	جوش ملسیانی	بک کارپوریشن۔دہلی	2005
95	شرح دیوانِ غالبؔ	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس۔نئی دہلی	1992
96	شرح دیوانِ فانیؔ	ڈاکٹر افتخار بیگم صدیقی	ایجوکیشنل بک ہاؤس۔علی گڑھ	1984
97	شرح کشف المحجوب	حضرت سید علی بن عثمان الہجویریؒ	مکتبہ رضویہ مٹیا محل، دہلی	1997
98	شرح فتوح الغیب	شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ	ادبی دنیا۔دہلی	2001
99	شعر چیزے دیگر است	عمیق حنفی	مکتبہ جامع لمیٹیڈ۔دہلی	1983
100	شعرالعجم (جلد اول تا پنجم)	مولانا شبلی نعمانی	عالمگیر پریس۔لاہور	1932
101	شعرائے گجرات	پروفیسر اے، ایم شعلہ	آمت پرکاشن کبوتروں کا چوک، جودپور	1983
102	طبقاتِ امام شعرانی	حضرت عبدالوہاب شعرانیؒ	اسپریچول پبلیکیشنز، دریا گنج، دہلی۔	1996
103	عادل شاہی دور میں اردو غزل	پروفیسر محمد علی اثر	کرناٹک اردو اکیڈمی، بنگلور	2013
104	عوارف المعارف	شیخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ	ارشد برادرس، سوئیوالان، نئی دہلی	......
105	غزل پس منظر پیش منظر	ساحل احمد	اردو رائٹرس گولڈ۔الہ آباد	2000

106	غالب اور تصوف	سید محمد مصطفی صابری	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس۔نئی دہلی	1990
107	غزل اور مطالعہ غزل	ڈاکٹر عبادت بریلوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس۔علی گڑھ	2005
108	غزل اور متغزلین	ڈاکٹر ابوالیث صدیقی	بھارتی پبلیکیشنز۔دہلی	1968
109	غزل کا عبوری دور	ڈاکٹر شیخ عقیل احمد	جے ڈی پبلی کیشنز۔دہلی	1996
110	غزل فن اور فن کار	ثریا حسین	شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	1986
111	فانوسِ خیال	حضرت سید جلال الدین توفیق	حضرت سید جلال الدین، حیدرآباد	2003
112	فکرِ اقبالؔ	ڈاکٹر خلیفہ عبدالکریم	ایجوکیشنل بک ہاؤس۔علی گڑھ	2002
113	فنِ شاعری اور حسان الہند	علامہ عبدالستار ہمدانی	مرکز اہل سنت برکات رضا پور بندر، گجرات	1998
114	فصوص الحکم	شیخ اکبر محی الدین ابن العربیؒ	اعتقاد پبلشینگ ہاؤس۔نئی دہلی	1996
115	فتوحاتِ مکیہ (جلد اول)	شیخ اکبر محی الدین ابن العربیؒ	علی برادران۔فیصل آباد	1991
116	فلسفۂ عجم	علامہ ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال	تصدق حسین تاج معتمد اشاعتِ اردو۔حیدرآباد	1939
117	فیراز الغات	الحاج مولوی فیروز الدین	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس۔دہلی	1998
118	فرہنگِ آصفیہ	خان صاحب مولوی سید احمد دہلوی	نیشنل اکادمی دہلی	1974
119	قوت القلوب	شیخ ابوطالب محمد بن عطیہ حارثی المکی	شیخ غلام علی اینڈ سنس لمیٹیڈ پبلیشر، حیدرآباد	1988
120	کتاب اللمع	شیخ ابونصر سراجؒ	اعتقاد پبلیشنگ ہاؤس۔نئی دہلی	1991
121	کاشف الحقائق	پروفیسر وہاب اشرفی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	2004
122	لکھنو کی دبستانِ شاعری، (جلد اول، دوم)	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	2008
123	لکھنو کا شعر و ادب (عہدِ نوابین اودھ کے معاشرتی و ثقافتی تناظر میں)	ڈاکٹر سید عبدالباری	الفلاح پبلیکیشنز۔نئی دہلی	1996
125	مثنوی پھول بن کی ادبی اہمیت	ڈاکٹر خالدہ بیگم	مصنف	2011
126	مآثرِ عجم	مرتبہ: عظیم حق جنیدی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	1980

127	مطالعہ ولی تنقیدی وانتخاب	ڈاکٹر شارب ردولوی	نصرت پبلیکیشنز وکٹوریہ اسٹریٹ۔لکھنو	1972
128	محمد تقی میرؔ	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس۔دہلی	2001
129	میرؔ اور میریات	صفدر آہ	علوی بک ڈپو محمد علی روڈ،بمبئی	1971
130	مومن۔شخصیت اور فن	ظہیر احمد صدیقی	دہلی یونیورسٹی۔دہلی	1972
131	مرزا محمد رفیع سوداؔ	قاضی افضال حسین	ساہتیہ اکادمی۔نئی دہلی	1990
132	مطالعہ امیرؔ	ابو محمد سحر	نسیم بک ڈپو۔لکھنو	1964
133	مقدمہ کلامِ آتشؔ	خلیل الرحمن اعظمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس۔مسلم یونیورسٹی۔علی گڑھ	1997
134	مطالعہ داغ	ڈاکٹر سید محمد علی زیدی	کتاب نگر دین دیال روڈ،لکھنو	1974
135	مطلع الانوار	محمد مفتی رکن الدین	جمیعتہ الطلباء جامعہ نظامیہ،حیدرآباد	1405
136	مرقع انوار	شاہ محمد فصیح الدین نظامی	مجلس اشاعت العلوم،جامعہ نظامیہ،حیدرآباد	2008
137	مدارج النبوت (اردو) (حصہ اول)	حضرت علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی	ادبی دنیا،مٹیا محل،دہلی	1992
138	مسائل تصوف	میکش اکبرآبادی	انجمن ترقی اردو،نئی دہلی	2000
139	مولانا جامی حیات اور شاعری	پروفیسر ڈاکٹر شمس الدین احمد	گلشن پبلیشرز۔سرینگر	2001
140	میراثِ ہنر	قاضی عبدالرحمن ہاشمی	مصنف	1997
141	مثنوی مولوی معنوی (جلد اول،دوم،سوم)	مولانا جلال الدین رومیؒ	اسلامی کتب خانہ لاہور	1974
142	نفحات الانس (اردو)	حضرت مولانا عبدالرحمن جامیؒ	دانش پبلیشنگ کمپنی دہلی	1994
143	نسخۂ افکارِ شائق	ڈاکٹر احمد حنبلی	شعبۂ نشر واشاعت بزمِ شائق،حیدرآباد	......
144	نقدِ حرف۔تنقیدی مضامین	پروفیسر ممتاز حسین	مکتبہ جامعہ نگر،نئی دہلی	1985
145	نئے تناظر	وزیر آغا	اردو رائٹرس گلڈ۔الہ آباد	1979
146	ولیؔ۔انتخاب وتہذیب	محمد خان اشرف	اعجاز پبلیشنگ ہاؤس۔نئی دہلی	1991
147	ولیؔ فن اور شخصیت اور کلام	ساحل احمد	اردو رائٹرس گلڈ۔الہ آباد	1979
148	یادِ رفتگاں (عطا کلیانوی)	ڈاکٹر اکرام باگ	کرناٹک اردو اکیڈمی،بنگلور	2009

رسائل و جرائد :

1 اشرفیہ (ماہنامہ) مبارک پور

2 المیزان (ماہ نامہ) امام احمد رضا نمبر ممبئی

3 اردو ادب۔ سہ ماہی (حسرت نمبر) نئی دہلی

4 آج کل (ماہ نامہ) نئی دہلی

5 اردو دنیا (ماہ نامہ) دہلی

6 تیر نیم کش، (جگر نمبر) مراد آباد

7 سب رس (ماہ نامہ) حیدرآباد

8 فکر و نظر (ماہ نامہ) راولپنڈی

9 قومی زبان حیدرآباد

10 نگار (ماہ نامہ) (علومِ اسلامی و علماء اسلام نمبر) لاہور

11 مجلہ رضویہ (سالنامہ) حیدرآباد

12 راشٹریا سہارا (ماہ نامہ) دہلی

تحقیقی مقالات:

1 شاہ محمد چندہ حسینی نامی شاہ پوری حیات اور شاعری　رابعہ بیگم　سنٹرل لائبریری، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

2 گلبرگہ کے شعری تصانیف کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (۱۹۶۰ کے بعد)　ڈاکٹر منظور احمد، سنٹرل لائبریری، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

3 عہدِ آصف جاہی کے صوفی شعراء　امتہ السلام عالمہ صدیقی　لائبریری　عثمانیہ　یونیورسٹی، حیدرآباد

4 عطا کلیانوی حیات اور ادبی خدمات　محمد اکرام الدین باگ　لائبریری، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

5 اردو شاعری پر تصوف کے اثرات (ولی سے اقبال تک)　محمد افضل الدین جنیدی　لائبریری، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

☆☆☆